مقالہ

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

سمیہ بشیر

Hasnain Sialvi

نگراں

ڈاکٹر نسیم اختر

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، سٹیلائٹ کیمپس بڈگام، (جموں و کشمیر)۔190021

فہرست

شمارہ نمبر	ابواب	عناوین	صفحہ نمبر
۱		پیش لفظ	i-ix
۲	باب اول	ناول کی تعریف اور اردو میں اس کی روایت	1-52
		ناول کی تعریف اور قسمیں	1
		اردو میں ناول کی روایت	19
۳	باب دوم	مشرف عالم ذوقی کی شخصیت اور فکر و فن کی نشو و نما میں کارفرما عوامل	53-79
		ابتدائی زندگی	53
		پیشہ وارانہ زندگی	67
		ازدواجی زندگی	73
۴	باب سوم	مشرف عالم ذوقی کی ادبی خدمات	80-99
		بحیثیت افسانہ نگار	80
		بحیثیت شاعر	89
		بحیثیت تنقید نگار	95
۵	باب چہارم	مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ	100-143
		سماجی موضوعات	100

		سیاسی موضوعات	115
		معاشی موضوعات	124
		تہذیبی و معاشرتی موضوعات	129
		مذہبی موضوعات	138
۵	باب پنجم	مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا فنی تنقیدی تجزیہ	144-271
		پلاٹ	144
		کردار نگاری	157
		تکنیک	187
		زمان و مکان	211
		زبان و بیان	235
		عنوان اور نقطہ نظر میں رشتہ	250
۶		مفروضہ	272
۷		حاصل مطالعہ	275
۸		کتابیات	289
۹		رسائل و جرائد	294

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

پیش لفظ

ناول اردو نثر کی ایک اہم ترین صنف ہے، ناول زندگی کی مکمل تصویر ہے جس میں زندگی کے مختلف حادثات و واقعات دلچسپ پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صنف انگریزی ادب سے اردو میں آئی۔ابتداء میں اس میں داستانوی رنگ غالب تھا تاہم ناول گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان اثرات سے آزاد ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا رسوا کی ناول ''امراؤ جان ادا'' سے لے کر پریم چند کے مشہور ناول ''گئودان'' تک اردو ناول نے مختلف رنگ و آہنگ اختیار کئے۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں بھی بڑے آب وتاب کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔

موجودہ دور میں اردوادب کے چند ناموراور غیرمعمولی شہرت یافتہ ادیبوں میں جن لوگوں کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے ان میں مشرف عالم ذوقی کا نام سرفہرست ہے۔مشرف عالم ذوقی اردو نثرخصوصاً اردو ناول نگاری کے میدان میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ان کی تخلیقات جیسے ''عقاب کی آنکھیں''، ''نیلام گھر''، ''ذبح''، ''پروفیسرایس کی عجیب داستان وایا سونامی''، ''شہر چپ ہے''، ''لے سانس بھی آہستہ''، ''بیان''، ''پوکے مان کی دنیا''، ''مسلمان''، ''آتش رفتہ کا سراغ''، ''نالئہ شب گیر''اور''مرگ انبوہ'' وغیرہ وغیرہ اہم ناول ہیں۔

ذوقی کے ناولوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔مثلاً موجودہ انتظامیہ کی بدعنوانیوں، سماجی برائیوں، دفتروں میں افسر شاہی کے ظلم،عورتوں کا استحصال، پولیس کے جبر کی کہانیاں،فرقہ وارانہ فسادات،تقسیم ہند کا المیہ، بے روزگاری، بابری مسجد کا انہدام،بٹلہ ہاؤس اور جامعہ کا واقع وغیرہ کے علاوہ سیاسی موضوعات، سماجی موضوعات، معاشی موضوعات،تہذیبی و معاشرتی موضوعات اور مذہبی موضوعات وغیرہ قاری سے نظام کی تبدیلی کے لئے اٹھ کھڑے

ہونے کا تقاضہ کرتی ہیں۔

ذوقی کا نام جدید دور کے ناول نگاروں میں شامل ہیں۔انہوں نے ہر ایک موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہوگا جس پر انہوں نے نہ لکھا ہو۔وہ اپنے ناولوں میں موضوعات روزمرہ کی زندگی سے ہی اخذ کرتے ہیں۔غرض انہوں نے اپنے گہری نظر سے انسانی زندگی اور سماج سے جڑے ہر مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ذوقی اپنے ہر ناول میں قاری کو موضوعات کی جذبات کی ایک نئی دنیا کی سیر کراتے ہیں، ذوقی کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ گہرا ہے۔موضوع،مواد،تکنیک اور ہیت کے اعتبار سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ ان کی ناول ہمیں حقیقی زندگی سے بہت قریب نظر آتی ہے۔جب ہم ان کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صحیح معنوں میں اس میں زندگی کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔

پیش نظر مقالہ''مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' کی ان جملہ خصوصیات کی نشاندہی کرنے کی سمت ایک کوشش ہے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

ذوقی کے ناولوں کے متعلق خاطر خواہ مواد موجود نہ ہونے کے باعث ابتداء میں مجھے دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس سلسلے میں اپنے نگراں ڈاکٹر نسیم اختر صاحب کی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کا یہ مقالہ لکھنے کے لئے موقع اور قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔یہ ان کی حوصلہ افزائی کا ہی نتیجہ ہے کہ یہ مقالہ پائے تکمیل تک پہنچا۔میں نے اپنے مقالے کو تحقیق کے اصولوں اور تقاضوں کے مطابق پانچ ابواب اور ہر باب کو ذیلی ابواب میں تقسیم کیا ہے۔جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہیں:

مقالے کا پہلا باب'' ناول کی تعریف اور اردو میں اُس کی روایت'' ہے اس باب میں

ناول نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ناول کی تعریف ،کو پوری طرح سے سمجھنے اور واضح کرنے کے لئے اس باب کو دو ذیلی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔(۱) ناول کی تعریف اور قسمیں (۲)اردو میں ناول کی روایت۔

باب دوم:''مشرف عالم ذوقی کی شخصیت اور فکر وفن کی نشو ونما میں کارفرما عوامل''۔اس باب میں ذوقی کی شخصیت کے حوالے سے ان کی حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس باب کو تین ذیلی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے تا کہ ذوقی کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو اور ذوقی کی اصلی زندگی تک رسائی ہو۔اس باب کے تین ذیلی ابواب اس طرح سے ہیں:

(۱) ابتدائی زندگی،اس میں ذوقی کی پیدائش ،ماں باپ ،خاندان، تعلیم ،ہجرت آرہ سے دہلی ،ادب سے دلچسپی اور ادب سے وابستگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲) پیشہ وارانہ زندگی، اس ذیلی باب میں وہ تمام عوامل ہیں جنہوں نے مشرف عالم ذوقی کی شخصیت اور فکر وفن کے نشو ونما میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

(۳)ازدواجی زندگی ،اس باب میں ذوقی کی شادی اور اولاد وغیرہ کا مختصر تعارفی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم:''مشرف عالم ذوقی کی ادبی خدمات'' کے عنوان پر مبنی ہے۔اس باب کے بھی تین ذیلی ابواب ہیں جس میں (۱) بحیثیت افسانہ نگار (۲) بحیثیت شاعر (۳) بحیثیت تنقید نگار جیسے نکات پر بحث کی گئی ہے۔

باب چہارم:''مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ'' یہ باب میرے مقالے کا اہم باب ہے۔ چونکہ یہ باب موضوع سے متعلق، تحقیقی وتنقیدی تجزیہ اور بحث کا مطالعہ کرتا ہے۔اس لئے اس باب کو پانچ بنیادی اور اہم ذیلی ابواب میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ مشرف عالم

ذوقی کے تمام ناولوں کے موضوعات کو مقالے میں شامل کیا جا سکے۔جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ سماجی موضوعات

☆ سیاسی موضوعات

☆ معاشی موضوعات

☆ تہذیبی و معاشرتی موضوعات

☆ مذہبی موضوعات

میں نے باب چہارم کے تحت اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے موضوع کے بارے میں ہر ممکن حد تک تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کام میں کہاں تک کامیاب رہی ہوں اس کا فیصلہ بہر حال قارئین اور ناقدین کو کرنا ہے۔تاہم جہاں تک ہو سکا میں نے اپنی علمی استعداد اور دستیاب شدہ مواد کے مطابق ذوقی کی ناولوں میں موضوعات پر بحث کی اور حقائق کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی۔اس مقالے کے تیاری میں آنے والے تمام مشکل مراحل میں اپنے شفیق اور مہربان نگراں کی رہنمائی میں طے کیے۔

باب پنجم: ''مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا فنی تنقیدی تجزیہ''۔یہ باب بھی میرے مقالے کا اہم باب ہے۔اس میں بھی موضوع کے متعلق بحث کی گئی ہے۔یعنی اس باب میں ذوقی کے ناولوں کا فنی تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔اس باب کو بھی باقاعدہ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ذیلی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں (۱) پلاٹ (۲) کردار نگاری (۳) تکنیک (۴) زمان و مکان (۵) زبان و بیان (۶) عنوان اور نقطۂ نظر جیسے عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔

اختتامیہ میں مقالہ کے تمام ابواب اور ذیلی ابواب کا نچوڑ اور خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالہ کے آخر میں کتابیات کے عنوان سے میں نے ان تمام بنیادی اور ثانوی ماخذات یعنی ذوقی کے ناول، تنقیدی کتابوں کے علاوہ وہ رسائل وجرائد کی تفصیلی فہرست درج کی ہے۔

میں نے موضوع کی مناسب سے معلومات فراہم کرنے اور حقائق کی نشاندہی میں بساط بھر کوشش کی۔ ذوقی کے ناولوں کا تنقیدی تجزیہ کرتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھنے کی بھی کوشش کی کہ مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کے ساتھ انصاف کرسکوں، تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ کوئی بھی تحقیق حتمی نہیں ہوتی۔ یہ مقالہ میری ایک حقیر اور طالب علمانہ کوشش ہے جو آپ دانشوروں کے سامنے پیش ہے۔

اظہار تشکر

اس مقالے کے مکمل ہونے پر میں اللہ تعالیٰ کے شکر و سپاس سے اپنے دل کو مملو پاتی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے نہایت ہی مشفق و مخلص استاد اور نگراں ڈاکٹر نسیم اختر کی بے حد شکر گذار ہوں جن کی دستگیری اور مفید مشوروں کے بغیر یہ مقالہ پائیہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔ انہوں نے موضوع کا انتخاب سے لے کر تکمیل تک قدم قدم پر رہنمائی و مدد فرمائی۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر فخر اور خوشی رہی ہے کہ ان کے ساتھ مجھے طویل عرصے تک کام کرنے کا موقع ملا۔

میں مانو سٹیلائٹ کیمپس بڑگام کے سربراہ پروفیسر غضنفر علی صاحب، اعجاز عبداللہ صاحب، ڈاکٹر سراج الدین صاحب، مسٹر شوکت صاحب، حنا طاہر صاحبہ اور سعیدہ بانوں صاحبہ کے علاوہ شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ کرام پروفیسر نسیم الدین فریس صاحب، پروفیسر فاروق بخشی صاحب، ڈاکٹر شمس الہدیٰ صاحب، پروفیسر ابوالکلام صاحب، پروفیسر ڈاکٹر مسرت جہاں صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فریضہ سمجھتی ہوں جن کے گاہے بہ گاہے قیمتی مشورے میری رہنمائی کرتے رہے۔

میں ڈاکٹر بی بی رضا خاتون کا شکریہ ادا کرتی ہوں، جنہوں نے ہر وقت میری حوصلہ افزائی کی اور ہر وقت کام کے بارے میں پوچھ کر حوصلہ دیتی رہی اور ہمیں اپنی نیک دعاؤں سے نوازتے رہتے ہیں۔ میں ان کی عنایات اور اکرام کو ہرگز نہیں بھول سکتی۔ ان کا وجود میرے لئے کسی بھی طرح بڑی بہن سے کم نہیں ہے۔

میں سٹیلائٹ کیمپس کے غیر تدریسی عملے کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو ہر وقت میری مدد کے لئے پیش پیش رہے۔

ناانصافی ہوگی اگر میں نے ان اساتذہ کا شکریہ نہیں کروں گی جنہوں نے بچپن سے میری

رہنمائی کی اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔

میں اپنے مخلص دوست، رفیق وشفیق ہمصفر اور شریک حیات مسٹر توقیر یوسف کا بہت ہی شکر گزار ہوں، جو میری تعلیم اور تحقیق کے دوران میں مجھے ہر طرح کے تعاون، شفقتوں اور محبتوں سے نوازتے رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے محنت اور لگن سے مقالے کو ٹائپ اور کمپوز کر کے میری مدد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہر مراد پوری کرے اور انہیں دنیا اور آخرت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

میں تمام کتب خانوں کے سربراہ مانو کے لائبیرین کا شکریہ ادا کرنا اپنا فریضہ سمجھتی ہوں جن کے تعاون کے بغیر بعض کتابوں اور اہم ماخذات تک میری رسائی محال تھی۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اساتذہ محترم ظہور احمد شاہ نے بھی میری رہنمائی اور مدد فرمائی اور ان کی نیک دُعائیں ہمیشہ میرے ساتھ ہیں۔

میں اپنے والد بشیر احمد بٹ اور اپنی والدہ نسیمہ بانو کی بڑی احسان مند ہوں جن کی شفقتوں نے مجھ سے ہمت کا دامن کبھی چھوٹنے نہیں دیا۔

اپنے دیگر عزیز واقارب کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن میں غلام حسن بٹ، سیار احمد اور راسق احمد کے علاوہ فردوس احمد، نصیر احمد، عبید اقبال، بیوٹی، نصرت، حنا، ساقیہ، سیرت، مسکان، نادیہ، ارتضیٰ، سلمہ، رمیسہ، سایما اور دیگر رشتہ داروں کی بھی شکر گذار ہوں جو مجھے نیک دعائیوں سے نوازتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں کو ان کے شایان شان اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

میں محترم مشرف عالم ذوقی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود میرے لئے وقت نکالا۔ میں نے ان سے ملاقات اور ای۔میل کے ذریعے

ان سے رابطہ قائم کیا ان کے ذریعے فراہم کی گئی گراں قدر معلومات اور ان کے دیے ہوئے مشورے میرے لئے معاون ثابت ہوئے۔

میں اپنے عزیز دوستوں جن میں نویدہ علی، ڈاکٹر مسرت گیلانی، سبیہا حسن، شگفتہ یوسف، ریحانہ، سلیتہ، بلقیس امین، پاکیزہ اختر، عشرت، یاسمین، طاریق ابرار، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر ہلال احمد، ڈاکٹر محمد حسین وانی، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی اور خورشید احمد کے علاوہ سٹیلائٹ کیمپس کے تمام ریسرچ اسکالرز کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں، میں ممنون ومشکور ہوں ان احباب اور دوستوں کی بھی جنہوں نے مقالے کی تیاری میں کسی نہ کسی شکل میں معاونت اور مدد کی۔

میں اپنی مخلص دوست سمیرا بانو کی بھی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی اور مدد فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے اور ان کا مستقبل روشن کرے۔ آمین۔

سمیہ بشیر

ناول کی تعریف اور اردو میں اس کی روایت

ناول کی تعریف:۔

ناول اطالوی زبان کے لفظ ''ناویلا''(Novella) سے نکلا ہے جس کے معنیٰ ہیں 'نیا'۔ یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ ناول ایک نئی چیز تھی۔ ناول کا لفظ اردو ادب میں انگریزی ادب کے راستے سے آیا ہے۔ یہ نثر کی ایک قسم ہے جس کا اطلاق ایسے قصوں پر ہوتا ہے جن میں واضح اور منظّم پلاٹ ہو اور خیالی کہانیوں کے بجائے حقیقی زندگی کے مسائل و واقعات بیان کئے جائیں۔ اٹلی(Italy) والے ناول کو ناولا کے نام سے یاد کرتے تھے وہ روز مرہ کے واقعات اور حادثات کو تسلسل اور ربط کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کی بنیاد کہانیوں اور داستانوں پر رکھی جاتی تھی۔ پرانے زمانے میں داستان گو درباروں میں ملازم ہوا کرتے تھے اور یہ لوگ محفلوں اور مجلسوں میں داستانیں سنایا کرتے تھے اسی نہج پر کہانیوں اور داستانوں کی روایت چلتی رہی اور آہستہ آہستہ ان کہانیوں اور داستانوں کا شمار ادب میں ہونے لگا۔

قصہ کہنا اور سننا پہلے سے ہی انسانی فطرت میں داخل ہے دراصل قصہ کا وجود پہلے سے ہی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے جیسے حضرت آدم و حوا کی کہانی بذاتِ خود ایک قصہ ہے۔ ناول داستان کی ایک ارتقائی شکل ہے داستان کی طرح ناول کی تکمیل بھی قصہ پن سے ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:۔

> ''قصہ سے لطف اندوز ہونا ہماری فطرت میں داخل ہے۔ انسان ہمیشہ سے قصہ میں دلچسپی لیتا ہے اور ہمیشہ لیتا رہے گا۔ کوئی کہانی خواہ کسی طرح بیان کی جائے ہمارا دھیان اس طرف لگ جاتا ہے۔ ہمارا کوئی عزیز دوست کہیں سے واپس آئے ہم اس کے حالات سننے کے لئے بیقرار ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی واقعہ کو یوں شروع کرے'' آج عجیب بات ہوئی'' تو ہم سننے کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں اور جب تک وہ بات پوری نہ کر دے ہمیں تسلی نہیں ہوتی۔ اگر سڑک پر جاتے ہوئے ہم کچھ لوگوں

کوغل غپاڑہ مچاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو فوراً دریافت کرتے ہیں
کہ کیا قصہ ہے۔الغرض قصہ کے ساتھ دلچسپی ایک فطری امر ہے
اور ہماری فطرت کا ایسا تقاضا ہے جس سے ہم متاثر ہوئے بغیر
نہیں رہ سکتے۔'' [1]

ناول ایک ایسی صنف ہے جو ہمیں حقیقی دنیا سے جوڑ کے رکھتی ہے جس میں انسانی زندگی کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔یعنی ناول نگار کے ذہن میں جو تصویر ہوتی ہے اس کی عکاسی وہ الفاظ کے ذریعے بیان کرتا ہے۔مثلاً جب ہم نذیر احمد کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اصلاحی پہلو نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں عورت کو سلیقہ مند ہونے کی تلقین کی ہے تاکہ وہ اپنے خاندان کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کر سکے یا مرزا ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' قاری کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ایک طوائف صرف بے حیا اور بدکردار نہیں ہوسکتی بلکہ وہ کبھی کبھی زمانے کے ہاتھوں مجبور اور مظلوم بھی ہوسکتی ہیں۔طوائف کو دیکھ کر ہمیشہ یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ بدکردار، بے حیا اور بے شرم ہے لیکن ''امراؤ جان ادا'' کو پڑھ کر طوائف سے ہمدردی ہوتی ہے۔ایک ناول نگار بغیر کسی مقصد کے نہیں لکھ سکتا۔اس لئے ناول لکھنے کے لئے کسی نہ کسی مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ناول قصہ نگاری کی ایک ایسی صنف ہے جس کے لئے کسی نہ کسی مقصدیت کا ہونا ضروری ہے۔ناول میں اگر ہم ماضی کی بات کریں تو بھی ہم حال کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔ناول ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہماری امنگیں اور آرزوئیں جھلکتی ہیں جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہمارے سامنے کیا مشکلیں آتی ہیں اور ہم ان مشکلوں پر کس طرح قابو پاتے ہیں۔ناول سے جو کام لیا جاتا ہے وہ کسی اور طرح ممکن نہیں۔ناول زندگی کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔ناول سے ایک ذہنی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

ناول کے فن کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ذریعے زندگی کے حقائق کی آئینہ داری ہوتی ہے اور اس کے ذریعے ہم اپنے معاشرے میں ہو رہی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ناول بنیادی طور پر تخیلات سے زیادہ تجربات کا شعور رکھتا ہے۔ناول نگار ناول میں نہ صرف خیالی باتوں کو پیش کرتا ہے بلکہ ان خیالی باتوں کو حقیقی زندگی کے لئے پیش کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ناول کے واقعات میں خوشی اور دلچسپی کے عناصر کا ہونا ضروری ہے۔اس کا بندوبست صرف اس حد تک ہوتا ہے کہ جس سے ناول کے واقعات میں کشش اور دلچسپی

برقرار رہے۔ ناول کا فن، حقیقی زندگی کی روشنی میں ہی سامنے آتا ہے۔ ناول کے واقعات میں دلچسپی اور خوشی قاری کے اندر حسن کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے اس کے دل میں ایک خاص قسم کی مسرت ہوتی ہے۔ ناول کے ذریعے انسانی زندگی کے تمام معاملات، جذبات، تجربات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ناول میں چونکہ خود انسان کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے ارد گرد واقعات کا تانا بانا بنا جاتا ہے اور اسی کے تعلق سے زندگی کی معنویت اور اس کی داخلی قوتوں اور خارجی رشتوں نیز کائنات کی دیگر حقیقتوں کی تلاش کی جاتی ہے اور معاشرتی زندگی کی یہ کیفیت ان ناولوں کے ذریعے سامنے آتی ہے۔

ناول نگار اپنے زمانے کے حالات اور داخلی زندگی کی تمام مشکلات کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے دور کے مختلف انسانی تجربوں کو ایک خاص فنی طریقے کے ساتھ بیان کر دیتا ہے اور ان انسانی تجربوں کے اظہار کا یہی فنی طریقہ، ناول کے فن کے تصور کو پیش کرتا ہے۔ ناول انسانی زندگی کا بھرپور اور مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس میں زندگی کے اہم واقعات ہی بیان نہیں ہوتے بلکہ حقیقت کی سچی تصویر بھی سامنے آتی ہے جس میں ناول نگار اپنے تجربات اور اپنے خیالات کا منظر پیش کرتا ہے اور قاری جب اس تصویر کو دیکھتا ہے تو کچھ دیر کے لئے وہ اسی میں کھو جاتا ہے اس طرح سے ناول زندگی کی تصویر ہی نہیں بلکہ تفسیر بھی ہے۔ کوئی بھی ادیب صفحات کی تعداد سے بڑا ادیب نہیں کہلاتا بلکہ اس کی فنی خصوصیات سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک ناول اسی وقت بڑا یا اچھا ناول کہلاتا ہے جب ناول کے پڑھنے کے دوران زندگی کی بعض غیر اہم باتوں کا بیان بھی اس طور پر کیا جائے کہ جب ہم ناول ختم کریں تو ہمیں احساس ہو کہ ہم نے زندگی کے مطالعے کا ایک نیا نقطۂ نظر حاصل کر لیا ہے یا زندگی کو ایک الگ زاویئے سے سمجھنے کا احساس ہمارے اندر ابھرنے لگا ہے۔

ناول میں صرف زندگی کا نقشہ ہی نہیں ملتا بلکہ زندگی کی نئے سرے سے تخلیق ملتی ہے یہ زندگی کی تخلیق اس طور پر کرتا ہے کہ جو چیز زندگی میں موجود نہیں ہوتی وہ بھی ناول میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہے جو ناول کے ذریعہ زندگی کو ایک خاص معنی اور اہمیت دے دیتی ہیں۔ زندگی کی حقیقت ایک سمندر کی سی ہے جو ہر قسم کے تضاد، اختلافات اور تنوع سے بھری پڑی ہے مگر اس میں ترتیب یا تسلسل کا ہونا ضروری ہے۔

ناول میں توجہ کا مرکز کردار ہوتے ہیں۔ جن کا تعلق اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں سے ہوتا

ہے۔اس میں واقعات اگر چہ کردار کے مطابق ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک رشتہ بھی موجود رہتا ہے۔

داستان میں کردار کے صرف خارجی رخ کو پیش کیا جاتا ہے مگر اسباب پر کوئی روشنی نہیں ڈالی جاتی ہے لیکن ناول میں خارجی رشتوں کے ساتھ ساتھ باطنی حقیقتوں کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ناول میں انسان کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے اردگرد تمام واقعات گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

''ڈاکٹر احسن فاروقی'' نے ناول کے بارے میں لکھا ہے:

> '' ناول میں سب سے زیادہ اہم چیز زندگی کی تخلیق ہوتی ہے۔زندگی ہر صنف ادب کے لئے ضروری ہے مگر جتنے مکمل طور پر اور جتنی قریب اگر زندگی کی ناول تخلیق کرتی ہے اتنی کوئی اور صنف ادب نہیں کرتی۔اس لئے ناول سے دلچسپی زندگی سے دلچسپی ہے۔ناول اس وقت وجود میں آئی جب انسان کو توہمات سے ہٹ کر زندگی میں دلچسپی ہوئی اور ناول ترقی کرتی گئی۔جوں جوں یہ دلچسپی بڑھتی گئی ہمارے اس وقت اور زمانہ کے اثر سے زندگی میں کچھ سطحی سی دلچسپی پیدا ہوئی۔'' ۲؎

مندرجہ بالا تعریفوں کے علاوہ ایچ۔لارنس، ایچ۔جی ویلز، رالف فاکس، ہنری جیمس کے تعلق سے اس صنف کی جو مختلف تعریفیں ملتی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک نثری قصہ ہے جس میں تخیل اور تصور کو ایک پلاٹ، مختلف واقعات اور چند کرداروں کی مدد سے زندگی کو بعض اہم حقائق کو سائنسی عہد کے پس منظر میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ناول میں چونکہ حقیقی زندگی کا عکس ہوتا ہے اس لئے اس صنف کو سماجی زندگی کا آئینہ دار کہا گیا ہے۔

ناول کی قسمیں

جس طرح زندگی مختلف رنگوں سے عبارت ہے اور اس کے بہت سارے پہلو ہیں اسی طرح اس کو پیش کرنے کا انداز بھی مختلف ہیں۔ ناول زندگی کی تصویر ہے اس میں زندگی کے مختلف واقعات اور حادثات کو پیش کرنے کے لئے مختلف طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ جیسے مواد، موضوع، تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے مختلف قسمیں ہیں جس طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھینچا جا سکتا اسی طرح ناول کے اقسام کے بیچ کوئی فاصلہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر ہم ناول کے اقسام کی بات کریں تو اس کی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اصلاحی ناول ہے، اس میں ابتدائی دور کے ناول آتے ہیں۔ دوسری قسم تاریخی ناول ہے اور تیسری قسم رومانی ناول ہے۔ اس کے علاوہ ناول کے اور بھی اقسام ہیں جو کچھ اس طرح سے ہیں، واقعاتی ناول، کرداری ناول، حادثاتی ناول، کردار معاشرتی ناول، نفسیاتی ناول، سماجی ناول، جاسوسی ناول، تہذیبی ناول، حقیقت و مثالیت پسند ناول، سوانح ناول وغیرہ۔ ان اقسام کا ذکر حسب ذیل ہیں:

ا۔اصلاحی ناول:۔ اس قسم کے ناولوں میں ناول نگار کسی خاص مقصد کو پیش کرتا ہے۔ مثلاً سماج، معاشرہ، فرد اور عوام میں جو بھی برائی اور خرابی پیدا ہوئی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لئے ایسے ناولوں کو اصلاحی ناول کا نام دیا گیا ہے تا کہ ان سے سماج کی اصلاح کی جا سکے اور ان ناولوں کے ذریعے سماج میں پیدا ہونے والی برائی اور خرابی سے پردہ اٹھایا جا سکے۔ جب ناول نگار کسی خاص مقصد کے تحت ناول تخلیق کرتا ہے تو وہ اس میں واقعات اور کردار کا انتخاب بھی کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر پیش کرتا ہے۔ ایسے ناولوں میں دو طرح کے کردار ہوتے ہیں، ایک بہت اچھا اور دوسرا بہت برا۔ اچھے کردار کے ذریعے وہ سماج کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اچھے قسم کے لوگ ہمیشہ اچھے ہی ہوتے ہیں یعنی وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں اور برے کرداروں کو بری شکل میں پیش کرتا ہے اور ناول کے آخر میں ایسے کرداروں کا انجام بہت برا اور خوفناک ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ اس قسم کے ناولوں میں اچھے اور برے یعنی ہر قسم کے انسانوں کا تجزیہ ہوتا ہے۔ اردو ادب میں ہمیں اصلاحی ناولوں کی مثال ابتدائی دور کے ناولوں میں ملتی ہے مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''توبتہ النّصوح'' اور ''مراۃ العروس'' وغیرہ ہیں۔

ناول ''توبتہ النصوح'' کا موضوع اولاد کی تربیت اور دین کی تعلیم ہے۔اس ناول میں مصنف نے بچوں کی تعلیم کا احساس دلایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ماں باپ کو چاہئے کہ وہ بچوں کا ابتدائی عمر سے ہی خیال رکھیں۔کیونکہ جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کی تعلیم و تربیت، تہذیب اور اصلاح میں دشواری ہوتی ہے۔اس مقصد کے لئے نذیر احمد نے ایک خاندان کی اصلاح کا نقشہ دکھایا ہے۔ناول کا مرکزی کردار نصوح ہے۔نصوح اپنے خاندان کی اصلاح کی طرف مائل ہوتا ہے۔اچانک ایک دن نصوح وبائی مرض ہیضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس مرض کی وجہ سے اسے دنیا کی بے ثباتی یاد آ جاتی ہے،ایک رات وہ خود کو روز محشر میں مجرموں کے ساتھ پاتا ہے تو اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے،اور اس بیداری کے باعث صحت یاب ہونے کے بعد ایک نیا لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔نذیر احمد نے نصوح کے ذریعے ایک خاندان کی اصلاح کا نقشہ سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے۔اس میں انہوں نے واقعات اور جزئیات سے اس طرح کام لیا ہے کہ پورا قصہ سچا اور اصلی معلوم ہوتا ہے۔انہوں نے ایک خاص مقصد سماج کی اصلاح کو مدنظر رکھ کر ناول کی تخلیق کی ہے۔

۲۔تاریخی ناول:۔ ناول کی ایک قسم تاریخی ناول ہے۔یہ ناول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ایک قسم وہ جس میں ناول نگار کی تاریخی شخصیت کو پیش کرتا ہے۔دوسری جس میں کسی تاریخی واقعہ کو کہانی کا رنگ دے کر بیان کیا جاتا ہے اور تیسری یہ کہ جب وہ کسی ملک کی تاریخ یا عہد کو پیش کرتا ہے۔سروالٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott) نے یورپ میں اس قسم کے ناولوں کو کمال تک پہنچایا اور اس کی پیروی میں ڈوما (Dumas) اور ہیگو (Hugo) نے اس کمال کو قائم رکھا۔تاریخی ناول لکھنے کا یہ کام بہت اہم اور مشکل ہے۔اس کام کو آسان بنانے کے لئے ایک ناول نگار کو پہلے تاریخ کا بہت وسیع اور گہرا مطالعہ ہونا چاہئے اور اس کے بعد وہ اس تاریخی عہد یا ملک کا نقشہ اس طرح کھینچے کہ وہ عہد بالکل جیتا جاگتا ہماری نظروں کے سامنے آ جائے اور تیسرا یہ کہ ناول نگار کو اپنے تاریخی ماحول سے کسی نہ کسی طرح کا ذاتی تعلق ہونا چاہئے۔اسی لئے جب بھی ایک ناول نگار تاریخی ناول لکھے تو وہ ماضی کے واقعات کو اس طرح پیش کرے تاکہ وہ ہمیشہ زندہ اور متحرک نظر آئے۔تاریخی ناول نگار کو لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس میں ہر بات تاریخی حیثیت سے صحیح ہو ہاں مگر ایسے واقعات کو بھی شامل کر سکتا ہے جو صحیح نہ ہوں اور ناول نگار اس میں ضرورت کے تحت غیر تاریخی کردار بھی وجود میں

لا سکے اور غیر تاریخی واقعات بھی بیان کر سکے۔اس کے علاوہ ایسا لگنا چاہئے کہ جیسے ناول نگار اسی ماحول سے وابستہ ہو یا تعلق رکھتا ہو۔اردو میں تاریخ ایک مشکل فن ہے لیکن پھر بھی اردو ناول نگاروں نے اس کی طرف توجہ دی جن میں سب سے اہم ''عبدالحلیم شرر'' ہیں۔انہوں نے اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد ڈالی ''فردوس بریں'' ان کا مشہور تاریخی ناول ہے۔اس کے علاوہ ''منصور وموہنا'' اور ''فلورا فلورنڈا'' بھی تاریخی ناولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

شرر کا ناول ''منصور وموہنا'' تاریخی ناول کی بہترین مثال ہے۔یہ ناول سرزمین ہند سے تعلق رکھتا ہے۔اس ناول میں شرر نے سلطان محمود غزنوی کے حملہ سندھ کا منظر پیش کر کے دسویں صدی عیسوی کے ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کی ہے۔اس ناول کا ہیرو منصور سلطان غزنوی کی فوج کا ایک سردار ہے۔جو انصاری خاندان کی ایک لڑکی عذرا اور ہندو راجہ اجیر کی لڑکی موہنا سے محبت کرتا ہے اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے بعد جنگ کے دوران منصور اور عذرا مارے جاتے ہیں۔موہنا جب اپنے عاشق کی لاش کو دیکھتی ہے تو وہ خود بھی خودکشی کر لیتی ہے اور اس طرح سے یہ ناول منصور، عذرا اور موہنا کے المناک حادثے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔اس ناول میں سب سے زیادہ مضبوط کردار موہنا کا ہے۔وہ اپنی پاک دامنی اور بےلوث عشق کی وجہ سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

اس کے علاوہ ان کے تاریخی ناولوں میں ''یوسف نجمہ''، ''حسن انجلینا''، ''ملک العزیز ورجنا''، ''زوال بغداد''، ''فلپانا'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

<u>**۳۔رومانی ناول:۔**</u> ناول کے اقسام میں رومانی ناول بھی ایک قسم ہے۔اس قسم کے ناولوں میں اکثر ایسے ناول شامل کیے جاتے ہیں جن میں دور دراز علاقے یا ممالک کے سفر کا جائزہ لیا جائے یا وہاں کے حالات و واقعات کا ذکر کیا جائے۔رومانی ناولوں میں خیالوں کی قیاس آرائی ہوتی ہے۔یہاں ناول نگار زندگی کے عام واقعات اور کرداروں کو خیالوں کی مدد سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان ناولوں کو پڑھ کر قاری کو حیرت ہوتی ہے اور ان کو دیکھ کر خوف زدہ بھی ہو جاتے ہیں۔ان ناولوں کو پڑھنے سے قاری کو تسکین اور ان کی حسرتوں، آرزوں، تمناؤں اور امنگوں کی تکمیل ہوتی ہے۔اس میں ایسی حقیقتیں سامنے آتی ہیں کہ جہاں ایک

عام انسان کی رسائی تک حاصل کرنا ممکن نہیں ہے لیکن اس حقیقت تک رومانی ناولوں کے ذریعے آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ انسان کی روزمرہ زندگی میں اکثر ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کے بارے میں قاری کو کوئی معلومات نہیں ہوتی لیکن جب قاری ان کو ناولوں میں پڑھتا ہے تو اس کو حیرت ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ تعجب بھی ہوتا ہے۔ اس قسم کے ناولوں میں مصنف ایسے کرداروں کو پیش کرتا ہے جو اکثر و بیشتر ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو قاری کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور اس طرح وہ حیرت کا باعث بنتے ہیں۔ اس بات کا ذکر پہلے ہی ہوا ہے کہ اس میں مختلف ممالک کے سفر کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مثلاً عزیز احمد کا ناول ''گریز'' ہے اس میں انہوں نے یورپ کے مختلف ممالک کی زندگی اور مختلف ممالک کی سوسائٹی کے نقشے کو اُبھارا ہے۔ جب ہم ان سوسائٹیوں پر غور وخوض کرتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم کس طرح ان سے مختلف ہیں اور کس طرح ان کے اخلاق و عادات کو ہم تعجب کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

عزیز احمد کا یہ ناول بے حد مشہور اور مقبول ہے۔ اس ناول میں ہندوستانی نوجوانوں کی کہانی ہے۔ جو آئی۔ اے۔ ایس کے لئے چنا گیا ہے اور امتحان دینے کے سلسلے میں انگلستان اور یورپ کی سیر کرتا ہے۔ اس ناول میں عزیز احمد نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک کا زمانہ دکھایا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نعیم ہے۔ نعیم بیسویں صدی کے تمام اہم رجحانات اور میلانات کا آئینہ دار ہے۔ شروع سے آخر تک ناول نگار نے نعیم کی داخلی اور نفسیاتی حالت کو سامنے لایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خارجی زندگی کی وہ تمام باتیں جن سے نفسیاتی زندگی متاثر ہوتی ہے وہ بھی ناول میں بڑی ہی عمدگی کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ جیسے نعیم اور بلقیس کی محبت کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے دکھایا ہے کہ بلقیس کی محبت نعیم کی نفسیاتی زندگی کا جز بن کر رہ جاتی ہے۔ بلقیس کی محبت نعیم کو بار بار ستاتی ہے اور اس کے ذہن میں بار بار اس کا تصور آتا ہے۔

نعیم آج کے دور کا وہ نوجوان ہے جس کا ذہن بیسویں صدی کے نئے علوم کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ اپنی اور اپنے اردگرد کی زندگی کی پوری خبر رکھتا ہے۔ جدید دور کے نوجوان کا ذہن جن خیالات، تصورات اور علوم سے واقف تھا اور جس طرح دنیا کے حالات نے ان کی ذہنی زندگی میں جوش پیدا کر رکھا تھا اس کی تصویر کشی اس ناول میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ علاوہ ازیں عزیز احمد نے اس ناول میں اپنے زمانے کی تصویر دکھانے کی کامیاب

کوشش بہترین انداز میں کی ہے۔

۴۔نفسیاتی ناول:۔ اس قسم کے ناولوں میں نفسیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔نفسیاتی ناولوں میں ناول نگار انسان کے نفسیات کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتا ہے اور نفسیاتی ناولوں میں فرد کی زندگی کے حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔اس قسم کے ناولوں میں کردار اپنی زندگی کو آپ بیتی کے انداز میں پیش کرتا ہے جو کچھ اس نے ماضی میں دیکھا ہے یعنی اس میں فرد اپنے ماضی کو یاد کرتا ہوا منظر پر آتا ہے یا جن چیزوں سے وہ متاثر ہوا ہے، جو کچھ بھی اس پر بیتی ہے، سماج اور معاشرے نے جو بھی سلوک اس کے ساتھ کیا ہے، جس طریقے سے اس نے دوسروں سے برتاؤ کیا ہے وغیرہ۔اس میں انسان کی نفسیاتی کیفیت کو سامنے لایا جاتا ہے۔قصہ کے لحاظ سے ایسے ناولوں میں ربط وتسلسل نہیں ہوتا بلکہ فرد کی نفسیات پر ان کا انحصار ہوتا ہے اور جب قاری اس قسم کے ناولوں کا مطالعہ کرتا ہے تو ہمیں ناول نگار کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے یا قاری کی دلچسپی ناول سے زیادہ ناول نگار کی ذہنی کیفیت میں بڑھتی جاتی ہے۔نفسیاتی ناول میں ہیت نہیں ہوتی اور کہیں کہیں ان میں تسلسل بھی نہیں ملتا۔یہ ناول نگاری کا بالکل نیا طریقہ ہے۔نفسیاتی ناولوں کی مثال ''عصمت چغتائی'' کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ہے کیونکہ اس ناول میں زیادہ اہمیت ایک ہی کردار کو حاصل ہے اور وہ ''شمن'' کا کردار ہے۔

کہا جاتا ہے کی شمن کے کردار کا سارا ٹیڑھا پن عصمت کی زندگی سے اخذ ہوا ہے۔عصمت نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ:

''وہ بیج جس سے میری ہستی وجود میں آئی
قطعی ٹیڑھا میڑھا نہ تھا۔ضرور پالنے پوسنے
میں کہیں بھول چوک ہوگئی۔ ۳؎

پالنے پوسنے کی وجہ سے جس طرح عصمت کے کردار میں ٹیڑھا پن آجاتا ہے بالکل اسی طرح اس غلط پرورش کی وجہ سے شمن کے کردار میں ٹیڑھا پن دکھایا گیا ہے۔عصمت کئی بچوں کے بعد پیدا ہوئی تھیں اور شمن بھی کئی بچوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔عصمت نے اس ناول میں شمن کی پیدائش بھی انہی حالات میں دکھائی ہے۔عصمت شمن کے بارے میں لکھتی ہیں:

''وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی.........تو بچوں کے بعد ایک کا
اضافہ، جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی اور دس بج
گئے......حد ہوگئی تھی بہن، بھائی اور پھر بہن بھائی۔ بس معلوم
ہوتا تھا بھیک منگوں نے گھر دیکھ امڑے چلے آتے ہیں ویسے ہی
کیا کم موجود تھے جو اور پے در پے آ رہے تھے.....دو ایک بھائی
بہنوں نے تو ذرا چاؤ چونچلے کئے پر اب بڑی آپا کا بھی جی بھر چکا
تھا، اور وہ بیزار تھیں۔ خیر انا موجود تھی اور وہ پل رہی تھی۔'' ؎

اس ناول میں عصمت چغتائی نے شمن کی نفسیاتی کشمکش کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کی نفسیات میں جو تبدیلی آتی ہے اس کو عصمت نے ناول میں جگہ جگہ نمایاں کیا ہے۔ شمن کے ذریعے عصمت نے زندگی کے بے شمار حقیقی پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ عصمت چغتائی نے اس ناول میں ایک متوسط گھرانے کی لڑکی، اس کی جذباتی اور نفسیاتی زندگی اور وہ ماحول دکھانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ پرورش پاتی ہے۔

۵۔ <u>سماجی ناول</u>:۔ سماجی ناول وہ ناول ہے جس میں نہ کسی گھر کے حالات بیان کیے جاتے ہیں، نہ کسی خاندان کے حالات اور نہ کسی طبقہ کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے بلکہ اس میں سماج کے مختلف شعبہ ہائے زندگی، مذہب، سماجی حالات، رہن سہن، شادی بیاہ کی تقریبات، رسم ورواج، معاشی حالات، طبقاتی کشمکش، سماجی برائیاں اور خرابیاں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں۔

۶۔ <u>واقعاتی ناول</u>:۔ یہ ناول کی ایک سیدھی سادی قسم ہے۔ اس قسم کے ناول میں ناول نگار مختلف واقعات کو جوڑتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس قسم کے ناولوں میں زیادہ تر اہمیت قصے کو حاصل ہوتی ہے۔ اس میں کردار واقعات کے تابع نہیں ہوتے بلکہ واقعات کے ذریعے کرداروں کا جنم ہوتا۔ ناول نگار اپنے ناولوں میں مختلف اور دلچسپ واقعات کو ربط وتسلسل کے ساتھ ایک ہی لڑی میں پرو کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کے ناولوں میں کردار کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی بلکہ ان کی ضمنی حیثیت ہوتی ہے۔ یہ قصہ کو آگے بڑھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر اس طرح کے ناولوں کا انجام طربیہ ہوتا ہے۔ واقعاتی ناول کی بہترین مثال ''رتن ناتھ سرشار'' کا ناول ''فسانہ آزاد'' ہے۔

سرشار نے صرف لکھنو کے معاشرے اور وہاں کی زندگی کو دکھایا ہے۔اس معاشرے کی ایسی مکمل تصویر کشی کی ہے کہ جس میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر جذبہ نظر آئے اور انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کی بھر پور اور کامیاب عکاسی کی ہے کیوں کہ انہوں نے ہر رنگ اور ہر مجلس کو دیکھا ہے۔

۷۔کرداری ناول:۔ ناول کی یہ قسم بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس قسم کے ناولوں میں قصہ یا واقعات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں زیادہ تر زور کرداروں پر دیا جاتا ہے اور نہ یہ کہ واقعات کردار کو متاثر کرتے ہیں بلکہ کردار کے عمل وحرکات کے ساتھ واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔اور ان کرداروں میں وہ تمام خصوصیات ہوتی ہیں جو ہمیں مثالی کرداروں میں نظر آتی ہیں۔کرداری ناولوں میں ناول کی شروعات ایک کردار سے ہوتی ہے اور دھیرے دھیرے ان ناولوں میں کرداروں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔اور یہ کردار شروع سے ہی پختہ ہو کر سامنے آتے ہیں اور زندگی کے صرف ایک ہی پہلو کو پیش کرتے ہیں۔اس طرح ناول نگار کرداروں کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔اس قسم کے ناولوں میں عموماً کردار سادہ ہوتے ہیں اور اس میں ناول نگار مرکزی کردار کو اکثر و بیشتر سفر کرتے ہوئے دکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں اور اس میں ناول نگار کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ قاری کی معلومات میں اضافہ ہو جائے۔اس میں سماجی زندگی کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ان ناولوں کا انجام بھی واقعاتی ناول کی طرح طربیہ ہوتا ہے۔اردو میں کرداری ناول کی اچھی مثال سرشار کا ناول ''فسانہ آزاد'' ہے۔اس میں خوجی کا کردار کسی بھی جگہ بدلتا نہیں ہے وہ ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے ۔

سرشار نے مختلف انداز میں مختلف طبقوں کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ان کا ہر کردار اپنے طبقے کی پوری عکاسی کرتا ہے۔احسن فاروقی نے سرشار کی کردار نگاری پر اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔

''سرشار کا تمام تر زور کردار نگاری پر ہے۔'' ؎۵

اس کے علاوہ اختر انصاری لکھتے ہیں کہ:

''فسانہ آزاد کے اہم ترین اور نمایاں ترین اوصاف میں اگلی چیز کردار نگاری ہے۔سرشار کو اس فن میں بڑی دستگاہ حاصل

تھی۔انہوں نے سینکڑوں مختلف اور متنوع کردار اپنے ناول میں

خلق کئے ہیں۔''   ۶

فسانہ آزاد کے تمام کردار یک رخے ہیں۔سرشار نے اردو کا بہترین یک رخا کردار خوجی کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۸۔حادثاتی،مہماتی یا صحافتی ناول:۔ یہ تینوں ناول کی ایسی قسمیں ہیں جن میں کرداری اور واقعاتی دونوں ناولوں کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ان ناولوں میں قصہ سے قصہ نکلتا ہے اور ناول نگار ان قصوں کو ربط وتسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے اور آخر میں جب قصہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ خوشی کے ساتھ انجام تک پہنچتا ہے۔ایسے ناولوں میں واقعات اور کردار دونوں کی منفرد حیثیت ہوتی ہے۔وہ ایک دوسرے کو عام طور پر متاثر نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود بھی ان ناولوں میں اعلیٰ قسم کے کردار نظر آتے ہیں۔

مہماتی ناول میں ایک حادثہ کے بعد دوسرا حادثہ اور ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ شروع ہوتی ہے جن کو ربط وتسلسل کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اس قسم کے ناولوں کا سہارا حادثات،اتفاقات اور قسمت سے لیا جاتا ہے۔ایسے ناولوں کا مقصد کردار نگاری یا واقعات کا بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہ قاری کی خواہشات،آرزؤں اور تمناؤں کی تکمیل اور تسکین کے سبب بنتے ہیں۔ایسے ناولوں میں پلاٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں سارا زور واقعات اور کردار پر دیا جاتا ہے۔

صحافتی ناول وہ ناول ہے جو اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔کیونکہ ناول نگار اس قسم کے ناولوں کو قسطہ وار اخباروں میں شائع کرتے ہیں۔ پڑھنے والے سامعین اس طرح کی ناولوں کو ایک ہی نشست میں پڑھنا نہیں چاہتا بلکہ اس طرح کے ناولوں کو قسط وار پڑھنا چاہتا ہے۔صحافتی ناول کی پہلی قسط بڑی آسانی سے لکھی جاتی ہے اور آخر کی اقساط میں ایسا سسپنس رکھا جاتا ہے کہ قاری اس تجسس میں پڑھتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے صحافتی ناولوں میں مصنف کو بہت آزادی ہوتی ہے کیونکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اس میں پلاٹ اور کردار زیادہ پھیلاؤ چاہتے ہیں۔اس لئے وہ زیادہ تر فائدہ مند اور ضروری باتوں کو جگہ دیتے ہیں۔اس قسم کے ناولوں میں ہمیشہ کردار حرکت میں رہتے ہیں۔صحافتی ناولوں کی بہترین مثال ہمیں پنڈت رتن

ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' میں ملتی ہے۔

سرشار نے اپنے ماحول اور عصری تقاضوں کومحسوس کر کے ''فسانہ آزاد'' کا سلسلہ شروع کیا جو قسط وار اودھ اخبار میں شائع ہوتا رہا۔ یہ سلسلہ اس قدر قارئین کو پسند آیا کہ یہ دسمبر ۱۸۷۸ء تا دسمبر ۱۸۷۹ء پورے ایک سال تک جاری رہا۔لیکن ابتداء میں اس کا کوئی نام نہیں تھا اور جب یہ قسط وار اخبار میں آتا تھا تو ان قسطوں کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ان کا کوئی عنوان دیا جاتا تھا اور دسمبر ۱۸۷۹ء کے بعد اشتہارات میں اس کا نام ''ناول آزاد فرخ نہاد'' رکھا گیا۔اور جب یہ کتابی شکل میں آیا تو اس کا نام قاری رانا دلیپ سنگھ کی تجویز پر ''فسانہ آزاد'' رکھا گیا۔

۹۔کردار معاشرتی ناول:۔ کردار معاشرتی ناول بھی ناول کے اقسام میں سے ایک ہے۔اس قسم کے ناولوں میں کردار اور معاشرت یعنی دونوں کی خصوصیات ملتی ہیں۔اُردو میں اس طرح کے ناولوں کا موضوع فرد اور سماج ہوتا ہے۔ان میں ایک طرف کرداری ناول کے اصول پر کردار کے تمام اوصاف بیان کیے جاتے ہیں تو دوسری طرف ان کرداروں کے ذریعے سماج اور معاشرت کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ایسے ناولوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ کرداروں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ کسی ملک یا زمانے کے معاشی حالات کی تصویر کشی کی جائے۔اگر ہم موضوع کے اعتبار سے اس قسم کے ناولوں کو دیکھیں تو ان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔اس لئے ان کا پلاٹ اتنا مضبوط نہیں ہوتا بلکہ وہ ڈھیلا ڈھالا نظر آتا ہے۔ان میں ربط وتسلسل کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ ان میں مختلف قسم کے واقعات اور کردار کے اوصاف کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔

کردار معاشرتی ناول کی مثال بھی سرشار کے ناول فسانہ آزاد میں ہی ملتی ہے۔اس کا قصہ بہت ہی مختصر ہے۔ناول کا ہیرو ''آزاد'' ایک آوارہ گرد ہوتا ہے جو حسن آرا پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس سے شادی کرتا ہے۔ناول کا قصہ مختصر ہی سہی لیکن آزاد کی وجہ سے اس کا دائرہ عمل وسیع ہو جاتا ہے۔سرشار نے آزاد کے ذریعے لکھنئو کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔اس ناول کا پلاٹ بھی کردار معاشرتی ناول کی طرح ڈھیلا ڈھالا ہے۔فسانہ آزاد میں واقعات کا کوئی ربط وتسلسل نہیں ہے بلکہ کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے،مختلف واقعات بے ترتیب بیان کئے گئے ہیں اور بہت سارے نئے کردار سامنے لائے گئے ہیں۔اس ناول میں بھی

سرشار نے تقریباً تین ہزار سے زیادہ کردار پیش کئے ہیں جس میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں مثلاً ہر سن وسال،صنف،تہذیب وتمدن، مذہب اور پیشوں وغیرہ سے، ہر کردار رنگ وروپ اور بول چال میں دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ تمام کردار اپنے اپنے طبقے کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور شروع سے لے کر آخر تک یکساں نظر آتے ہیں۔ یہ کردار بالکل سادہ ہیں جو صرف اپنی زندگی کا ایک ہی رخ پیش کرتے ہیں۔ سرشار نے فسانہ آزاد کے ذریعے لکھنوی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مختلف لوگوں کے علاوہ ان کی نفسیاتی کشمکش کو دکھانے کی بہترین سعی کی ہے۔

۱۰۔جاسوسی ناول:۔ ناول کا ایک قسم جاسوسی ناول ہے۔اس میں بھی واقعاتی،نفسیاتی اور معاشرتی ناولوں کی سی خصوصیات ملتی ہے۔لیکن جاسوسی ناول میں مواد کو پیش کیا جاتا ہے اور اس مواد کو پیش کرنے کے لئے ایسی ٹیکنیک استعمال کی جاتی ہے جو جرم اور مجرم سے شروع ہوتی ہے اور جزا وسزا پر ختم ہوتی ہے۔اس میں جرم و مجرم کی نفسیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جاسوسی ناول میں زمان ومکان کی کوئی قید نہیں ہوتی اور اس میں تقریباً ہر ناول کا انجام ہموار ہوتا ہے۔اس میں قصہ خاص اہمیت نہیں رکھتا بلکہ ایک ناول نگار اس میں مختلف قسم کے واقعات اور کرداروں کو لیتا ہے جن کے بارے میں پہلے کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا لیکن آخر میں وہ معلومات ہمیں ڈرامائی انداز میں مل جاتی ہے۔اس قسم کے ناول،قاری کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

جاسوسی ناول کی مثال ہمیں ارشاد بنی کی تصنیف میں ملتی ہے۔ان کا ناول ''حامد اور دل بہار'' ہے۔ یہ ایک مختصر ناول ہے۔اس میں ایک قتل کی کہانی ہے جس میں قاتل نے ایک خزانہ کا راز جاننے کے لئے مقتول کو مار دیا۔اس ناول میں ایک قتل کا سراغ ڈھونڈھنے کے لئے جاسوس عمرو عیار کو مقرر کیا جاتا ہے اور آخر میں قاتل گرفتار ہوتا ہے پھر گرفتاری کے بعد اس کو سزا ملتی ہے۔

۱۱۔تہذیبی وثقافتی:۔ جب سے اردو ناول کی تشکیل ہوئی ہے تب سے ناول میں تہذیبی شعور موجود ہے۔اردو کے پہلے ناول نگار ''ڈپٹی نذیر احمد'' کے تمام ناول اس خاص عہد کے ترجمان ہیں۔نذیر احمد نے سبھی ناولوں میں اس دور کی تہذیب کو دکھایا ہے۔اردو کے اہم ناول نگار 'مرزا ہاری رسوا' ہیں اور ان کا اہم ناول ''امراؤ جان ادا'' ایسا ناول ہے جو لکھنوی تہذیب وثقافت کو پیش کرتا ہے۔اس ناول کے ذریعے بھی ہمیں اس زمانے کی

تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔اس میں ''مرزا ہادی رسوا'' نے ایک طوائف کی زبانی اس زمانے کی تہذیب وثقافت کو پیش کیا ہے۔

رسوا نے اس ناول میں لکھنو کی پوری معاشرت کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر یوسف سرمست نے اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' میں لکھا ہے کہ رسوا نے ''ذات شریف'' کے دیباچہ میں اس بات کا اظہار ہر جگہ کیا ہے۔''ذات شریف'' کا موضوع لکھنو کا زوال ہے اور یہ ناول اس کی تفصیل ہے۔

''واقعات کے سمجھانے کے لئے صرف موجودہ حالت کا ذکر بے
موقع نہیں گویا کہ یہ چند کلمے اس بے سروپا افسانے کی طلسم کی کنجی
ہیں۔'' ے

اس لئے ناول ''امراؤ جان ادا'' کا موضوع صرف لکھنوی معاشرت ہے اور نہ ہی صرف طوائف ہے بلکہ اس کا موضوع لکھنو کی معاشرت میں گھری ہوئی طوائف ہے یعنی ایک طرف طوائف ہے تو دوسری طرف پورے لکھنوی معاشرے کا ماحول۔

۱۲۔حقیقت و مثالیت پسند ناول:۔ حقیقت پسند ناول بھی ناول کی ایک قسم ہے۔اس قسم کے ناول ہمیشہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔حقیقت وہ ہے، جسے عقل تسلیم کرے یعنی ایسی بات جسے عقل مان جائے۔ایسے ناولوں میں جب ناول نگار ایسی حقیقت کو پیش کرے تو حقیقت نگاری کہلاتی ہے۔حقیقت پسند ناول کی بہترین مثال ہمیں پریم چند کی تخلیقات میں ملتی ہیں۔انہوں نے اپنی تخلیقات میں اس حقیقت نگاری کو اپنایا ہے۔''گئودان'' پریم چند کا شاہکار ناول ہے۔اس میں پریم چند نے 'ہوری' کے کردار کے ذریعے ہندوستانی کسانوں کی حقیقی زندگی کو پیش کیا ہے۔

''گئودن' ہندوستانی کسانوں کی بے کسی اور کسمپری کی کہانی ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کا مرقع ہے۔اس ناول میں شہر اور دیہات دونوں کی کامیاب تصویر کشی نظر آتی ہے۔لیکن خاص طور پر دیہاتی زندگی پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور محنت کش کسان کو مرکزی کردار بنایا گیا ہے یعنی اس کا مرکزی کردار ہوری ہے۔پریم

چند نے ہوری کے ذریعے ہندوستانی کسانوں کی حقیقتی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہوری اوران کے باقی ساتھی زمیندار ہرظلم و جبر کو سہتے ہیں، ہر مصیبت کو جھیلتے ہیں، لیکن اس ظلم کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی احتجاج کر سکتا ہے۔ دراصل پریم چند کے ذاتی اور شخصی حالات نے بھی محنت کش طبقہ سے وابستہ کر دیا تھا اسی وجہ سے وہ پورے طور پر ان کے غم اور مصیبت کو سمجھنے لگے۔ اس بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری
مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریکِ غم بنا دیا۔ اس
سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے۔'' ۸

اس ناول میں پریم چند کا ہندوستانی سماج کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے وہ پوری طرح نمایاں ہے۔ انہوں نے ہر منظر کی کامیاب اور مکمل تصویر کشی کی ہے۔ چونکہ انہیں شہر اور دیہات دونوں کی زندگی سے گہری واقفیت رہی ہے اور ہندوستانی زندگی کے سیاسی، سماجی اور معاشی وغیرہ غرض ہر گوشے کی ترجمانی بہترین انداز میں کی ہے۔ ادب میں زندگی کو اس طرح پیش کرنے کے بجائے جیسی کہ وہ ہے اس طرح پیش کرنا جیسے کہ اس سے ہونا چاہئے..........مثالیت پسندی کہلاتی ہے۔

۱۳۔سوانح ناول:۔ سوانح ناول، ناول کی ایک قسم ہے جس میں کسی کی آپ بیتی ہوتی ہے۔ اس ناول میں اس شخص کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جو اپنی داستان خود بیان کرتا ہے۔ سوانح ناول دو طرح کے ہیں ایک خودنوشت (Autobiography) اور دوسری سرگزشت (Biography)۔ سرگزشت کسی کی بھی ہم لکھ سکتے ہیں لیکن خودنوشت میں ناول نگار صرف اپنی سوانح لکھ سکتا ہے۔ سوانح ناول میں ناول نگار کی توجہ کا مرکز ایک ہی کردار یا شخص ہوتا ہے۔ سوانح ناول کی مثال ہمیں کرشن چندر کے ناول ''میری یادوں کے چنار'' میں ملتی ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ کرشن چندر کا خودسوانحی ناول ہے۔ اس ناول کی فضا کشمیر کے گاؤں کی پرسکون اور سادہ زندگی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شمالی ہند میں پاکستان کی آواز گونجنے لگی تھی اور صدیوں سے جو ہندو، مسلم اور سکھ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے اور اب وہ ایک دوسرے کو شک کی

نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔لیکن ناول نگار نے اپنے والد کی انسان دوستی کو دکھانے کی کوشش کی ہے اور کہا کہ معاشرے میں ابھی بھی ایسے انسان دوست لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے جو وقت پڑنے پر مسلمانوں کی جان بچا لیتے ہیں اور محبت کرنے والوں کو ملانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔اسی لئے ایک برہمن ہوتے ہوئے بھی خود ان کا بیٹا ایک پسماندہ ذات کی لڑکی کے ساتھ کھیلتا ہے اور کھیلنے کے ساتھ ساتھ کھاتا بھی ہے۔

یہ ناول کرشن چندر کے بچپن کی یادوں پر مبنی ہے۔انہوں نے اپنے بچپن کی ان یادوں کے ذریعے اس علاقے میں دیسی راجاؤں کے ظلم و جبر اور وہاں پر موجودہ طبقاتی کشمکش کو دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں جن لوگوں کو ہم نیچی نظر سے دیکھتے ہیں یا بے عزت کہتے ہیں وہ دراصل کتنے ایماندار، وفادار اور محنتی ہوتے ہیں اور ان لوگوں کو اس جاگیردارانہ نظام میں زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھنے سے روک دیا جاتا ہے۔لیکن ان لوگوں کا جو المیہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ ظالم کے سامنے اپنا سر جھکاتے ہیں اور ان کے سامنے اپنی مفلسی اور پسماندگی کو استحصال کے بجائے اپنا مقدر سمجھتے ہیں۔

''میری یادوں کے چنار'' میں جہاں ناول نگار نے جاگیردارانہ نظام میں مقامی راجاؤں اور ان کے ظلم و جبر اور استحصال کو دکھایا ہے وہیں غریب و معصوم اور نچلے طبقے کے لوگوں کی انسان دوستی، نیک نفسی، ایمانداری اور وفاداری کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

اس ناول کا ایک کردار بہادر خاں ہے جو مقامی اسکول کا ہیڈ ماسٹر اور مسلم لیگ کا حامی ہے۔ بہادر خاں کے لیگی خیالات کو ڈاکٹر صاحب ناپسند کرتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود بھی وہ اس کا علاج کرتے ہیں اور راجہ سے اس کی جان بچاتے ہیں۔اس کے بعد راجہ کا قہر ڈاکٹر صاحب پر نازل ہوتا ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو ریاست چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ڈاکٹر صاحب مصنف کے والد ہیں۔انہوں نے اس ناول میں اپنے والد کے ذریعے انسان دوستی اور نیک نفسی کو دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اس ناول میں یہ دکھانے کی بھی کوشش کی ہے کہ مقامی راجاؤں نے کس طرح انگریزوں کے ساتھ مل کر محنت کش اور آزاد پسند لوگوں کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہ سبھی کچھ کرشن چندر نے اس ناول میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

(حواشی)

۱۔ڈاکٹراحسن فاروقی ،ڈاکٹرسیدنورالحسن ہاشمی ،ناول کیا ہے،ایجوکیشنل پبلشینگ ہاوس، ص۔۱۷

۲۔ڈاکٹراحسن فاروقی۔اردوناول کی تنقیدی تاریخ،عثمانیہ بک ڈپو ص۔۲۰۳

۳۔ڈاکٹریوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردوناول،ایجوکیشنل پبلشینگ ہاوس علی گڑھ ص۔۳۱۴

۴۔ڈاکٹریوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردوناول،ایجوکیشنل پبلشینگ ہاوس علی گڑھ ص۔۳۱۴

۵۔ڈاکٹریوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردوناول،ایجوکیشنل پبلشینگ ہاوس علی گڑھ ص۔۴۱

۶۔ڈاکٹریوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردوناول،ایجوکیشنل پبلشینگ ہاوس علی گڑھ ص۔۴۱

۷۔ڈاکٹریوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردوناول،ایجوکیشنل پبلشینگ ہاوس علی گڑھ ص۔۸۹

۸۔ڈاکٹریوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردوناول،ایجوکیشنل پبلشینگ ہاوس علی گڑھ ص۔۱۸۹

مشرف عالم ذوقی کی ادبی خدمات

۳.۱۔ بحیثیت افسانہ نگار

ذوقی ایک زود نویس قلم کار ہیں۔ انہوں نے ادب کے ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے اگر چہ مضامین ،تنقید یا شاعری پر بھی اپنا زورِ قلم آزمایا ہے لیکن ان کا اصل میدان فکشن ہے۔ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں پہلی کہانی بچوں کے لئے لکھی اور تیرہ سال کی عمر میں پہلا افسانہ ''رشتوں کی صلیب'' لکھا۔ سب سے پہلا افسانہ ''جلتے بجھتے دیپ'' تھا جو انہوں نے ریڈیو کے لئے لکھا تھا۔لیکن پہلا افسانہ جو اشاعت کی منزلوں سے گزرا، وہ رشتوں کی صلیب ہے۔ یہ 'کہکشاں' ممبئی میں شائع ہوا۔ لکھنے کی ابتداء بچپن سے ہی ہو چکی تھی۔اردو کا طالب علم نہ ہونے کے باوجود انہوں نے داستانوں اور کہانیوں کی آغوش میں ہی آنکھیں کھولیں۔

مشرف عالم ذوقی کو اردو افسانے میں کافی شہرت ملی ہے۔انہیں ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو فکشن میں بلند مقام حاصل ہے۔اردو افسانے کی دنیا میں ذوقی کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔اب تک ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔''بھوکا ایتھوپیا''، ''منڈی''، ''صدی کو الوداع کہتے ہوئے''، ''غلام بخش''، ''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے'' ، ''نفرت کے دنوں میں'' وغیرہ۔مشرف عالم ذوقی اپنے پہلے افسانوی مجموعے ''بھوکا ایتھوپیا'' میں لکھتے ہیں:

> ''دوست پوچھتے ہیں۔۔۔۔۔۔اتنا زیادہ کیوں لکھتے ہو؟ سوچتا ہوں انہیں کیا جواب دوں! کبھی کبھی کسی نظریاتی تبدیلی کا خواہاں ہے، میرے اندر کا تخلیق کار۔۔۔۔۔کچھ نیا چاہتا ہے اور اس کے لئے بھٹکتا رہتا ہے۔اس نظریاتی تبدیلی سے زندگی کے کتنے ہی موڑ پر لکھنے کے زاویے بدلے، اس طرف چلو۔نہیں اس طرف۔''نیلام گھر'' بھی ۔ایک پڑاو تھا۔''عقاب کی آنکھیں'' بھی۔''شہر چپ ہے'' بھی لمحہ آئندہ بھی۔ یہ ناول بھی

۸۰ سے پہلے کے ہیں۔اور کسی نئے نظریاتی تصور کو الگ الگ ان
میں بھی آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔میں ابھی ٹھہرا نہیں
ہوں۔بھٹکنے کی حالت میں ہوں۔سوچتا ہوں، چھوٹی چھوٹی
حقیقتیں زندگی کا روپ کیوں نہیں لے سکتیں۔۔۔۔۔۔؟ پھر کوئی
بہت عام سا واقعہ کہانی کیوں نہیں ہوسکتا؟ کوئی کہانی مجھے پسند
آتی ہے تو دوست پوچھتے ہیں یہ کیا لکھ دیا؟ کیسے کہوں کہ یہ کیوں
لکھا۔''چیخوف'' کا کردار اگر اپنے چھینکنے پر شرمندہ ہوسکتا ہو اور
چھینک اس وقت کے پورے روسی نظام کو لے کر زبردست کہانی
بن سکتی ہے۔تو پھر عام زندگی میں ہونے والا بہت ہی عام سا
واقعہ کہانی کیوں نہیں بن سکتا؟'' [1]

مشرف عالم ذوقی ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے شاید سب سے زیادہ کہانیاں لکھی ہیں۔ان کی کہانیاں تیرہ (۱۳) سے بیس (۲۰) سال کے عرصے تک اس وقت کے تمام مشہور رسائل و جرائد مثلاً شمع، روبی، بیسوی صدی، محل، شادمان، فلمی ستارے، باجی، بانو وغیرہ میں شائع ہوتی تھے۔اور ساتھ ہی ساتھ اس وقت جو ادبی رسائل نکل رہے تھے ان کی کہانیاں وہاں بھی جگہ پا رہی تھیں۔اقتباس

ذوقی اپنی کہانیوں میں ایک ہی اسلوب اور تکنیک پر اکتفا نہیں
کرتے بلکہ ان کی ہر ایک کہانی نئے اسلوب اور تکنیک کے ساتھ
قاری کے سامنے منظر عام پر آئی ہے۔انہوں نے ۱۹۸۵ء سے
پہلے جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں ذوقی کے جزبات اور احساسات
صاف نظر آتے ہیں۔اس دور کی ۵۰ سے زائد کہانیوں میں یہی
احساساتی اور جزباتی لہریں حاوی ہے۔اس دور کی کہانیوں میں
ان کا گھر، بیوی، بچے اور خاص کر کے ان کا شہر آرہ موجود
ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں گاؤں کے قدرتی
مناظر نظر آتے ہیں جن میں انہوں نے اپنے گاؤں کے قدرتی

مناظر کی عکاسی بہترین انداز میں کی ہے۔ ۲؎

ذوقی افسانوں میں وحشت کا بائیسواں سال، پچتالیس سال کا سفرنامہ، مجھے موسم بننے سے روک لو پلیز، اللہ ایک ہے، پاک اور بے عیب ہے، لاش گھر، سرمن از نالہ من دور نیست، گمان آباد ہستی میں، سات کمروں والا مکان، وغیرہ میں ایک حساس دل رکھنے والے انسان نظر آتے ہیں۔ اور اس حساس دل میں ان دیکھے جذبوں کا ڈیرا تھا۔ ذوقی کو یہ جذبات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے پریشان کرتے تھے۔ زندگی اور موت کے فلسفوں پر ان کی آنکھیں بھر آتی تھیں، لوگ گم کیوں اور کیسے ہوجاتے ہیں، زندگیاں کیسے اور کتنے خانوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں۔ اس کے بارے میں ذوقی لکھتے ہیں:

''۸۰ کے آس پاس کا زمانہ ۔۔۔۔۔رات کا کوئی پچھلا پہر۔۔۔۔۔۔لائٹ نہیں ہے۔ لالٹین کا شیشہ کالا پڑ چکا ہے میں لحہ آئندہ لکھ رہا ہوں۔ اور اچانک میں زور سے چیختا ہوں۔ 'مجھے۔۔۔۔کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے' لاش گھر، اللہ ایک ہے۔۔۔۔۔۔کہانیاں ان کہانیوں میں سے ہیں، جن میں، میں نے اپنی اس وقت کی کیفیت کا پورا پورا اظہار کیا ہے۔'' ۳؎

مشرف عالم ذوقی کا مطالعہ وسیع ہے۔ انہوں نے دنیا کی مختلف تہذیبوں، نئی ایجادات، جدید ہندوستان کے بنتے بگڑتے چہرے، سماج کے بدنما، کریہہ اور سفاک حادثات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہیں۔ ذوقی کی کہانیوں میں تاریخ و فلسفے کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ایک طرف تہذیبی کشمکش ملتی ہے تو دوسری طرف وہ مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے میڈیکل سائنس، تہذیبی ارتقاء، نئی ٹکنالوجی اور تیزی سے بدلتی ہوئی ساخت کو بھی اپنا پسندیدہ موضوع بنایا ہے۔ اپنی کہانیوں کے بارے میں ذوقی لکھتے ہیں۔

''میری کہانیوں کے کئی چہرے رہے۔ ایک چہرہ جس میں میرا شہر زندہ رہا، ایک چہرہ جہاں جدید تر ہونے کی بھول بھلیوں میں،

میں نے آڑی ترچھی تجریدی کہانیاں بھی
لکھیں۔۔۔۔۔۔۔۔میں نے باوضو ہوکر'' اساطیر'' کےبطن
سے بھی کہانیاں چرائیں۔ پھرایک نیا چہرہ میری کہانیوں میں
جما۔یعنی میں ترقی پسندی کی گھردری، دھوپ کی تمازت سے
جلتی شاہراہ پر چلتا گیا۔'' ۱۲

ذوقی اپنے افسانوں میں موضوعات کا انتخاب کرتے وقت بہت ہی حساس ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف سیاست اور سماج کے ان پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ان کی آنکھیں دور دور تک مستقبل کے ان مناظر کو دیکھتی ہیں جو عام فنکاروں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ وہ ہمیشہ نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں۔اس دوران ذوقی کے دل ودماغ میں سارے واقعات اس طرح سما جاتے ہیں کہ وہ تمام واقعات کو پوری جزئیات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ذوقی نے سماج اور سیاست کے کڑوے سچ،ظلم وجبراوراستحصال،نسل کشی اور سماجی کرب وغیرہ جیسےعنوانات کواپنے افسانوں کامحور بنایا ہے۔

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۵ء تک کی کہانیوں میں ترقی پسند رنگ غالب نظر آتا ہے۔بھوکا ایتھوپیا،بچھو گھاٹی،مرگ نینی نے کہا، میں ہارانہیں ہوں کامریڈ،ہجرت،مت روسا لگ رام،فنی لینڈ، پربت، مہاندی، تحفظ،تحریکیں، کان بند ہے، جلاوطن، ہندوستانی، دہشت کیوں ہے،سورباڑی،تناؤ وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جن میں تقسیم کا موضوع اپنے عروج پر ہے۔ یہ کہانیاں تقسیم کے بطن سے جنمی تھیں۔اوراس کی وجہ سے یہ ہے کہ ذوقی نے جب ہوش سنبھالا تب سے وہ ہر بوڑھے بزرگ سے غلامی، آزادی اور تقسیم کی داستان سن رہے تھے۔ذوقی کے لئے غلامی ایک اذیت ناک تصور تھا اور آزادی کے بعد سے ہونے والے دنگے اور فسادات نے ان کوتوڑ کے رکھ دیا تھا اوران کا یہی احساس اور درد ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔

''بھوکا ایتھوپیا'' کی تمام کہانیوں میں ذوقی نے اس دور کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اس میں تقریباً ۲۳ کہانیاں شامل تھیں۔اس میں زیادہ تر کہانیاں اس دور کے سلگتے مسائل پر مشتمل تھیں۔ ذوقی فرقہ وارانہ فسادات سے بہت زیادہ متاثر تھے اسی لئے اس مجموعہ کی زیادہ کہانیاں اسی فساد کی دین تھیں۔اس عہد کی زیادہ تر کہانیوں میں ذوقی پر ترقی پسند رنگ غالب نظر آتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے دہلی آنے کے بعد جو پہلا افسانہ لکھا وہ ''بچھو گاٹی'' ہے۔ یہ افسانہ انہوں نے ۱۹۸۷ء میں لکھا اور ۱۹۸۹ء میں دوبارہ رسالہ 'آج کل' میں شائع ہوا۔ یہ کہانی ذوقی کی بڑی کہانی ہے۔ اس کی شروعات انہوں نے بڑے دلچسپ انداز سے کی ہے۔ اس افسانے میں ذوقی کی سرگزشت نظر آتی ہے۔ انہوں نے جو سپنے چھوٹے سے شہر آرہ میں دیکھے تھے وہ ہے مخمل وکمخواب کا بستر، ریشم کا تھال، شہزادوں جیسے بچے وغیرہ، وہ ان سپنوں کو ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ سب سے خطرناک ہوتا ہے کسی کے سپنوں کا مر جانا۔ ذوقی اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرے بچے کیسے ہوں گے؟ ویسے ہی نا۔۔۔۔۔ جیسے خوابوں میں نظر آتے ہیں۔ جیسے پریوں کے دیس کے بچے ہوتے ہیں۔ شہزادوں جیسے رنگ برنگ مخمل اور کمخواب کے کپڑوں میں۔۔۔ چھوئی موئی سے، میری بیوی کے سر پر شہزادوں کا سا تاج ہوگا۔ ریشمی ساڑی میں سرتاپا حسن بنی ہوئی۔ لان میں نکلی ہوئی کرسیاں، ایک طرف سوئمنگ پول، ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے نوکر چاکر، میٹھی کھنکتی ہوئی آواز کا سحر، کسی ایئر کنڈیشنڈ آفس میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا میں، تھری پیس سوٹ، کپڑے پر ایک بھی شکن نہیں۔'' ۵

ذوقی کی یہ کہانی ایک ایسی کہانی ہے جس کو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ کیونکہ ذوقی اس وقت خود کو بدلا بدلا سا محسوس کر رہے تھے۔ اس بات کا ذکر وہ اپنی کتاب ''سلسلہ روز وشب'' میں کرتے ہیں:

> ''یہ کہانی میرے ادبی کیریئر کے لئے میل کا پتھر ثابت ہوئی۔ ادبی حلقوں میں اسے کافی پسند کیا گیا۔ میرے لئے اہم بات یہ تھی کہ میں اپنے آپ کو بدلا بدلا سا محسوس کرنے لگا تھا۔۔۔ آئیڈیالوجی کی سطح پر بھی۔ ۸۰ کے آس پاس جس جدیدیت نے میرے اندر شتر مرغ کی طرح خاموش سے اپنی گردن نکالی تھی، ایک بار پھر کسی آنے والی آندھی کے زیر اثر دوبارہ اس نے ریت میں چھپا لیا تھا۔'' ۶

مشرف عالم ذوقی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''منڈی'' ہے۔ جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اس طرح دس سال کے وقفے کے بعد یہ مجموعہ منظر عام پر آیا تھا۔ ''بھوکا ایتھوپیا'' اور ''منڈی'' کے درمیان جو وقفہ تھا اس وقفہ نے ذوقی سوچنے اور سمجھنے کا انداز ہی بدل دیا۔ ان کے اندر کافی حد تک نظریاتی بدلاؤ آ چکے تھے۔ اس مجموعے کی شروعاتی دس کہانیاں ہر اعتبار سے ان کے مزاج اور آئیڈیالوجی سے مختلف تھیں۔ اصل واقع کی زیر اکس کاپی، تر لو رشتے یہاں یہاں ٹوٹتے ہیں، ٹیلی فون، مادام ایلیا کو جاننا ضروری نہیں ہے، بھنوری میں ایلیس، مجھے جانوروں سے بھوتوں سے پیار کرنے دو، وغیرہ جیسے افسانوں میں اپنے اسلوب کو بھی بہت حد تک بدل دیا تھا۔ اس افسانوی مجموعے (منڈی) میں ذوقی کے احساسات و جذبات کی زیریں لہریں حاوی تھیں۔ ذوقی ''منڈی'' میں اپنے نقطہ نظر کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> '' میں نے اپنے بچے کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔
> مسکراہٹ، شرارت، زندگی اور صرف زندگی جس میں خمار ہے،
> نشہ اور تازگی نئی کہانی اسی سے جنمے گی، اسی مسکراہٹ سے نئی کہانی
> کی بغاوت کی کوکھ سے نہیں جنمے گی وہ جنمے گی اسی زندگی سے
> سرشار، بہت ساری خوبصورت غلط فہمیوں اور ایک خاص طرح
> کے بھرم کے ساتھ۔'' ے

''بھوکا ایتھوپیا'' ''منڈی'' اس کے بعد ''غلام بخش''، ''صدی کو الوداع کہتے ہوئے'' اور ''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے'' تک ذوقی نے اپنی فکر و فن کے لحاظ سے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ذوقی کا تیسرا مجموعہ ''غلام بخش'' جو ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے افسانے منڈی میں جہاں احساس کی زیریں لہریں حاوی تھیں وہیں ''غلام بخش'' میں کردار اور واقعات پر زور دیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں گیارہ کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کا موضوع تقسیم ہند ہے۔ ان کہانیوں میں تقسیم ہند کے بعد عوام کی بدحالی اور ان پر گزرنے والے واقعات کے ذریعہ انسان کے وجود کے اندر ذوقی نے جھانکنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

''غلام بخش'' ایک ایسا کردار ہے جن کے والد تقسیم ہند میں مارے جاتے ہیں اور غلام بخش پاگل ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اس کو نہیں معلوم کہ بھائی بھاوج اس کو لے کر کہاں

جا رہے ہیں۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ان کا دل پاکستان میں نہیں لگتا اور وہ ایک دن خاموشی سے ہندوستان آجاتا ہے۔مگر یہاں جو ان کا مکان تھا اس پر کسی اور نے قبضہ کر رکھا تھا۔حالانکہ وہ مکان ان کے نام پر نہیں تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس کو مکان کے لئے کافی جدو جہد کرنی پڑی۔ذوقی نے غلام بخش کے کردار کے ذریعے اس مکان کی ایک عجیب وغریب کشمکش کو دکھایا ہے۔

غلام بخش کو جب مکان نہیں ملتا تو وہ مکان نہ ملنے پر اسی مکان کے سامنے اپنی جان دے دیتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' نے دی تھی۔اصل میں غلام بخش کے جان دینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ ہندوستان میرا ملک ہے۔اور یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اسی ہندوستان کے لئے میں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا۔ذوقی نے غلام بخش کو جان بوجھ کر منٹو کی کہانی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے نام سے منسوب کیا۔کیونکہ یہ صرف غلام بخش کی ہی کہانی نہیں ہے بلکہ اس میں پورے ہندوستانی مسلمانوں کا درد شامل ہے۔

ذوقی نے اپنی افسانہ نگاری میں آج کے زمانے کی ترقی اور سائنس کی ایجادات کا خوشی کے ساتھ بانہیں پھیلا کر استقبال کیا ہے مگر یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی ہے کہ کس طرح ترقی یافتہ اور سائنسی دور کی وجہ سے سماج میں برائیاں جنم لے رہی ہیں۔اس کے بارے میں وہ اپنے ایک افسانے میں لکھتے ہیں:

> ''نیلام مبر کی نو دولتیہ لوگوں سے دوستی تھی۔وہ ان سے مل کر آتا تو کافی نئی نئی معلومات فراہم کرتا۔جیسے۔۔۔۔۔مصر کی سیر کرنا چاہئے،دریائے نیل میں کشتی بانی،جبل سینا پر چڑھائی اسی سے معلوم ہوا کہ 'ہوانا' سگار پینے کا ایک الگ ہی مزا ہے۔'کوہبا' رومیو جولیٹ،بولیوا اینڈ پنچ جیسے برانڈ پیتے ہوئے کوئی بھی رئیس آپ کی طرف متوجہ ہوسکتا ہے۔۔۔جیسے نیویارک میں 'بالتھ زار' میں لنچ یا ڈنر کرنا۔۔۔۔۔یعنی نیلامبر کے پاس آئیڈیل کے روپ میں ایک ایسی زندگی تھی جسے دولت کی گھن گرج سے ہی خوبصورت بنایا جاسکتا تھا۔مثلاً برادری میں رعب جمانا ہو تو بچوں کو لیزلس کے ذریعے سوئزرلینڈ کے 'بروپے' میں چلائے جانے

والے شیوروں میں چھٹیاں منانے بھیج دیجئے۔۔۔۔ہو سکے
تو اپنی بیوی کو بھی۔۔۔۔اور یہاں اپنی من پسند چاہنے والی کے
ساتھ کسی بی ایم ڈبلیو یا **Luxes** بہت تیز رفتار ٹارگا کیریئر
پورش یا ایکس ایس فور ایکس اسٹن میں زندگی کے مزے
لیجئے۔'' ۸

ذوقی نے اس اقتباس میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کس تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ لوگ کس طرح اپنی دولت کا رعب جماتے ہیں اور دولت کی حرس و ہوس شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کی زندگی میں نئے مردوں اور عورتوں کا آنا ترقی کے نام پر بے لباسی اور روایت پسندی کہہ کر پہلے سے ہی کامیابی کے راستے پر چل نکلنا، جہاں خود انسان کے اپنے ہی گھر میں عورتیں اور بچے محفوظ نہیں ہیں اور اس کے علاوہ گھر کے بزرگوں کو بیکار چیز سمجھ کر گھر کے کسی الگ حصّے میں ڈال دینا وغیرہ۔

مشرف عالم ذوقی کی افسانہ نگاری کے بارے میں آفاق عالم صدیقی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مشرف عالم ذوقی اپنے انداز کے سب سے توانا اور منفرد
افسانہ نگار ہیں۔تہذیب کی ہر نئی کروٹ اور تیز رفتار زندگی
سے پیدا ہونے والے ہر مسلئہ پر عموماً ذوقی کی نظر سب سے پہلے
پڑئی ہے۔وہ آج کی زندگی کے ایسے سفاک افسانہ نگار ہیں جو
تمام معنوعیت کو جھیلنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔وہ سنگین
سے سنگین ترین مسائل اور پیچیدہ صورت حال پر اتنی خوبصورتی
سے افسانے کا محل کھڑا کر دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی
ہے۔۔۔۔۔'' ۹

ذوقی کی کہانیوں میں ایک طرف سیاسی اور سماجی پہلو نظر آتا ہے تو دوسری طرف تاریخ کی گونج سنائی دیتی ہے۔جو دھیرے دھیرے ان کہانیوں میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ذوقی نے زندگی کے کسی بھی موڑ پر سمجھوتہ

نہیں کیا چاہے وہ مسئلہ موضوع کا ہو، اسلوب کا ہو، تکنیک کا ہو یا پھر تحریکات و رجحانات وغیرہ سے متعلق ہو۔ ان کے مزاج کو جو پسند آیا اسے اپنا لیا، جی میں آیا تو ترقی پسندی سے وابستہ ہوئے، ارادہ ہوا تو چند علامتی اور تجریدی کہانیاں لکھ ڈالیں اور پھر جب احساس ہوا تو حقیقت نگاری کی طرف راغب ہوئے لیکن موقع پسند نہیں بنے اور اپنے قلم کی آزادی کو ہمیشہ اولیت دی۔

۲.۳۔(بحیثیت شاعر)

مشرف عالم ذوقی نے ادبی زندگی کی شروعات شاعری سے کی ہے،انہیں بچپن سے ہی شعر پڑھنا اور گنگنانا پسند تھا۔وہ اکثر میرؔ، غالبؔ، اقبال اور ذوق کے شعر گنگنایا کرتے تھے۔شروع شروع میں انہیں شاعری سے بے حد محبت اور لگاؤ تھا۔ذوقؔ کو کافی پسند کرتے تھے اور پھر ذوقؔ سے اسی لگاؤ نے مشرف عالم کو ذوقی بنا دیا۔ذوقی کا گھر ایک کوٹھی کی طرح تھا جس میں اکثر و بیشتر مشاعرے ہوا کرتے تھے، یہ گھر کا ہی ماحول تھا جس نے ذوقی کو شاعری کی طرف راغب کیا۔جس کی وجہ سے ذوقی کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق ہو گیا۔وہ اپنی شاعری کے شوق کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' ادب کی شروعات شاعری سے ہوئی۔۔۔آج بھی اقبالؔ، غالبؔ، مومنؔ، جگرؔ، فیضؔ فراقؔ ، کی شاعری میرے مطالعے میں رہتی ہے۔۔۔۔۔۔میں اچھی شاعری کا عاشق ہوں۔۔۔۔۔شروعات شاعری سے ہوئی۔۔۔لیکن مجھے جلد ہی اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں یا ادب کو دینا چاہتا ہوں اس کے لئے مجھے شاعری سے الگ کا میدان منتخب کرنا ہوگا۔۔۔۔۔اس لئے میں فکشن یا ناول کی دنیا میں آ گیا۔۔۔لیکن آج بھی میں اچھی شاعری کا عاشق ہوں۔۔۔خصوصی طور پر ن۔م۔راشدؔ اور فیضؔ کی نظمیں مجھے بے حد پسند ہیں۔'' [۱۰]

مشرف عالم ذوقی نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں کافی عمدہ نظمیں لکھیں، گو کہ ان دنوں نثری نظموں کا اتنا زیادہ چرچا نہیں تھا، اس لئے ذوقی نے زیادہ تر پابند اور آزاد نظمیں لکھیں۔ان کی اس نظم سے ان کے شاعرانہ مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے:

''بہت عرصہ ہوا

باسٹھ کی اک ویران سی شب میں

مری ماں نے میری تخلیق کی تھی

مجھے بے آب ریگستان میں چلنا سکھایا

مرے ہونٹوں کے گونگے پن کو پھر الفاظ بخشے

مری آنکھوں کے دریا میں جہانِ ہفت رنگ رکھ کر

مری خواہش کو وسعت دی

مرے ہاتھوں کو چوما

کانپتی ننھی ہتھیلی کو عبادت دی

مرے پیروں میں گھنگرو باندھ کر بولی

چلو ناچو!

جہاں کا رقص دیکھو

رقص کی نیرنگیاں دیکھو

ایک اور بند اس طرح سے ہے:

مرے بچے!

تری امّی نہیں ہیں رابعہ بصری ہیں حاضر کی

وہ اک نافع کی مانند ہیں نگہہ میں مردِ ناظر کی

تری امّی کے قدموں میں

تری اپنی ہی جنت میں

تو اس جنت سے گم ہو کر

نظام دو جہاں ہو جا

چراغِ بوستاں ہو جا

قرآن کا ترجمان ہو جا

فغاں درویش کی گونجی تو پھر غیبی صدا آئی

سن اے روح الامیں

روحِ فزا

تو اس چھوٹے سے بچے میں

قرآن کے تیس پاروں کا بیاں رکھ دے

مرے اس پیارے بندے میں محمدؐ کا نشاں رکھ دے''

ذوقی نے یوں تو بہت سی نظمیں تخلیق کی ہیں لیکن ان کی جو نظم شہرت کا باعث بنی وہ ''لپروسی کیمپ'' ہے۔ ''لپروسی کیمپ'' ان کی ایک طویل نثری نظم ہے۔ اس نظم کے بارے میں ذوقی لکھتے ہیں:

''لپروسی کیمپ''۔۔۔۔۔ مجھے یاد نہیں، میں ان کی طرف کب متوجہ ہوا۔ یہ میرا بچپن تھا۔ محلّہ ماہ دیو۔ پتھریلی سڑکیں۔ ان سڑکوں پر آباد، سو سال سے بھی زیادہ قدیم ہمارا آبائی مکان، جس کی بے آب ہوتی محرابیں، رنگ وروغن سے محروم دیوار و در برس اور صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ داستانی رنگ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ تو یہی داستانی حویلی تھی۔ میں تھا۔ میرا بچپن تھا۔ وہ موسم سرما کی ٹھنڈی صبحیں ہوا کرتی تھیں۔ داستانی حویلی کے باہر کی پتھریلی سڑکیں ابھی انسانی قدموں کی آہٹ سے گونجتی بھی نہیں تھیں کہ 'رنگ والی تھالیوں' کا سنگیت فضاء میں گونج اُٹھتا میں باہر آتا تو ان لپروسیوں کا ایک لمبا قافلہ ہوتا۔ ''Help Me'' کی ٹوپیاں سروں سے چپکی۔۔۔۔ مجھے الجھن ہوتی تھی۔ اماں میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لاتیں۔ دروازہ بند کر دیتیں۔ اور رنگ والی چھوٹی چھوٹی تھالیوں کے شور دیر تک میرے کانوں میں، دہاڑتے، رہتے۔ ان کی آڑھی، ترچھی، ٹیڑھی، سڑی شکلیں

دیر تک میری آنکھوں میں ناچتی رہتیں۔باہر پتھریلی سڑکوں پر
اب وہ بیمار لوگوں کا قافلہ نہیں ہے۔مکان کے اندر میں
ہوں۔مٹی والی زمین ہے۔اور۔۔۔لٹو ناچ رہا ہے۔لٹو پر جوبن
آئے جوبن آئے لٹو پرلٹو کیسے کیسے کھیل دکھائے۔من کو
بھائے۔۔۔۔۔مگر وہی۔۔۔'ٹھٹھے' چرکیدہ ہاتھ۔ Help
me کی ٹوپیاں۔''مدد کرو'' کے سائن بورڈ اماں۔اماں!
میرے آنکھوں کے سارے ساون سوکھ گئے۔ان آنکھوں میں
بہتا دریا بستا ہے اور اس بہتے دریا میں ہیں،نفرت کی تصویریں
کچھ۔۔۔۔۔۔آنکھیں بند کرو تو اماں۔تصویریں چھا جاتی
ہیں۔۔۔۔۔۔تصوریں ہی تصویریں ہیں،جو خیالوں میں آتی
ہیں۔۔۔۔۔'' [11]

ذوقی نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت ان کو ایسا لگا کہ اپنے جذبات اور احساسات کو کہانیوں میں اتارنا دشوار ہوگا،اسی لئے انہوں نے اپنے جذبات اور احساسات کو ابھارنے کے لئے نثری نظم کا انتخاب کیا۔ان کو اس بات کا بھی احساس ہوا تھا کہ نثری نظم کے توسط سے اپنی بات قاری تک پہنچانے میں زیادہ آسانی ہوگی۔اصل میں ذوقی نظم میں کچھ کرداروں کو بھی شامل کرنا چاہتے تھےلیکن بعد میں ان کو جلد اس بات کا احساس ہوا کہ اگر نظم میں کرداروں کو شامل کیا جائے گا تو پھر یہ نظم نہیں رہے گی۔ذوقی کا یہ ماننا ہے کہ فکری سطح پر،بہت سی باتیں ایسی ہیں،جن کا اظہار غزلوں میں نہیں ہوسکتا اور اس کے علاوہ کسی کسی کیفیت کو نظم یا آزاد نظم میں سمونا مشکل ہے۔لیکن پھر ایک ادیب ایسے حالات میں نثری نظم کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔بقول ذوقی:

''کچھ کیفیتیں اتنی بے ہنگم اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ آپ ان
کے لئے صنف ڈرامہ کو بھی موزوں نہیں ٹھہرا سکتے۔کچھ خیالات
اتنے پُر پیچ یا آڑے ترچھے ہوتے ہیں کہ ان کو لے کر کہانیاں
نہیں لکھی جاسکتیں یا ناول کا موضوع نہیں بنایا جاسکتا۔زندگی

> مجموعہ سوالات ہے۔ ذہن میں آوارہ خیالوں کے shades چلتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ سارے shades ایسے نہیں ہوتے کہ ہم اُنہیں لکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ ذہن پر جب بھی کوئی خیال نازل ہوتا ہے تو وہ اپنے پورے 'تام جھام'، تکنیک، اسلوب کے ساتھ جنم لیتا ہے اور لاشعور میں ہی یہ طے ہو چکا ہوتا ہے کہ۔۔۔ الف۔۔۔۔ اسے ڈرامہ کے طور پر لکھنا ہے، ب۔۔۔۔ اس کے لئے کہانی موزوں ترین چیز ہے، ج۔۔۔۔ یہ خیال نظم میں درآئے تو بہتر ہے لیکن حقیقتاً کچھ چیزیں سیال کی صورت Prose Poetry کی شکل میں ہی ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔ پھر نثری نظم سے انکار کیوں؟ نثری نظم سے انکار کا، کوئی سا بھی جواز میرے پاس نہیں تھا۔ یہ جو کچھ بھی ہے، میں اسے نثری نظم کہنے پر بضد ہوں۔'' ۱۲

مشرف عالم ذوقی کی نظم ''لپروسی کیمپ'' میں صرف اتنا ہی نہیں کہ شعر اور نثر کی حد ایک دوسرے میں پوشیدہ نظر آتی ہیں بلکہ اس میں اردو اور ہندی نثری نظم کا ایک نئے سرے سے سنگم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظم ڈکشن اور اسلوب کی وجہ سے ہندی میں لکھی جانے والی نظموں سے بے حد قریب ہے۔ اس بارے میں نعمان شوقؔ لکھتے ہیں:

> ''مشرف عالم ذوقی نے اپنی نثری نظموں بالخصوص 'لپروسی کیمپ' کے ذریعہ اردو اور ہندی لہجے کے امتزاج سے ایک نئی بوطیقا ترتیب دینے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ نہایت صداقت اور سادگی کے ساتھ اپنی بات کو قارئین تک پہنچانے میں یقین رکھتے ہیں اور غالباً یہی سبب ہے کہ وہ نظم کی ظاہری حسن کاری پر خاطر خواہ توجہ دینے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔ ''لپروسی کیمپ'' میں نثر کے اجزاء کی بے جا بہتات البتہ

> نظم کی جمالیاتی اثر انگریزی کو محدود کر دیتی ہے۔مشرف عالم ذوقی نے نظم کے خارجی محرکات کا ذکر اپنے پیش لفظ میں کیا ہے اور اس نوع کے موضوع کو برتنے کے لئے ایک سپاٹ اور سرد لہجے کی ضرورت تھی لیکن حالؔی کی شاعری کی طرح ان کی سادگی میں جو خلوص پنہاں ہے اس کا اعتراف نہ کرنا بد دیانتی ہو گی۔'' ۱۳؎

''لپروسی کیمپ'' میں ایک ایسے موضوع کا تصور ابھرتا ہے جو قارئین کو پہلی نظر میں نہایت ہی غیر شاعرانہ اور نفرت انگیز معلوم ہوسکتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو یہاں ذوقی قارئین کو ذہنی اور حسن شناسی کا سامان فراہم نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کے ادبی ایجنڈے میں شامل نہیں ہیں۔

مشرف عالم ذوقی نے کوڑھیوں کے نام پر کچھ اور نظمیں لکھیں ہیں جیسے رنگ برنگے پھول،خوف،وہ مسکرا رہا ہے،محبت،آدمی،عبادت،تمہارے لئے ساون کا ایک گیت وغیرہ۔کوڑھی نامہ کی یہ نظمیں ذوقی نے ۱۹۸۴ء میں لکھی ہیں۔یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک دن ذوقی کو پتہ چلا کہ کوڑھیوں کا ایک قافلہ آرہ، رمنہ میدان کے آس پاس رکا ہوا ہے۔اصل میں یہ دسمبر کی بات ہے۔کیونکہ ان دنوں دسمبر کی ٹھنڈک اپنے عروج پر تھی۔ذوقی کا ایک دلچسپ کام یہ تھا کہ ان آدمیوں کو جی بھر کر دیکھنا۔مثلاً یہ کیسے کھاتے ہیں،کیسے پیتے ہیں،کیسے رہتے ہیں،کیسے جیتے ہیں یا یہ کیسے جینے کی کوشش کرتے ہیں وغیرہ۔اس کے علاوہ ذوقی نے اپنی بیٹی پر بھی چند نظمیں لکھی ہیں جیسے تصویریں تم،تم قبرستان میں نہیں تھی،سوال وغیرہ وغیرہ۔احمد ہمیش نے مشرف عالم ذوقی کے بارے میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:

> ''مشرف عالم ذوقی لا منشا انسانی رشتوں کا تحفظ اور سلامتی ہے،ظاہر ہے یہ منشا تخلیقی ایڈونچر کو پڑھنے والوں پر ثبت کر دیتا ہے'' ۱۴؎

مختصر یہ کہ مشرف عالم ذوقی نے اردو شاعری میں بھی نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ابتداء سے ادب کے مطالعہ کے ذوق و شوق نے انہیں شاعری کی طرف راغب کیا۔گھریلو ماحول خصوصاً والد صاحب سے انسپریشن لیتے رہے اور ان کی حوصلہ افزائی نے ان کے من کو جلا بخشی۔

۳.۳۔بحیثیت تنقید نگار

مشرف عالم ذوقی نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہیں، اگر چہ ان کے توجہ کا مرکز زیادہ تر فکشن رہا ہے لیکن انہوں نے شاعری کے علاوہ تنقید نگاری کے میدان میں بھی اپنے مقدور کے مطابق کام کیا۔تنقید میں اب تک ان کی بہت سی کتابیں سامنے آئی ہیں۔مثلاً بلونت سنگھ کی کہانیاں، اپنا آنگن، سلسلہ روز وشب، اردو ادب، مکالمہ کے سات رنگ، اردو ساہتیہ سمواد کے، ۱۹۸۰ء کے بعد اردو افسانہ، باادب باملاحظہ ہوشیار اور آب روان کبیر وغیرہ۔آب روان کبیر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہیں۔اس میں تقریباً ۲۹ مضامین شامل ہیں۔

مشرف عالم ذوقی نے اس درمیان تقریباً ۴۰۰ سے زائد مضامین لکھے ہیں۔ان میں سے کچھ مضامین وقت کے ساتھ ساتھ ضائع ہوگئے، کچھ کھو گئے، کچھ رسائل و جرائد میں چھپ گئے اور کچھ جو پاس تھے وہ الگ الگ موضوعات کے تحت کتابی شکل میں سامنے آئے۔انہوں نے اردو فکشن اور اردو ناول کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔آب روان کبیر میں وہ مضامین شامل ہیں جو ذوقی نے ۲۴۔۲۵ برسوں کے درمیان لکھے۔

تنقید کے میدان میں ایک قلم کار کو وسیع القلب اور وسیع النظر ہونا چاہے۔تب ہی وہ عدل وانصاف کر سکتا ہے یہ تمام اوصاف ذوقی میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ذوقی ایک حساس ذہن اور دور بین نگاہ رکھتے ہیں۔ان میں اپنے عہد سے آگے دیکھنے کی صلاحیت ہے۔انہوں نے محسوس کیا ہے کہ نہ یہ معاشرہ اسی طرح رہ پائے گا اور نہ ادب۔اس لئے انہوں نے اس کے لئے ایسی مستحکم بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان تبدیلیوں کا ساتھ دے سکے۔ذوقی کی ایک تنقیدی کتاب ''بلونت سنگھ'' کی کہانیاں'' ہے۔جس میں انہوں نے بلونت سنگھ کی کہانیوں اور ان کی ناولوں پر اپنی تنقیدی نظر ڈالی ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے سلسلہ روز وشب میں بلونت سنگھ کے پنجاب کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''حقیقتاً بلونت سنگھ کا پنجاب کوئی معمولی نہیں ہے جیسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ٹالسٹائی دوستوفسکی، گوگول یا پشکن کا روس صرف انہی کا روس نہیں ہے بلکہ بسیط کائنات کی علامت ہے۔بلونت سنگھ کا پنجاب بھی ہندوستان سر زمین کا ایک معمولی خط نہیں ہے، اسے بڑے ہی

دیکھنااورمحسوس کرنا چاہئے۔بلونت سنگھ کے پنجاب اور ان کے
کرداروں کوتاریخ کی رفتار کا،سماجی تبدیلی،ظلم وجبر کی قوتوں سے
نبردآزماعلامت کےطور پردیکھنازیادہ مناسب ہے۔'' ۱۵

ذوقی نے''بلونت سنگھ کا پنجاب'' میں بلونت سنگھ کے دوناولوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ایک'' کالے کوس''اور دوسرا''رات،چانداور چور'' ہیں۔طوالت کے پیش نظر دونوں ناولوں کا بہ نظر غائر مطالعہ ممکن نہیں ہے لہٰذا ایک سرسری جائزے پر اکتفا کیا جائے گا۔'کالے کوس' ناول میں روسی مصنفین کا اثر غالب نظر آتا ہے۔کیونکہ بلونت سنگھ کی کہانیوں اور ناولوں میں روسی مصنفین کا اثر بہت نمایاں اور راست طور پر سامنے آتا ہے۔اس ناول میں بلونت سنگھ جس ادیب سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں وہ''ہیمنگ وے'' ہے۔ناول کی ابتدا محبت کے کھٹے میٹھے تجربوں سے ہوتی ہے۔اس ناول کا سب سے مظبوط کردار صورت سنگھ ہے۔یہ پیشورا سنگھ کا پڑھا لکھا ڈاکٹر لڑکا ہے۔جو ایک لڑکی مہندرا کور سے محبت کرتا ہے۔یہ دونوں مل کر گاؤں میں ایک ڈسپنسری کھولنا چاہتے ہیں۔جس میں وہ اپنے گاؤں والوں کے دکھ سکھ کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔صورت سنگھ ایک انقلابی نوجوان ہے،جو گاؤں میں تعلیم کی نئی روشنی دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

یہ ناول دراصل تین حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ میلا ہے۔یعنی یہ حصہ زندگی سے عبارت ہے۔دوسرا حصہ جھمیلا ہے یعنی دنیا میں آنے کے بعد جو واقعات وحادثات انسان کا مقدر بنتے ہیں یہ وہی جھمیلے ہیں اور تیسرا حصہ ہولا ہے۔یعنی یہ حصہ اپنے دامن میں تقسیم کی آگ کو چھپائے ہے۔یہ وہ دور تھا جب سارے ہندوستان میں نفرت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور ہندو مسلم دونوں ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ان سب کا ذکر بلونت سنگھ نے اس ناول میں بہترین انداز میں کیا ہے۔

''رات،چانداور چور'' کا موضوع بھی کم وبیش وہی ہے جو'کالے کوس' کا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں میلہ جھمیلا تو ہے لیکن ہولا نہیں ہے۔یہ ناول اپنی کمزوریوں کے باوجود اس پنجاب کی عکاسی کرتا ہے جس پنجاب کو بلونت سنگھ نے ایک مسکراتے ہوئے پنجاب کا تصور کیا تھا۔ذوقی بلونت سنگھ کی کہانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ سچ ہے کہ بلونت سنگھ کے افسانوی بیان میں کوئی تہہ داری یا

پیچیدگی نہیں ملے گی۔مگر ان کے کردار ہماری عام زندگی سے

زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔'' ۱۶؎

ذوقی نے بلونت سنگھ کی زبان و بیان، کردار نگاری، جزبات نگاری غرض ہر پہلو پر اپنی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ذوقی کو ہندی ادب کے علاوہ اردو ادب پر بھی عبور حاصل ہے جس نے ان کی تحریروں میں دلکشی پیدا کر دی ہے۔ان کا طرز تحریر سلجھا ہوا ہے اور تنقید میں نہ ابہام ہے اور نہ الجھاؤ۔وہ اپنے تنقیدی مضامین کو وہی زبان دیتے ہیں جو ان کے لئے مناسب ہوتی ہے۔اس کے علاوہ وہ ادب میں نظریہ کی اہمیت کے اعتراف اور فکر و نظر کی پرکھ کے باوجود فنی تقاضوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

ذوقی مغرب اور مشرق، قدیم اور جدید روایت اور بغاوت، مواد اور ہیت کے بارے میں اور ان کے مطالعہ کے سلسلے میں وہ ہمیشہ ایک درمیانی صورت نکال لیتے ہیں۔اعتدال یا توازن پیدا کرنے کی یہ کوشش کبھی کبھی مصنوعی اور مفاہمت پسندانہ معلوم ہوتی ہے۔ان کے تنقیدی مضامین اور تصورات کو سمجھنے کے لئے ان کو دو ادوار میں تقسیم کرنا ہوگا۔ایک ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک کا اور فرقہ وارانہ فسادات کا زمانہ، دوسرا ۱۹۸۰ء سے لے کر آج تک کا زمانہ ہے۔انہوں نے اپنی تنقیدی کتابوں میں ادبی مسائل پر بحث کی ہے۔ان کے تنقیدی مضامین میں نئے ادبی شعور اور سماجی تقاضوں کے ساتھ ساتھ نئی سائنسی ٹیکنالوجی کا احترام بھی ملتا ہے۔ان کی نظر میں تنقید کا مقصد تشریح نہیں۔بلکہ زندگی کے گہرے سے شعور اور ادبی قدروں کی تلاش ہے۔ذوقی روسی ادیبوں سے کافی متاثر نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ان کی روسی زدگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔لیکن جب کبھی وہ جزیات سے کام لیتے ہیں تو صحیح راستے سے نہیں ہٹ جاتے۔انہوں نے اردو ادب میں بعض جدید رجحانات کی حمایت بھی کی ہے جس سے ان کے تمام اصولوں کی نفی ہوتی ہے جن پر انہوں نے بار بار زور دیا ہے۔

ذوقی کے طرز بیان میں جوش و خروش ہے، انہوں نے اردو ادب پر غور کر کے حقیقت حال بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور سمجھایا کہ ہمارے ادیبوں کے پیش نظر کیا چیزیں تھیں۔انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں اردو ادیبوں کے انداز بیان اور جذباتی اسلوب کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

بہر حال ذوقی کا شمار نئی نسل کے مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ان کی تنقید نگاری کا ایک مخصوص طرز ہے۔خیالات میں انتہا پسندی کے بجائے آزادی،اعتدال اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔ان کا انداز بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے۔

(حواشی)

۱۔مشرف عالم ذوقی، پیش لفظ، بھوکا ایتھوپیا۔۔۔۔دہلی ص۔۱۸

۲۔مشرف عالم ذوقی، سلسلہ روز وشب، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان، نئ دہلی ص۔۷۵

۳۔مشرف عالم ذوقی، سلسلہ روز وشب، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان، نئ دہلی ص۔۴۶۳

۴۔مشرف عالم ذوقی، میں اور میری کہانی، افسانہ

۵۔مشرف عالم ذوقی، بچھو گھاٹی، افسانہ

۶۔مشرف عالم ذوقی، سلسلہ روز وشب، قومی کونسل برائے فروغ اُردوزبان، نئ دہلی ص۔۴۷۵

۷۔مشرف عالم ذوقی، منڈی، نئ کہانیاں ص۔۴۷۹

۸۔مشرف عالم ذوقی، صدی کوالوداع کہتے ہوئے، افسانہ

۹۔مشرف عالم ذوقی، سلسلہ روز وشب، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان، نئ دہلی

۱۰۔سمیہ بشیر، ذوقی کی ادبی کائنات، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۴۹

۱۱۔مشرف عالم ذوقی، نظم لپروسی کیمپ، پیش لفظ، ص۔۱۰۔۱۱

۱۲۔مشرف عالم ذوقی، نظم لپروسی کیمپ، پیش لفظ، ص۔۱۴

۱۳۔نعمان شوق، نظم لپروسی کیمپ ص۔۳۰

۱۴۔حمد ہمیش، تاریخ ادب اردو ابتداء سے ۲۰۰۰، جلد سوم وہاب اشرفی ص۔۱۳۷۰

۱۵۔مشرف عالم ذوقی، بلونت سنگھ کی کہانیاں ص۔۷۵

۱۶۔مشرف عالم ذوقی، سلسلہ روز وشب، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان، نئ دہلی ص۔۸۵

(۱)

سماجی موضوعات

ادب سماج کا آئینہ ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ناول نگاری کی ابتدا سے ہی سماج و معاشرے کو ادب کا موضوع بنایا گیا ہے۔ سماج یا معاشرہ چند افراد پر مشتمل ہجوم کا نام نہیں بلکہ یہ معاشرہ اپنی خوبیوں اور کمیوں کی وجہ سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ اچھا ادیب نہ صرف سماج اور معاشرہ کا مصور ہوتا ہے بلکہ اپنے خیالات وافکار سے، اپنے نظریات سے اس دھند کو بھی صاف کرتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ بیمار یا کمزور نظر آتا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد اردو ناول کی دنیا میں بلند مقام رکھنے والوں میں ایک نمایاں نام مشرف عالم ذوقی کا ہے۔ ذوقی کے ناول آج کی سماجی وسیاسی زندگی کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ ومشاہدہ پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ لیکن ان کی شناخت ناول کو لے کر ہے۔ ذوقی کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی خود کو ازم یا نظریئے کے قید میں نہیں رکھا۔ وہ آزادانہ طور پر اپنے لئے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں عام طور پر دو روش صاف دکھائی دیتی ہے۔ ایک روشن مستقبل کے تعلق سے سامنے آتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذوقی اردو زبان وادب کے ایسے ناول نگار ہیں، جو مستقبل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بدلتی ہوئی دنیا اور سائنس وٹکنالوجی پر بھی ذوقی کی گہری نظر ہے۔ مستقبل کے علاوہ ان کے ناولوں میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ حاوی ہے تو وہ سیاسی وسماجی موضوعات ہیں۔

ذوقی جن موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں وہ عام قاری کے لئے نئے اور چونکانے والے ہوتے ہیں۔ فن پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ مکالمے ان کے ناولوں کو سہارا دیتے ہیں۔ ان کے ناولوں کی ایک دنیا تقسیم اور ہجرت پر بھی مبنی ہے۔ یہاں بھی سماجی وسیاسی بصیرت اور آگہی کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذوقی کی تحریروں میں وقت کو سمجھنے کے لئے بلیغ اشارے موجود ہیں۔

'عقاب کی آنکھیں' کے بعد ذوقی باضابطہ طور پر ناولوں کی طرف راغب ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب

ناول لکھے نہیں جا رہے تھے۔ افسانوں کی بارش ضرور ہو رہی تھی۔ اردو ناول کی دنیا قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی شوقت صدیقی، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی جیسے ناول نگاوروں تک سمٹی ہوئی تھی۔ ۱۹۸۰ء کے بعد پیغام آفاقی ،غضنفر اور ذوقی جیسے ادیبوں نے ناول نگاری کی دنیا میں قدم رکھا۔ عبدالصمد، انور خان، علی امام نقوی نے بھی ناول کی دنیا کا استقبال کیا۔ ۱۹۸۰ء تک وقت بہت حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ ادب غلامی، ملک کی تقسیم، ہجرت کے بعد کے مسائل پر غور کر رہا تھا۔ آزادی کے ۳۲ برس گزر گئے تھے۔ ان ۳۲ برسوں میں ہندوستان بہت حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ مشرف عالم ذوقی کے لفظوں میں، ''اب ایک چوتھا موسم ہمارے ساتھ تھا۔ یہ موسم فرقہ وارانہ فساد کا موسم تھا۔ اس وقت ملک کے کئی حصوں میں مسلسل فسادات ہو رہے تھے۔ آزادی کے ۳۲ برس بعد مسلمانوں کے اندر خوف برقرار تھا۔ 'نیلام گھر' کی پیدائش اسی خوف سے ہوئی۔ اس وقت ان کے ذہن میں البیئر کامو کے ناول دی پلیگ کی یاد تازہ تھی۔ وہ یہ کہہ نہیں سکتا کہ نیلام گھر کی تخلیق کرتے ہوئے پلیگ کا خیال ان کے ذہن پر کس قدر حاوی تھا۔'' نیلام گھر سماجی ماحول میں رچا بسا ناول تھا۔ یہ ناول ذوقی نے ۲۰ برس کی عمر میں تخلیق کیا۔ مندرجہ ذیل سطور میں ذوقی کے اہم ناولوں کے سماجی موضوعات کا جائزہ لیا جائے گا۔

بیان

بیان میں سیاست بھی ہے اور سماج بھی۔ پر آشوب موسم بھی ہے اور گھر کی تقسیم کا نوحہ بھی۔ اس ناول کا مرکزی کردار بالمکند شرما جوش ہے۔ جوش صاحب مشترکہ کلچر کے ترجمان کہے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب آزادی کے ۳۲ برس بعد قدریں بری طرح لہولہان ہوئی تھیں۔ بالمکند شرما اردو کے شاعر تھے۔ نعت شریف اور حمد بھی لکھتے تھے۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے۔ لیکن بالمکند شرما جوش یہ دیکھ رہے تھے کہ وقت کے ساتھ بہت کچھ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تفریق کی ایک خلیج حائل ہو چکی ہے۔ اردو تو ان کی اپنی زبان تھی لیکن اب ان کے اردو بولنے پر گھر والے ناراض ہو جاتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ دونوں بیٹے جوان ہو چکے تھے۔ ایک بیٹا کانگریس پارٹی میں تھا دوسرا بی جے پی میں۔ اور ان دونوں کے درمیان بنتی نہیں تھی۔ دونوں چاہتے تھے کہ اب گھر کا بٹوارہ ہو جائے۔ بالمکند شرما ملک کا بٹوارہ دیکھ چکے تھے۔ اور اب گھر کی تقسیم کا درد جھیلنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

بیان کا آغاز ایک نظم سے ہوتا ہے ۔اس نظم میں زندہ ہونے اور متحرک ہونے کے رویے پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ہم کمزور ہوتے ہیں تو دراصل ہم بزدل اور مردہ ہو جاتے ہیں ۔ یہ دنیا مردہ پرستوں کے لئے نہیں ہے ۔یہ دنیا ان کے لئے ہے جن کے اندر جوش اور امنگ ہے ۔لیکن حالات ہر بار انسان کو کمزور کر دیتے ہیں ۔ دنیا تباہی اور ہلاکت کی طرف جا رہی ہے ۔ ہر لمحہ کہیں نہ کہیں ،کسی نہ کسی ملک میں ہلاکت اور تباہی کی کہانی دہرائی جا رہی ہے ۔ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں اسلحوں اور میزائلوں کا رقص عام ہے ۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی ہلاکت کی کہانیوں میں کوئی کمی نہیں آئی ۔ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں آج بھی بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی جا رہی ہیں ۔موت کے خوف کے باوجود ہم اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ لوگ کیوں مر رہے ہیں ۔اقتباس:

> ''اس وقت جب تم اپنے گلاس میں اسکاچ انڈیلتے ہو، کاکروچ
> مارتے ہو یا اپنی گھڑی دیکھتے ہو جب تم اپنی ٹائی درست کرتے
> ہو...... لوگ مر رہے ہیں مضحکہ خیز ناموں والے شہروں میں
> گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں شعلوں میں جھلس رہے ہیں اور
> زیادہ تر نہیں جانتے ......کہ لوگ کیوں مر رہے ہیں'' [1]

بالمکند شرما جوش کے علاوہ برکت حسین بھی اس ناول کا ایک مضبوط کردار ہے ۔ برکت حسین بالمکند شرما جوش کے دوست اور ان کے ہم عمر ہیں ۔ بالمکند کی طرح برکت حسین بھی وقت کی نئی آندھیوں کو محسوس کر رہے ہیں ۔ زمانہ تیز رفتاری سے بدل چکا ہے ۔ اقدار بدل گئے ۔ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ وقت ملتا ہے تو برکت حسین ، بالمکند شرما جوش سے ملنے ان کے گھر آ جاتے ہیں ۔ دونوں کو اس بات کا افسوس ہے کہ نئی نسل شرافت اور تہذیب کے اسباق بھولتی جا رہی ہے ۔

> ''بچوں اور ہماری بولیوں میں زمین آسمان کا فرق، ان کی
> ہماری تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے......ان کے ہمارے
> خیالات میں زمین آسمان کا فرق اور.....'' ''ان کی ہماری تعلیم
> میں.....'' [2]

غور کریں تو بالمکند شرما جوش اور برکت حسین کا ڈرواجب تھا۔۲۰۱۸ء میں جب اس ناول کا تجزیہ کرتے ہیں تو حالات بدل چکے ہیں۔سیکولرزم کا ورق بوسیدہ نظر آتا ہے۔فاشزم کی آگ چاروں طرف پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ قبل از وقت مشرف عالم ذوقی نے مستقبل کے خطرات کو محسوس کرلیا تھا۔ناول سے یہ اقتباس:

''سب سنسکار کا فرق ہے......ہم تھے تو سنسکار بھی تھے......اور
جب سنسکار سیکھتے تھے تو اونچ نیچ بھی سیکھتے تھے...... ادب اور
تہذیب بھی سیکھتے تھے۔نئے بچے اڑن کھٹولے پر سوار ہیں،نئی نئی
چیزیں...... ریڈیو وغیرہ تو پرانے پڑ گئے میاں...... اب کیبل
ہے،اسٹار ہے......زی،ٹی وی ہے......اے ٹی ان ہے......ہم تو
بس بچوں سے سنتے رہتے ہیں...... پاپ میوزک ہے......تم ہی کہو
بالمکند،کل کو ہم گھر میں ذرا زور سے بول سکتے تھے چیخ سکتے تھے،
تہذیب کو بالائے طاق رکھ سکتے تھے......۔'' ؎۳

مشرف عالم ذوقی کو اس بات کا ملال ہے کہ پرانا دور واپس نہیں آسکتا۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ترقی کی دوڑ میں تیز رفتاری سے آگے بڑھتی دنیا نے نئی تہذیب کو خوش آمدید کہا ہے۔ بیان تہذیبی زوال کا نوحہ ہے۔اس وقت یہ کس نے سوچا تھا کہ ہمارا سماج اور معاشرہ اس حد تک تبدیل ہوجائے گا کہ بڑے اور چھوٹے کا فرق مٹ جائے گا۔ برکت حسین اور بالمکند شرما جوش جس تہذیب کے نگہہ بان تھے اس تہذیب کو گرہن لگ چکا تھا۔ایک حقیقت اور تھی پرانی نسل کے لوگ نئی نسل کو سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔دونسلوں کے درمیان زبردست تضاد کی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ذوقی نے جنریشن گیپ کی کیفیت کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

یہ کہانی ان پانچ نوجوانوں کی بھی ہے جو نئی نسل کے ترجمان اور جوش صاحب سے قریب تھے۔ان کا ماننا تھا کہ بالمکند شرما جوش آخری وقت میں کچھ کہنا چاہتے تھے اوران بچوں کے نام آخری وقت میں اردو میں ایک پیغام لکھا تھا۔لیکن یہ آخری خط ان کے بچوں نے گم کردیا۔ذوقی نے آخر تک نہیں بتایا کہ اس پیغام میں کیا لکھا تھا۔لیکن یہ واضح ہے کہ اس پیغام میں کیا تھا۔ بالمکند شرما جوش کے بیٹوں تک سیکولر سماج کا نظام

مخدوش ہو چکا تھا۔ان پانچ نوجوانوں کے لئے یہ درس تھا کہ ہماری گمشدہ تہذیب کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ ذوقی صحیح تھے یا غلط یہ کہنا مشکل ہے ۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا سماج اور معاشرہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ ذوقی نے اس سماج کا درد بیان کیا ہے جو فرقہ وارانہ فسادات اور حادثوں کی نذر ہو چکا ہے۔سماجی موضوعات کے حوالے سے بیان کا دائرہ وسیع ہے اوراس میں آزادی کے بعد کے حالات اور سماج کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پوکے مان کی دنیا

سماجی موضوعات کی پیشکش میں مشرف عالم ذوقی کے قلم کو ہم انوکھا بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے موضوعات اس قدر انوکھے ہوتے ہیں کہ نیا سماج اور معاشرے کا بالکل نیا چہرہ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنے قاری کو چونکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم اس معاشرے کے بارے میں نہیں جانتے۔ ذوقی کا کمال یہ ہے کہ معاشرے کے اندر چھپے کرداروں میں وہ نئے نئے جوہر تلاش کر لیتے ہیں۔ پوکے مان کی دنیا نئی انسانی تہذیب کی تصویر کشی کرتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ۲۰۰۰ء کے بعد ہماری دنیا میں بہت تیزی سے تبدیلیاں رونماں ہوئیں۔ پہلے دنیا اس قدر تیزی سے نہیں پھیلی تھی۔ پہلے اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی۔لیکن ۲۰۰۰ء کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی نے ہماری دنیا کو بہت حد تک متاثر کیا۔موبائل، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ نے عام انسانی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ پوکے مان کی دنیا میں مشرف عالم ذوقی نے بہت باریکی سے بدلتے ہوئے سماج اور معاشرے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

پوکے مان کی دنیا ہمارے اپنے سماج اور معاشرے کی کہانی ہے۔لیکن اس معاشرے میں آہستہ آہستہ بہت کچھ تیزی سے تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نئی نسل پوری طرح سے تبدیل ہوگئی ہے۔ عادات و مشاغل میں تبدیلیاں رونماں ہوئیں۔ بچوں کی پسند اور ناپسند کا معیار بدل گیا۔ ہم اس نئی دنیا کے بارے میں غور کریں تو کرپشن سے ہوس پرستی تک ایک خوفناک دنیا ہمارے سامنے ہے۔سائبر اسپیس نے بچوں کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ نئے نئے کھلونے برانڈ بن کر مارکیٹ میں آگئے ہیں۔ بچے بچپن سے ہی خطرناک کھلونوں کی زد میں ہوتے ہیں۔آخر یہ ہمارا معاشرہ کہاں جارہا ہے۔

نئی گلوبل دنیا میں ہمارا سماج اور معاشرہ تیزی سے تباہی اور بربادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ موبائل، کمپیوٹر اور کارٹون نے نئی نسل کی زندگی پر شب خون مارا ہے۔ یہ کارٹون چھوٹے چھوٹے بچوں کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ گلوبلائیزیشن کے نام پر ایک ایسی تہذیب ہمارے سامنے ہے جو خون خرابے اور ہلاکت کی ترغیب دے رہی ہے۔ آخر یہ دنیا اپنے کس انجام کو پہنچے گی۔ اس ناول میں جاپانی کمپنی کے بنے ہوئے کھلونے ہیں جو پو کے مان کہلاتے ہیں۔ آپ غور کریں تو بچے اس طرح کے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے اپنے بچپن کو غارت کر رہے ہیں۔

پو کے مان کی دنیا کی کہانی جتنی سادہ ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک معصوم بچہ ہے۔ جس کو پو کے مان کارڈس جمع کرنے کا جنون سوار ہے۔ بچے کی عمر ۱۲ سال ہے۔ اس کی ہم جماعت ایک لڑکی ہے جس کا نام سنالی ہے۔ ایک دن جب لڑکے کے ماں باپ گھر پر نہیں تھے وہ سنالی کے ساتھ بیٹھ کر بلیو فلم دیکھتا ہے اور اسی طرح کی حرکت سنالی کے ساتھ دہرانے کی کوشش کرتا ہے۔ سنالی کا تعلق دلت سماج سے ہے۔ سنالی کے باپ کا نام جے رام چنگی ہے۔ وہ ایک مخصوص سیاسی پارٹی کا رکن ہے۔ جب سنالی کے باپ کو پتہ چلتا ہے کہ ایک بارہ سال کے لڑکے نے اس کی بیٹی کے ساتھ ریپ کیا ہے تو وہ سناٹے میں آجاتا ہے۔ اس بات کا ذکر وہ اپنی سیاسی پارٹی کے ایک دوست سے کرتا ہے۔ پارٹی کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس حادثے کو سیاسی ایشو بنانے کی کوشش کرے۔ اب ایک بڑی سیاسی جنگ سامنے آجاتی ہے۔ لڑکے کو پولیس اپنی تحویل میں لیتی ہے اور روی کنچن کے خلاف مقدمہ دائر ہو جاتا ہے۔ یہ مقدمہ سنیل کمار رائے نامی جج کے پاس آتا ہے۔ سنیل کمار رائے پر سیاست اپنا دباؤ بنانے کی کوشش کرتی ہے لیکن سنیل کمار رائے معصوم بچے کی زندگی تباہ کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ناول میں تیز رفتار واقعات ہیں۔ سنیل کمار رائے کی اپنی زندگی ہے۔ ان کا ایک لڑکا ہے جو ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ایک لڑکی ہے جو ایک بلیک لڑکے سے محبت کرتی ہے۔ ایک بیوی ہے جس کی اپنی دنیا ہے۔ سنیل کمار رائے کو روی کنچن پر ترس آجاتا ہے۔ وہ اس سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناول کا سب سے دلچسپ باب سنیل کمار رائے کا فیصلہ ہے۔ یہ ایک انوکھا فیصلہ ہے۔ لیکن اس فیصلے سے قبل ذوقی نے جس سماج اور معاشرے کو ہمیں دکھانے کی کوشش کی ہے، وہ بہت حد تک تعفن کا شکار ہو چکا ہے۔ یہ

سماج تیزی سے ہوس کاری اور بربادی کی طرف بڑھ چکا ہے۔لیکن ہماری آنکھیں ابھی بھی کھلی نہیں ہیں۔سنیل کمار رائے کے سامنے یہ پوری دنیا ہے اور اسی لئے ان کی ہمدردی بارہ سال کے اس معصوم بچے کے ساتھ ہے۔

ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ہمارے بچے شکتی مان جیسے ہندوستانی سیریل سے بیزار ہیں۔ اور پو کے مان جیسے سیریل میں پناہ تلاش کررہے ہیں۔ ہم اپنے سماج کو بدلنا چاہتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں ہو پارہا ہے۔غور کریں تو ہمارے بچوں کے پاس ہندوستانیت جیسا کچھ نہیں ہے۔ ہم اپنے بچوں کو صرف مغرب نہیں دے رہے ہیں۔ بلکہ انہیں مغربی تہذیب سے آراستہ کررہے ہیں۔

یہ ناول اپنے پرکشش انداز، دلکش اسلوب اور رواں دواں مکالموں کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔ سماجی موضوعات کے تعلق سے یہ ناول کافی اہمیت رکھتا ہے۔اور غور فکر کے نئے نئے دروازے کھولتا ہے۔

نیلام گھر

نیلام گھر ذوقی کے شروعاتی ناولوں میں سے ایک ہے۔مشرف عالم ذوقی نے یہ ناول البیئر کامو کے ناول دی پلیگ سے متاثر ہوکر لکھا۔ پلیگ کی طرح اس میں تیزی سے پھیلتی ہوئی بد بو کو علامت اور استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی ۱۹۸۰ء سے قبل کی کہانی ہے۔اس وقت تک یہ دنیا اس حد تک نہیں پھیلی تھی۔ لیکن جب سے دنیا قائم ہے اچھائی کے ساتھ برائی کی بھی حکومت رہی ہے۔ جہاں ہمارے سماج میں اچھے لوگ ہیں وہیں برے لوگ ہیں۔ یہ کہانی پوری طرح اس سماج کا احاطہ کرتی ہے جس کی شکل دن بہ دن بگڑتی جارہی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار میں کریم بیگ اور انجم نظر آتے ہیں۔کریم بیگ کی اپنی دنیا ہے۔اور انجم ایک الگ راستے پر چل رہا ہے۔کریم بیگ ایک دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اس دفتر کے زیادہ تر لوگ عیاش اور اوباش قسم کے ہیں۔کریم بیگ سیدھے سادھے ہیں۔لیکن کبھی کبھی وہ ان کی سنگت میں شراب بھی پی لیتے ہیں۔ لیکن ان کا ضمیر بار بار انہیں آواز دیتا رہتا ہے۔ ناول میں اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب اچانک کریم بیگ کو اپنے گھر میں بد بو محسوس ہوتی ہے۔ پھر یہ بد بو ان کے آفس کا رخ کرتی ہے۔اور ایک دن سڑکوں شاہراہوں سے ہوکر پورا شہر اس بد بو کا شکار ہو جاتا ہے۔آخر یہ کیسی بد بو ہے؟ یہ بد بو کہاں سے آرہی ہے؟ ناول میں بد بو

کے اشارے دئے گئے ہیں۔ پھر ان کی ملاقات سلمٰی سے ہوتی ہے۔ اور کہانی یہیں سے نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ سلمٰی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ سلمٰی سے ''مس نیلی'' بن جاتی ہے۔

سلمٰی کی موت کے بعد دفتر سے لے کر شہر تک ایک بدبو پھیل جاتی ہے۔ جس کا علم کسی کو نہیں ہوتا کہ یہ کہاں سے آرہی ہے اور نہ کوئی اس کا علاج کر پاتا ہے۔ بدبو زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو جاتی ہے۔ سب مذہب سے بیزار ہیں اور روزی روٹی کے چکر میں ضمیر فروشی پر مجبور ہیں۔ انجم اس ناول میں برائیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ جس کے لئے اس کو کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور پھر اس کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی جگہ امت کو مل جاتی ہے۔ کریم بیگ کا آزاد خیال بیٹا انجم، رگھو پتی سہائے کا بیٹا اور انجم کا دوست امت اور اس کے بعد امت کی بہن نمیتا ان سبھی کے تال میل سے اس ناول کا منظر نامہ مکمل کیا گیا ہے۔ نوکری سے نکالے جانے کے بعد کریم بیگ محلے کی ایک مسجد میں امام بن جاتا ہے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ اس لائق نہیں رہتا ہے۔ وہ مسجد میں صرف نماز پڑھنے جاتا ہے۔ مگر وہی لوگ جو اس کو جھک کر سلام کیا کرتے تھے آج کوئی اس کا ادب نہیں کرتا ہے۔

یہ ناول ابتداء سے ہی قاری کو تجسس کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کریم اور انجم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور قاری تمام حقیقتوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ نیلام گھر کے کردار اس عہد کی زندگی کے سیاسی، سماجی صورت حال کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں۔ جس سے عصری زندگی اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ نیلام گھر میں کوئی کردار غیر ضروری نہیں ہے۔ کریم بیگ سے لے کر دفتر کے صاحب اور چپراسی تک کے کردار مختلف واقعات اور حالات کی پیش کش میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ذوقی نے دلدوز مناظر کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا سماج آج بھی اچھے برے طبقے میں بٹا ہوا ہے۔ جہاں باس جیسے لوگ ہیں وہیں کریم بیگ اور انجم جیسے لوگ ہیں۔ جب تک کریم بیگ انجم اور انجم کی فرینڈ امیتا جیسے لوگ اس دنیا میں ہیں تب تک ہماری اس دنیا کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جب کریم بیگ کو گرفتار کیا جاتا ہے، تب کریم بیگ سچ بولنے سے گھبراتے نہیں ہیں۔

نیلام گھر ایک بڑے سماجی موضوع پر ذوقی کا یادگار ناول ہے ۔ ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے ہم آج کی کہانی پڑھ رہے ہیں ۔ ترقی کرنے کے باوجود ہمارے سماج اور معاشرے میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے ۔ آج موسم بدلا ضرور ہے لیکن وہی بدبو ہے جس نے ہمارے سماج کو ناسور میں تبدیل کر دیا ہے ۔ کہیں کرپشن ہے ۔ کہیں مذہب نے دیوار اٹھا رکھی ہے ۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ملک کو کھوکھلا کر دیا ہے ۔ عورتوں کی عصمت محفوظ نہیں ہے ۔ درندے بے لگام گھوم رہے ہیں ۔ پولیس کا کردار مشکوک ہے ۔ اور بدبو کا سفر جاری ہے ۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہم سماجی موضوع پر یہ ناول ذوقی کے یادگار ناولوں میں سے ایک ہے ۔

آتش رفتہ کا سراغ

مشرف عالم ذوقی کے ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' کا سماجی جائزہ لیتے ہیں تو مہذب سماج اور اس کی آزادی کی خوفناک تصویر ہمارے سامنے آتی ہے ۔ ذوقی ایک ایسے مصور ہیں جن کی نظروں سے سماج اور معاشرے کی کوئی بھی برائی پوشیدہ نہیں رہ سکتی سماجی موضوعات پر ذوقی کا قلم نہ صرف تیز چلتا ہے بلکہ نئی نئی فکر کو سامنے لاتا ہے ۔

ذوقی کے ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں نئے امکانات اور زندگی کی نئی اور حسین تعبیرات کی طرف مائل نظر آتے ہیں ۔ تخلیقی عمل کے وسیع پس منظر میں وہ زندگی اور اس کے تمام اسرار و رموز اس کے حسین اور کریہہ تہذیبی اور سماجیاتی حوالوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔ ان کے یہاں کہانی کی تشکیل ہی خود زندگی کے متنوع تجربات، ذاتی اور سماجیاتی پس منظر کے زیر اثر وجود میں آتی ہے ۔ سماجی اور شخصی زندگی کے حوالوں اور ان سے پیدا ہونے والے اقدار ان کے ناولوں میں خاص طور سے جھلکتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں مختلف سطح پر زندگی کی ترجمانی اور اس کی مثبت قدروں کی نگہداشت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اول تا آخر زندگی کی مثبت اور منفی قدروں کی پیشکش میں ان کا قلم رواں دواں رہتا ہے ۔ ان کو اپنی کہانیوں کے لئے کردار ڈھونڈنے میں کوئی مشقت نہیں جھیلنی پڑتی بلکہ ہر کردار بہت آسانی کے ساتھ کہانی کی ہر صورت خود بخود اپنی سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے ۔ کرداروں کی نفسیاتی کشمکش ہو یا ان کا سیاسی و جنسی استحصال یا ان کا عزم و

استقلال ،ان کی افسردگی یا زندگی سے جنگ کا حوصلہ،سب ایک دوسرے سے مل کر ان کی کہانیوں کو آگے بڑھاتے ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ موضوع اور اسلوب کے ساتھ ساتھ ناول کے بیان میں فنکار کے ذہن میں پیدا ہونے والا سماجی اور تخلیقی درد ابھرتا چلا جاتا ہے۔ذوقی واقعاتی ترتیب کے ساتھ ساتھ زندگی کے وسیع تر تانے بانے کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔وہ ہر مسئلے میں ڈوبتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ان کی اس روش اور احساس نے تخلیقی عمل میں ایک مثبت قدر پیدا کی ہے۔زندگی کے ساتھ مربوط ہونے کے باوجود ان کے ناول عصری حسیت کے اعتبار سے ہر اس منزل کو عبور کرتے ہیں جو ایک ناول نگار کو معیار اور قدر تک پہچاتی ہے۔لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشرف عالم ذوقی کی کہانیاں اردو میں زندگی اور محبت کا ایک نیا ذائقہ پیش کرتی ہیں۔اپنی کہانیوں کے ہر تخلیقی زاویے اور فکر وعمل کی ہر تعمیر میں وہ تخلیقی سطح پر زندگی کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ان کے موضوعات ہمارے سماج کے روزانہ کے مسائل ہوتے ہیں۔ان کے ناولوں کا کینواس اکثر وسیع ہوتا ہے۔عام فہم موضوع ان کے یہاں ان کے مخصوص انداز بیان سے وسعت اختیار کر جاتا ہے۔

فساد، دہشت گردی ،اقلیتوں کا قتل عام ،فرقہ پرستی ،نکسل واد اور اس قبیل کے مختلف ایسے موضوعات ہیں جن کا ہر روز تجربہ ہورہا ہے۔بابری مسجد، گودھرا، گجرات، دانتے واڑا،نکسل باڑی کے سانحات و واقعات سے سبھی واقف ہیں۔حالیہ منظر نامے میں ایسی صورت تو مزید تیز ہوگئی ہے۔باشعور افسانہ اور ناول نگار نے ایسے مسائل کو شدت سے محسوس کیا اور اسے ''بیان''، ''پوکے مان کی دنیا''،اور ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' جیسی کہانی کا موضوع بنایا ہے۔یہ کہانیاں ہمارے ملک کے سیاہ منظر نامے کو خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ذوقی صرف ایک سچے فنکار ہی نہیں بلکہ وقت کے نباض بھی ہے۔ان کے ناولوں کی سب سے اہم خوبی موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔وہ موضوع کے انتخاب میں کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کرتے جب تک کوئی بات ان کے دل کو چھوتی نہیں وہ اس پر قلم نہیں اٹھاتے ہیں۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشرف عالم ذوقی محض لکھنے کے لئے نہیں لکھتے بلکہ زندگی کے کھرے کھوٹے تجربے اور مشاہدے ان کے ذہن اور دل ودماغ میں رچ بس جاتے ہیں۔خصوصاً جہاں استحصال کی کیفیت ہوتی ہے وہاں ان کا قلم اور بھی چمکتا ہے۔ظاہر ہے کہ ذہین ناول نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تجربات و

مشاہدات کو اس طرح فنی جامہ پہنائے کہ پڑھنے والوں کے لئے بصیرت کا کام سرانجام دے سکے۔اس موضوعاتی جائزے میں تمام ناولوں کا ذکراور تجزیہ تو ممکن نہیں لیکن اتنی بات تو پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ذوقی ایک ذی ہوش ناول نگار ہیں جو اپنے کرداروں کو زندگی کے مختلف مسائل سے وابستہ رکھتے ہیں۔ ذوقی فکشن کے اصولوں کی سخت پیروی کرتے ہیں لہذا تکنیکی اور فنی اعتبار سے وہ کامیاب ہیں۔ ذوقی اپنی روایات سے آگاہ ہیں۔اپنے مسائل کی خبر رکھتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو فنی طور پر برت کر ایسی کہانیاں واضع کرتے ہیں جو دل میں اتر جاتی ہیں۔

جب ہم مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ذوقی کو موضوعاتی ناول لکھنے میں خاصی مہارت حاصل ہے۔وہ بے باکی اور نڈرتا سے دیش،سماج،معاشرے،تہذیب وتمدن اورانسانیت کے بنتے بگڑتے نقوش کو نہ صرف اپنی تیز آنکھوں سے دیکھتے ہیں بلکہ اس کرب کو دل میں اتار لیتے ہیں اور پھران کا قلم اپنے موضوع کے ساتھ بھر پورانصاف کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ناول 'بیان' اپنے موضوع پر لکھی جانے والی تحریروں میں سب سے زیادہ قابل اعتناء سمجھی گئی۔

اس ناول میں بٹلہ ہاؤس انکاونٹر اوراس کے بعد کے حالات کو پیش کیا گیا ہے۔بٹلہ ہاؤس پر حکومت کا فیصلہ آچکا ہے۔اوراب اس ناول کی حیثیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کو ذوقی نے بے باکی کے ساتھ اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں جامعہ نگر کے علاقے میں یہ حادثہ ہوا۔ جامعہ نگر کا پورا علاقہ ہی نہیں بلکہ پوری دہلی کی سماجی فضا مخدوش ہو کر رہ گئی۔بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کو ذوقی نے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ناول کا آغاز بٹلہ ہاؤس کے دلکش اینکلو میں رہائش پذیر ارشد پاشا کے خاندان سے ہوتا ہے۔ارشد پاشا اردو کے صحافی ہیں ان کے خاندان میں ان کی بیوی رباب اور بیٹا اسامہ ہے۔اس ناول میں بہترین انداز میں بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی منظرکشی کی گئی ہے۔جامعہ نگر میں ہر کسی کے دل و دماغ میں ایک نامعلوم خوف بیٹھا ہوا ہے۔اسی دوران یہ انکاونٹر ہوتا ہے اور بے گناہ لڑکوں کو مار دیا جاتا ہے جو اسامہ کے دوست تھے۔کہانی اسامہ اوراس کے دوستوں سے شروع ہوتی ہے۔اسامہ کے دوست علوی کو پولیس گرفتار کر لیتی ہے۔ارشد پاشا کے بیٹے اسامہ کو پولیس تلاش کر لیتی ہے۔لیکن وہ اس ڈر اور خوف میں نہیں

جینا چاہتا۔ اس نے نئی زندگی کا انتخاب کیا اور گھر سے نکلا۔ انسانیت کی تلاش میں، اس انسانیت کی جس پر انتہا پسندی کی غلط چادر ڈال دی گئی تھی۔ اسامہ کے جانے سے گھر کی رونق چلی گئی ہے۔ رباب اپنا دل بہلانے کے لئے بٹلہ ہاؤس کے قریب ایک NGO میں جانے لگتی ہے۔ جہاں اس کو شمیمہ ملتی ہے۔ اور وہ اس کو گھر لے آتی ہے۔ جس سے ارشد پاشا اور رباب کو تھوڑی سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیٹا بچھڑ جانے کا غم تو ہلکا نہیں ہوسکتا لیکن کچھ دیر کے لئے ہی سہی وہ لوگ تو بہل جاتے ہیں۔ وقت گزرتا ہے بابری مسجد کی شہادت کا فیصلہ آجاتا ہے۔ جو مسلمانوں کے حق میں نہیں تھا۔ فیصلہ سننے کے بعد علوی کے والد کا انتقال ہوتا ہے اور پھر لاش کی سیاست کا ڈرامہ شروع ہوتا ہے۔ علاقے کے لیڈر میر صاحب کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے لاش کو بٹلہ ہاؤس چوک پر رکھ کر مظاہرہ کیا جاتا ہے لیکن سب بے سود ناول میں ارشد پاشا کا دوست تھاپڑ ہے جو ہر قدم پر ارشد پاشا کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن جب تھاپڑ کے چہرے سے نقاب اترتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تھاپڑ کون ہے۔ اور اس کے کیا مقاصد ہیں۔ ارشد پاشا ایک وکیل سے ملتے ہیں تاکہ ان کا بیٹا تلاش کرنے میں وہ ان کی مدد کر سکے لیکن وہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ ناول کا خاتمہ بڑا دردناک ہے۔ ارشد پاشا کی تلاش ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک نئی تلاش کا آغاز ہوتا ہے۔

اچھے لکھنے والے کی یہی پہچان ہے کہ وہ لکھنے سے پہلے ایک قاری کی طرح سوچے، سمجھے اور غور وفکر کرے تبھی وہ ایک بہترین تحریر قاری کے سامنے پیش کر سکے گا۔ ذوقی نے اس ناول میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ یہ ناول محض بٹلہ ہاوس تک محدود نہ سمجھا جائے بلکہ اسے مسلمانوں کی آزادی کے بعد ہو رہے مسلسل ظلم وستم کے تناظر میں دیکھا جائے گا۔ ملک تو آزاد ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں لیکن کیا ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو آزادی ملی تھی؟ اس ناول میں سب کچھ ملتا ہے۔ ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے عام انسان متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ، گجرات کے فسادات، پاکستان کے انتہا پسندی کے واقعات، بمبئی کا دہشت گردانہ حملہ وغیرہ وغیرہ۔

سماجی موضوعات کے اعتبار سے بھی مشرف عالم ذوقی کا یہ ناول کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یوں تو یہ ناول ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی ہے۔ لیکن اس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو سماج اور معاشرے کا

جائزہ لیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد کا معاشرہ کیسا تھا۔ بابری مسجد کے بعد کیسے حالات ہیں۔ ناول قدم قدم پر ہمارے سماج اور معاشرے کیلئے آئینہ ثابت ہوتا ہے۔

ایک وسیع کینوس پر مسلمانوں کی آپ بیتی کو لکھ کر ذوقی نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ بھگوا آتنک واد کے خلاف شاید یہ ہندستانی زبان کا پہلا بڑا ناول ہے، جس میں تفصیل سے مسلمانوں کو شکار بنائے جانے کی واردات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس وقت ملک میں مسلمانوں کی جو صورت حال ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے لیکن ایک بڑے تناظر میں مسلمانوں کے مسائل کو اٹھانا آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔ ذوقی نے جس حوصلے کا اظہار اس ناول میں کیا ہے وہ حوصلہ آج کے ادیبوں میں کم ہی نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کے مسائل پر جس سیکولر فکر کے ساتھ ذوقی کی تخلیق ہمارے سامنے آئی ہے میں سمجھتی ہوں کہ اردو ادب میں اس کی اشد ضرورت تھی۔ یہ ناول اپنے عہد کا دستاویز ہے۔ ملک کی جمہوریت کا اندازہ اس ناول کی تحریر سے با آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ذوقی جو کچھ تخلیق کرر ہے ہیں، ایسی تحریر کسی اور ملک میں یا پڑوسی ملک میں لکھا جانا شاید ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ اعتراف ناول کے Back Page پر اس طرح سے کیا گیا ہے:

''میں نے ابھی ابھی اس ناول کو ختم کیا ہے اور میں ابھی بھی اس کے سحر میں گم ہوں۔ کہنا مشکل ہے کہ اس ناول کے سحر سے کب باہر نکل سکوں گا۔ اس ناول کو لکھنا آسان نہیں تھا۔ پاکستان میں ہم ایسے ناولوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے نہیں خبر کہ آپ کو اس کے لکھنے کا حوصلہ کہاں سے ملا۔'' [۴]

ایک بڑے کینواس پر لکھا گیا سماجی موضوعات کے اعتبار سے یہ ایک یادگار ناول ہے۔ یہ ناول واقعات کے تسلسل اور کردار نگاری کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔

'ذبح' مشرف عالم ذوقی کا شہرت یافتہ ناول ہے۔ یہ ناول جب تخلیق کیا گیا اس وقت دلتوں اور ان کے مسائل پر اردو میں کوئی ناول نہیں تھا۔ ہم اس ناول کو دلت سماج کا ترجمان بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ناول عبدل سقہ کے اردگرد گھومتا ہے۔ عبدل سقہ چودھریوں کے یہاں گھر میں پانی بھرنے کا کام کرتا ہے۔ لیکن ایک دن چودھریوں کے یہاں ہینڈ پائپ لگ جاتا ہے اور عبدل سقہ کو نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عبدل

سقہ کی زندگی میں کئی طرح کے طوفان آتے ہیں۔ وہ چوری ڈکیتی کرنے لگتا ہے۔ اس کی بیٹی پڑوس کے درزی والے کے بیٹے سے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ عبدل سقہ کی عزیز درزی کے ہاتھوں پٹائی ہو جاتی ہے۔ اس کا چھوٹا بیٹا اسلم بڑا چور بن جاتا ہے۔ پھر ایک دن عبدل سقہ مر جاتا ہے۔ کہانی کا ایک کردار منّا ہے۔ جو چودھری خاندان کا وارث ہے۔ ایک دن جب وہ اسلم کو رکشہ چلاتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی مدد کیلئے سامنے آتا ہے۔ مگر اسلم صاف طور پر انکار کر دیتا ہے کہ اسے ابّا کی طرح ذبح نہیں ہونا ہے۔ اس کہانی میں نچلے طبقے کی تصویر کشی بہت عمدگی سے کی گئی ہے۔ سقہ سماج کے رہن سہن کو بہت خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ذوقی کا سماجی موضوعات کے لحاظ سے ایک اہم ناول ہے۔

لے سانس بھی آہستہ، مشرف عالم ذوقی کا مشہور ناول ہے۔ اس ناول میں تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد بدلتے ہوئے سماج اور معاشرے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کا ایک بڑا حصہ انسانی رشتوں پر مبنی ہے۔

دلوں سے جڑے ہوئے بے غرض انسانی رشتوں پر خود غرضی اور مفاد پرستی کی دھول تہہ بہ تہہ جمتی چلی جا رہی ہے۔ کھوتے جا رہے ہیں انمول رشتے اور جذبات واحساسات جو کبھی انسان کے اشرف ہونے کی خصوصیات ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج ایک طرف ماں باپ اپنے ہی بچوں سے اور بچے اپنے والدین سے۔ بھائی بہنوں سے......رشتوں میں حوس پرستی تلاش کر رہے ہیں۔

اپنے گرد و پیش بلکہ اپنے درمیان کی اس ہولناک صورت حال سے صرف نظریں بچا لینا ہی مہذب ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے جن واقعات اور تصورات کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کیا ہے وہ یقیناً حیرت انگیز ہیں۔ اس ناول کے ذریعہ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس سرزمین پر ایسے دل و دماغ والے ادیب بستے ہیں جو اس ہولناک منظر سے نکلنے والے تباہی کے راستوں کا پتہ دیتے ہیں اور لکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ برائیوں کی یہ آگ کسی کو بخشنے والی نہیں۔ اس پر اگر قابو نہیں پایا گیا تو یہ آگ ایک دن تمام رشتوں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ دنیا کو آرام وسکون کی جگہ بنانے کے لیے دنیا بھر میں نہ جانے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان بھٹک گیا ہے اور وہ صحیح راہ کی تلاش چاہتا ہے۔ اسی لیے انسان جنسی قید سے فرار چاہتا ہے۔ اگر جنسی آزادی اتنی ہی اہم ہے تو تمام دنیا میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں اس بنا پر چین وسکون ہو۔ جہاں

پر ہوس پرستی ہے وہاں خوف کا ماحول ہے اور اس سے نجات کے لیے آشرموں کا اور مذہب کا سہارا کیوں لیا جارہا ہے۔ اس فرار کی اصل وجہ کیا ہے؟ ذوقی نے اپنے ناول کے ذریعہ ایسے بہت سے سوال قاری کے سامنے رکھ دیے ہیں جن کے جواب تلاش کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ چلتے پھرتے نورمحمد اور نگار کا کردار رہ رہ کر آنکھوں کے آگے زندہ ہو جاتا ہے۔ نورمحمد کا کتنا سخت امتحان اور اس کا اس امتحان میں کامیاب ہونا کمال ہے۔ ذوقی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نورمحمد کو ہر حال میں حالات سے لڑنا سکھایا اور اس کو زندہ رکھا۔۔۔۔ نگار کو زندہ رکھا اور صحیح وقت پر صحیح فیصلہ لے کر ایک تہذیب کو دوسری تہذیب میں تبدیل کر دیا۔۔۔ 'لے سانس بھی آہستہ' اردو ادب کے فلک پر ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے، جس کے کردار نورمحمد، نادرہ، نگار اور جینی رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے اور یہ ناول ذوقی کے ادبی ذخیرہ میں میل کا پتھر ثابت ہوگا۔ [۵]

کیسا ہے ہمارا سماج؟ آزادی کے بعد ہندوستانی سماج کی شکل وصورت کس حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ لے سانس بھی آہستہ کے ذریعہ ذوقی نے سماج و معاشرہ کا جو کریہہ چہرہ ہمیں دکھانے کی کوشش کی ہے، اس سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی صرف سماج کو اپنا موضوع نہیں بناتے بلکہ وہ قلم سے نشتر کا کام لیتے ہیں۔ وہ معاشرے کے اچھے برے تمام پہلوؤں کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ اکیسویں صدی کا سماج بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ہم ایک مہذب دنیا میں قدم رکھ چکے ہیں مگر اس دنیا میں جنگوں کا خوف ہمیں متاثر کرتا ہے۔ بربادی و ہلاکت کی کہانیوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ جنگ، نسل کشی، جسم فروشی، میزائلوں کا رقص، درندگی اور ان کے درمیان دنیا کے امن وچین اور تحفظ کے بارے میں غور کرنا، ذوقی کی ادبی کائنات کی خاصیت ہے۔ وہ سماج سے زیادہ سماج کے مستقبل کو لے کر خوفزدہ رہتے ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ سماجی موضوعات کے لحاظ سے ذوقی کے ناولوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے بیشتر ناولوں میں مستقبل کے اشارے ملتے ہیں۔

(2)

سیاسی موضوعات

سیاسی موضوعات پر بھی مشرف عالم ذوقی کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ ذوقی اس بات کوتسلیم کرتے ہیں کہ سیاسی شعور کے بغیر کوئی بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں کا تعلق سیاست سے رہا ہے۔ بیان، آتش رفتہ کا سراغ، پو کے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ایسے ناول ہیں جن میں شعوری اور غیر شعوری طور پر سیاست کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ذوقی کے ناولوں میں غلامی اور تقسیم کی گونج شدت سے سنائی دیتی ہے۔ ذوقی کا ایک ناول لے سانس بھی آہستہ ہے اس ناول میں غلامی اور غلامی کے بعد کے حالات کا جائزہ سیاسی روشنی میں لیا گیا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار کی پیدائش بلند شہر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء رات گیارہ بجے ہوتی ہے یعنی پیدائش کے وقت ملک غلام تھا۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہندوستان کو آزادی مل جاتی ہے۔ مرکزی کردار کا تعلق غلامی کی اخلاقیات سے ہے اور آزادی کی اخلاقیات سے بھی۔ یہ اخلاقیات بخوبی ملک کی سیاست کو واضح کردیتی ہے۔ ہندوستان ایک خوفناک غلامی کا شکار ہوا تھا۔ تقسیم کی سیاست کم خوفناک نہیں تھی۔ زمین بارودی ہوچکی تھی۔ دونوں طرف سے ریل گاڑیاں آرہی تھیں ان میں مردہ لاشیں جھول رہی تھیں۔ آزاد ہونے کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کا طوفان تھما نہیں تھا کہ سیاست کی آتش بازی اپنا کام کر گئی تھی۔ اور اسی عالم میں چودھری خاندان کو اس کا وارث ملا تھا۔ ناول کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> بلند شہر (یوپی)
>
> ۱۴؍ اگست، ۱۹۴۷ء رات گیارہ بجے۔۔۔۔۔ابھی ملک کو آزاد ہونے میں پورے ایک گھنٹہ کی تاخیر تھی اور ٹھیک یہی وقت تھا، اور جیسا کہ مجھے بتایا گیا، میں نے اس عالم فانی میں قدم رکھا۔۔۔۔۔ اور جیسا کہ ابّا ہنستے ہوئے بتاتے ہیں۔۔۔۔۔کم بخت نے ایک گھنٹہ بھی انتظار نہیں کیا۔ ارے کم

سے کم آزاد ملک میں تو آنکھیں کھولتا۔۔۔۔۔ اللہ کا شکر ادا
کر۔۔۔۔۔ بلند شہر کی اس بلند حویلی کو اس کا وارث مل
گیا۔۔۔۔۔۔اور وہ بھی تب، جب تیری عمر ۴۵ سال کی ہوگئی
ہے۔ ہم تو نا امید ہوگئے تھے۔ لیکن اللہ سچ مچ بڑا کارساز
ہے...... دیکھ اس نے دعائیں قبول کرلیں۔۔۔۔۔اور وہ بھی
ایسے وقت جب ملک کو بدترین غلامی سے آزادی کا تحفہ ملا ہے۔
سن وسیع۔۔۔۔۔اس کی قدر کر۔۔۔۔۔ یہ آزادی کا تحفہ لے
کرآیا ہے۔۔۔۔۔۔۔'' ۶

سیاست اور سماج کا آپس میں قریبی رشتہ ہے۔ سیاست سماج پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور سماج کی خواہش ہوتی ہے کہ سیاست اس کے ساتھ چلے لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ لے سانس بھی آہستہ ناول کا بڑا حصہ غلامی اور غلامی کے بعد کے حالات پر مشتمل ہے۔ ذوقی نے اس ناول میں بابری مسجد شہادت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کے جو حالات ہیں، ان میں ہجومی تشدد کچھ کم نہیں ہے۔ آزادی کے بعد مسلمان ایک طرح سے حاشیہ پر ہی رہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آندھی سے ملک لگاتار لہولہان ہوتا رہا۔

یہ حقیقت ہے کہ سیاست کا زہر اندر ہی اندر آپ کو ہلاک کرتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کاردار کو پہلے اپنے والد کی بات قابل قبول نہیں لگی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ دیکھ رہے تھے کہ سیاست نے ہر سطح پر مسلمانوں کو کمزور و مجبور کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ خیال ہی خوفناک ہے کہ یہ ملک ان کا ہو کر بھی ان کا نہیں ہے۔ جان لٹانے کے باوجود ان کی حب الوطنی پر شک کیا جاتا ہے۔ ناول کا ایک حصہ آزادی کے ۷۰ برسوں کا احاطہ کرتا ہے جو صورت حال آزادی کے وقت تھی وہی صورتحال بعد میں برقرار رہی۔ یعنی سیاست نہ کل تبدیل ہوئی اور نہ آج سیاست میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ اس لئے سوال ضروری ہو جاتا ہے کہ سیاست کس حد تک انسانی جذبات و احساس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ سیاست ہی ہے کہ خوف کا احساس ترقی کے ہر راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

سیاسی موضوعات کے اعتبار سے 'لے سانس بھی آہستہ' کو ذوقی کے اہم ناولوں میں شمار کیا جائے گا۔

اسی طرح ذوقی کا ایک ناول ’پو کے مان کی دنیا‘ بھی ہے۔ اس ناول میں سیاست کا احاطہ خوبی سے ہوا ہے۔ ناول میں جب سنالی کے ساتھ ریپ ہوتا ہے تو ایک مخصوص نظریے کی پارٹی اس حادثے کو بھنانا چاہتی ہے۔ لڑکی کا باپ جئے چنگی رام دلت ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بی جے پی والوں کے ساتھ ہے۔ ناول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس وقت کانگریس کی حکومت تھی۔ اور بی جے پی برسر اقتدار آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سیاست تیز تھی۔ کانگریس کو نیچا دکھانے کیلئے اور عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بی جے پی ہر ممکن اقدام کر رہی تھی۔ ناول میں جا بجا سماجوادی پارٹی اور بہوجن سماج وادی پارٹی کا ذکر آیا ہے۔ اور کرداروں کے سہارے ان پارٹیوں کے کام کاج کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول میں اس بات کا خصوصی اشارہ ملتا ہے کہ آزادی کے بعد سے مسلمان اس ملک میں ووٹ بینک بنا دئے گئے۔ ہر سیاسی پارٹی مسلمانوں میں اپنا ووٹ بینک ہی دیکھتی ہے۔ کبھی کوئی پارٹی مسلمانوں کا علاج بن کر سامنے نہیں آتی۔ یہ پارٹیاں یہ سمجھتی ہیں کہ ہندوستان کا مسلمان کبھی کسی ایک کا بن کر نہیں رہا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ووٹ بینک بننے کے باوجود مسلمانوں کو کبھی کچھ ملا نہیں۔ ناول میں یہ تمام تفصیلات کا ذکر جس خوبی سے کیا گیا ہے اس سلسلے کا اقتباس پیش ہے:

> ’’منتری جی کی آنکھیں جسم میں گھس گئیں تھیں۔ آپ جانتے ہیں
> جئے چنگی رام ۔۔۔۔ دلت ہیں ۔۔۔۔۔ ہمارا دلت ووٹ
> ۔۔۔۔ ہم ایک تیر سے کئی شکار کر سکتے ہیں۔ آپ وقت کیوں
> ضائع کر رہے ہیں ۔۔۔۔۔ دیکھئے ۔۔۔۔ اتنا کچھ ہوا
> ۔۔۔۔ بہن جی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اتر پردیش۔ آپ سمجھ رہے
> ہیں نا۔ مگر کیا ہوا۔ بہن جی کا ووٹ سولڈ ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔
> منو وادی ۔۔۔۔‘‘ ے

’پو کے مان کی دنیا‘ ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے اس ناول میں ۲۰۰۴ء سے پہلے کی سیاست پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو میڈیا آج ہے وہی میڈیا کل تھا۔ اخبارات اور نیوز چینلس کے مالکان کا تعلق سیاسی پارٹیوں سے ہوتا ہے۔ چینل اور اخبار اسی روشنی میں اپنا کام کرتے ہیں۔ صحافی اسی روشنی میں چاپلوسی اور خوشامد میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اور اسی لئے جب جئے چنگی رام منتری سے ملنے آتا ہے تو

منتری کو کہنا پڑتا ہے کہ اس خبر کا میڈیا میں آنا ضروری ہے۔ منتری جئے چنگی رام میں اس لئے بھی دلچسپی لے رہے تھے کہ وہ دلت تھا اور الیکشن نزدیک آ چکا تھا۔ اقتباس:

''میڈیا میں آنے دیجئے ۔۔۔۔۔ خبر کو مت روکئے ۔۔۔۔
پھیلنے دیجئے۔ ارے دس پریس والے کو ہم بھی بول دیں گے۔
جئے چنگی ہمارا آدمی ہے ۔۔۔۔۔ دلت ہے۔۔۔۔۔ اب
ریپ کرنے والا کوئی بھی ہو ۔۔۔۔۔ ہم دلت کی
Sympathy بٹوریں گے ۔۔۔۔۔ وہ کیا ہے کہ الیکشن
نزدیک ہے۔۔۔۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔۔۔۔۔'' ۸

جئے چنگی رام پہلے بہوجن سماج پارٹی میں تھے۔ کاشی رام کے مرنے کے بعد بہوجن سماج پارٹی میں اس کی دلچسپی کم رہ گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ وہ بہوجن سماج پارٹی سے دور ہوتا چلا گیا۔ جب کانگریس نے اسے قبول نہیں کیا تو وہ پارٹی بدل کر بھاجپا میں آ گیا۔ یہ ہندوستانی سیاست کا وہ پڑاؤ تھا جب لباس کی طرح دل/ پارٹی بدلنے کا کام جاری تھا۔

سنالی کا ریپ جیسے ہی اخباروں کی زینت بنتا ہے اور نیوز چینل اپنی ٹی آر پی بڑھانے کے لئے اس خبر کو ہوا دیتے ہیں، ملک میں طوفان آ جاتا ہے۔ سنالی کا کیس ایک اصول پسند جج سنیل کمار رائے کے پاس آتا ہے جو اپنے گھر کی سیاست کو لے کر پریشان رہتا ہے۔ گھر میں اس کا دبدبہ کہیں نہیں ہے۔ بیٹی آزاد خیال ہے اور بیٹا باغی۔ ایسے میں جب روی کنچن کا کیس اس کے ہاتھ میں آتا ہے تو سنیل کمار رائے کو شدت سے صرف ایک بات کا احساس ہوتا ہے کہ ننھا روی کنچن ہمارے سماج کا ملزم ہے اور سیاست اس بارہ برس کے بچے کا استعمال کر رہی ہے۔ غور کریں تو یہاں سے سیاست اور سماج کے درمیان کی جنگ شروع ہوتی ہے۔ ادھر سنالی کا باپ جئے چنگی رام باضابطہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا ممبر بن جاتا ہے اب اسے پارٹی سے ملنے والے بڑے عہدے کا انتظار ہے۔

ایک سیاست رشتوں میں ہوتی ہے۔ یہاں شطرنج کی وہی بساط ہے اور رشتوں کے درمیان انسانی مہرے اپنی اپنی چال چل رہے ہیں۔ رشتوں کی سیاست کی سب سے خوبصورت مثال ذوقی کا ناول 'پروفیسر

ایس کی عجیب داستان وایا سونامی' ہے۔ اقتباس:

''سونامی محض سمندری لہروں کا ترجمان ہی نہیں بلکہ یہ لہریں
تہذیب کو بہا کر لے جانے والی، روایتوں کو توڑنے والی،
رشتوں کی پریبھاشاؤں کے معنی بدلنے والی ہیں۔ ساتھ ہی یہ
لہریں انسانی فطرت کی عکاس بھی ہیں۔ انسانی نفسانیت کے
مطابق ایک عمر گزر جانے پر ہر انسان کو یہ خوف ہے کہ اگر ہم ختم
ہو گئے تو آگے کیا ہوگا۔ آگے کون سی دنیا ہمارا استقبال کرے
گی۔'' 9

پروفیسر ایس اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار اپنے جیسا ایک انسانی روبوٹ تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس کی شادی سیما سے ہوتی ہے۔ پروفیسر ایس خود پر غرور کرتا ہے۔ اور اپنے سامنے اسے دنیا کا ہر شخص ہیچ نظر آتا ہے۔ وہ دولت مند ہے۔ انسانی ہمدردی کا مذاق بنانا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ زندگی کی ریس میں اچانک اسے پرویز ملتا ہے اور وہ پرویز کو اپنے منصوبے کے تحت، اپنے عکس میں ڈھالنا شروع کرتا ہے۔ اچانک اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ سیما کہیں تنہائی میں کسی سے ملتی نہ ہو۔ وہ سیما پر نہ صرف پہرے بٹھاتا ہے بلکہ اس پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ توڑنا شروع کرتا ہے۔ ناول کے اختتام پر پروفیسر ایس کی موت کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے، جو قاری کو چونکا دیتا ہے۔ مگر اس منظر نامہ سے قبل زندگی کا جو کینواس تیار کیا گیا ہے، اس میں قدم قدم پر سازش اور سیاست کا جال بنا گیا ہے۔ پروفیسر ایس اپنی حیثیت منوانے کے لئے قدم قدم پر سیاسی مہرے سجاتا ہے۔ یہ ناول اس بات کا احساس کراتا ہے کہ انسانی رشتے آج کے عہد میں کس حد تک کمزور ہو چکے ہیں۔ اکیسویں صدی کی دوڑ میں آگے بڑھتی دنیا کے لئے یہ رشتے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

سیاست کے موضوع کا تذکرہ ہو تو ذوقی کے بیان کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بیان میں سیاست کی خطرناک چالوں کا خوبصورتی سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا ایک حصہ آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا جیسی تنظیموں سے وابستہ افراد پر مبنی ہے۔ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں اور سیاست کے کس چور دروازے سے عوام تک پہنچنا چاہتے ہیں، اس کا خوبصورت استعمال ناول میں ہوا ہے۔ ناول میں اس مناسبت سے ہندی الفاظ کا

کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ جوضروری معلوم ہوتا ہے۔ ذوقی وقت کے نباض اور اپنے عہد کی سیاست کی باریکیوں کوبخوبی سمجھتے ہیں۔

کہانی کا ایک کردار نیل کنٹھ ہے۔نیل کنٹھ مخصوص پارٹی کا ترجمان ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر پارٹی کو حکومت کرنی ہےتو مہرے کس طرح بیٹھانے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ لوگ سب سمجھتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل نہیں کہ سیاست نے اب تک اپنا الّو سیدھا کیا ہے اور لوگوں کو بے وقوف بنایا ہے۔ عالمی سیاست کی بات کریں تو یہاں سیاسی افق پر مذہب کی سیاست حاوی ہے۔ یعنی دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں یا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں انسانیت کا جنازہ نہ نکلا ہو۔ ہندوستانی سیاست کے ۷۰ برسوں میں انقلاب یہ آیا کہ پہلے ہندوستان کی سیاست مذہب کے نرم رخ کو لے کر چل رہی تھی اور اچانک نرمی نے تلخی کی جگہ لے لی ۔ نام نہاد سیکولرزم کوختم کرنے کی سازش شروع ہوئی۔ جمہوریت آئین اور قانون کودفن کرنے کی سیاست نے عوام کے درمیان خوف و ہراس کے بت کو کھڑا کر دیا۔ بیان میں گہرائی و گیرائی سے اس وقت کی سیاست کا باریکی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۷۵کے بعد ملک کی صورتحال بہت حد تک تبدیل ہوچکی تھی۔ اندرا گاندھی کےقتل کے بعدحکومت راجیو گاندھی کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ راجیوگاندھی اس وقت کی سیاست کے لئے کمزورمہرا ثابت ہوئے۔اس وقت تک بابری مسجد کےبطن سے رام مندر کا جن باہر آ چکا تھا۔اس وقت تک جن سنگھ کا سورج غروب ہونے کی تیاری کررہا تھا۔اوراس کی جگہ بارودی زمین سے بی جے پی سرنکالنے کی تیاری کررہی تھی۔ ملک میں رتھ یاتراؤں کا دورشروع ہو چکا تھا۔جگہ بہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے تھے۔ ماحول خراب ہوگیا تھا۔اس دور کا جائزہ لیں تو نیل کنٹھ جیسے کتنے ہی نیل کنٹھ پیدا ہو چکے تھے۔اور ملک کی فضا کو اپنی اشتعال انگیزی سے تباہ کررہے تھے۔ ۲۰۱۸ء میں ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں اس کی شروعات ۱۹۸۰ء کے آس پاس ہوچکی تھی۔اس لئے جب ہم 'بیان' کے سیاسی منظرنامے پرغورکرتے ہیں تو آزادی کے بعد کا ہندوستان لرزتا ہوا ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اوراس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تقسیم کو چاہے کتنا عرصہ کیوں نہ گزرگیا ہولیکن انسانی نفرت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ اس نفرت میں بتدریج اضافہ ہی ہوا ہے۔

اس ناول کا ایک مضبوط کردار نریندر ہے۔ جو بالمکند شرما جوش کا بیٹا ہے۔ نریندر کا تعلق اسی مخصوص پارٹی سے ہے اور وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کانگریس اور سیکولر خیالات کے لوگ اس کی پارٹی کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے باپ بالمکند شرما جوش کے پاس آتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ ان کی پارٹی کو کچھ لوگ بیکار میں بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ بالمکند شرما جوش سیکولر کردار کے نمائندے ہیں۔ انہیں نفرت بھری فضا راس نہیں آتی اور اسی لئے انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ ان کے بچے کہاں ہیں۔ ایک کانگریسی ہے تو دوسرا بھاجپائی۔

'بیان' ہندوستانی سیاست کی لرزہ خیز کہانی ہے۔ ایک ایسی کہانی جس کو پڑھتے ہوئے آنکھوں سے آنسوں رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کہاں دفن ہوگئی۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جب سیاسی موضوعات پر مشتمل ناول کا نام آئے گا بیان کا نام پہلی صف میں ہوگا۔ یہ ناقابل فراموش ناول ہے۔ ذوقی کا ایک دوسرا ناول آتش رفتہ کا سراغ ہے۔ بیان میں بالمکند شرما جوش کی موت کے ساتھ سیکولر ملک کا ایک مضبوط ستون گر گیا تھا۔ یہ موت اس بات کا اعلان تھی کہ ملک سے جمہوریت ختم ہو رہی ہے۔'آتش رفتہ کا سراغ' اس وقت کی کہانی ہے جب بابری مسجد شہید ہو چکی تھی۔ ملک کا موسم پوری طرح تبدیل ہو چکا تھا۔ نیل کنٹھ جیسے جو کردار ڈھکے چھپے زندگی گزار رہے تھے اب کھل کر سامنے آ گئے تھے۔'آتش رفتہ کا سراغ' میں ایسے تمام کرداروں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ سیاست بدل چکی ہے۔ بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک ہو چکی ہے۔ اس ناول میں بٹلہ ہاؤس کے حادثے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی کہانی پر ابھی تک دھند چھائی ہوئی ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار دوبے ہے۔ دوبے سنگھ کا ماسٹر مائنڈ ہے۔ مرنے سے پہلے اس نے جو بیان دیا تھا، اس بیان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دوبے نے کہا تھا کہ سنگھ کا آدمی ہر جگہ ہے۔ سنگھ کا آدمی ملک کے چپے چپے میں پھیلا ہوا ہے۔ سنگھ کا آدمی آپ کے قریب رہتا ہے مگر آپ اسے پہچان نہیں پائیں گے۔ دراصل آدمی نظریہ بن چکا ہے۔ ذوقی نے کرداروں کو نہیں، بلکہ فسطائیت کے نظریے کو ناول کے کرداروں کے ذریعے ابھارنے یا سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ صورتحال پر غور کیجئے تو تقسیم کا جن سامنے آ جاتا ہے۔ آزادی کے ۷۰ برسوں میں یہ جن بوتل میں بند

نہیں ہوا، بلکہ بوتل سے باہر نکل کر آج نفرت پھیلانے کا کام کر رہا ہے۔ تقسیم کے وقت کیا ہوا تھا۔ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کا خون بہا دیا تھا۔ دوقومی نظریے نے ملک کو دو حصے میں تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ ملک زخمی ہوا۔ سرحد کے اس پار نفرتیں برقرار رہیں اور سرحد کے اس پار نفرتوں کی کھیتی ہوتی رہی۔

ارشد پاشا کی حیثیت ناول میں مرکزی کردار کی ہے۔ وہ اس بات سے نالاں ہیں کہ تقسیم نے سب کچھ چھین لیا۔ زہریلی ہواؤں نے کچھ باقی نہیں رکھا۔ دراصل یہ ہمارے نوجوانوں کا المیہ ہے۔ آزادی کے بعد مسلمان اپنی شناخت کے لئے مسلسل کوششیں کرتا رہا۔ مگر سماج سے سیاست تک ہر جگہ اسے حاشئے پر رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ۷۴۰ صفحات پر مشتمل ناول آتش رفتہ کا سراغ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی ہے۔

ایک بڑی جنگ میڈیا سے ہے۔ جب میڈیا کی بولی لگ جائے تو صحافت پر خطرہ تو منڈلاتا ہی ہے، ملک پر خطرے کے بادل منڈرانے لگتے ہیں۔ ۷۰ برسوں کی سیاست نے ہندوستانی مسلمانوں کو کہاں اور کس حال میں پہنچا دیا ہے۔ مالیگاؤں سے لے کر اعظم گڑھ تک سیاست نے دہشت کے تار بچھا دئے۔ بار بار مسلمانوں کو پاکستانی ہونے کا طعنہ سننے کو ملتا رہا کوئی بھی مسلمانوں کو دہشت گرد ٹھہرا سکتا تھا۔ بٹلہ ہاؤس حادثے کے بعد نوجوانوں میں خوف و ہراس چھا گیا۔ مسلمانوں کا مخصوص لباس ان کا دشمن بن گیا۔ حالات یہ ہو چکے تھے کہ اگر بیٹا زیادہ دیر تک گھر واپس نہیں آتا تو بوڑھے ماں باپ پریشان ہو جاتے تھے۔ کرائے دار کے طور پر مسلمانوں کو کرایہ کا فلیٹ ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ ناول میں بہت باریکی سے ایسی تمام باتوں کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ناول نگار کی حیثیت سے مشرف عالم ذوقی کا نام اردو ناول نگاری کی تاریخ میں خاص اہمیت اور عظمت کا حامل ہے۔ ناول میں کئے جانے والے تجربوں نے ذوقی کو انفرادی شان عطا کی ہے۔ بیان، اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے ذوقی کا قلم دوسرے ادیبوں سے الگ نظر آتا ہے۔ سیاست وہ بنیادی منتر ہے، جس کے سہارے ذوقی اپنے موضوعات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ذوقی کا کوئی ناول ایسا نہیں ہے جہاں اظہار کے لئے سیاسی شعور کو وسیلہ نہ بنایا گیا ہو۔ ایک زمانہ، ایک عہد ان کے ناولوں میں قید نظر آتا ہے۔ ذوقی اس

بات کوتسلیم کرتے ہیں کہ بغیر سیاسی شعور کے بڑا ادب لکھا ہی نہیں جاسکتا۔ ملک کے حالات اور واقعات ناول میں علامت اور استعارے کی طرح بیان ہوتے ہیں ۔ ہر ناول ایک مختلف سیاست کی کہانی بیان کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سیاست کوموضوع بنانا ہرقلم کار کے بس کی بات نہیں ہے۔ ذوقی سیاسی موضوعات کوآفاقی بنانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ان کے ناول ہمیشہ غور وفکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ان ناولوں کے علاوہ ذوقی کے ایسے ناول بھی ہیں جہاں سیاست اور سماج کا امتزاج قاری کوغور وفکر کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔'شہر چپ ہے' ناول میں رشتوں کی سیاست کا بازار گرم ہے۔'ذبح' میں دلتوں کے مسائل کے ذریعہ ہندوستانی سیاست کوسمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔'عقاب کی آنکھیں' کاتعلق اس دنیا سے ہے جو روز بہ روز ہوس کے بازار کا حصہ بنتی جارہی ہے۔ذوقی کا ایک مشہور ناول 'مسلمان' ہے،اس ناول میں بھی یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندواورمسلمان کے درمیان ہمارا سماج اور معاشرہ کس طرح زہر بھرنے کا کام کرتا ہے۔ نوجوانوں کے اصل مسائل کیا ہیں۔ اور سیاست نوجوانوں کو ان مسائل سے کاٹ کرنفرت بھرے راستوں پر چلنے کے لئے مجبور کررہی ہے۔ اس حقیقت سے مفرنہیں کہ ذوقی کے ناول نہ صرف انسانی مسائل کی پرتیں کھولتے ہیں بلکہ ہمارے معاشرے کو جگانے اور بیدار کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ ذوقی کا ایک اور ناول 'مرگِ انبوہ' ہے جو حال ہی میں منظر عام پرآیا ہے۔اس ناول میں بھی سیاست کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔اس لئے بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشرف عالم ذوقی کے ناولوں نے اردو ناول نگاری کے باب میں اپنی بصیرت اورآگہی سے گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

(3)

معاشی موضوعات

معاشی موضوعات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس کے تحت سرمایہ دارانہ نظام، جاگیردارنہ نظام، سوشلزم و کمیونزم نظام، بینکنگ، کارپوریٹ سیکٹر، ملٹی نیشنل کمپنیاں، جدید ترین مسائل جیسے موضوعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ معیشت کا تعلق ہماری عام زندگی سے ہے۔ ملک کا معاشی نظام بہتر نہ ہو تو عوام کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

معیشت کا ذکر آتا ہے تو کسانوں، نوجوانوں اور روزگار کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔ بڑے اور جینوئن ادیب ان موضوعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آزادی کے ستر برسوں میں ملک کو بنانے، سنوارنے، عوام کے طرز زندگی اور معیار کو بلند کرنے، ملک کو مین اسٹریم میں لانے یا سپر پاور بنانے کی جدوجہد چلتی رہی ہے۔ تقسیم کے بعد ملک کا ایک کھوکھلا ڈھانچہ ہمارے پاس تھا۔ اس ڈھانچے کو مضبوط کرنے کی ضرورت تھی۔ جس ملک کی معیشت مضبوط ہو، وہی ملک طاقت یا پاور کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ ایک وقت تھا جب یہ پاور روس کے پاس تھا۔ روس کئی حصوں میں تقسیم ہوا تو امریکہ سپر پاور بن کر سامنے آیا۔ ہندوستانی معیشت کے فروغ میں کمپیوٹر سیکٹر اور انٹر نیشنل کمپنیاں سامنے آئیں۔ ترقی ہوئی تو اس کے اثرات عوام پر نظر آئے۔ اس کے باوجود غریب اور امیر کا مسئلہ برقرار رہا۔ کہتے ہیں دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں۔ ایک غریب قوم ہے اور دوسری امیر۔ سارا مسئلہ اسی کا ہے۔ مشرف عالم ذوقی ان فنکاروں میں سے ایک ہیں، جن کی نظر سے کچھ بھی اوجھل نہیں۔ اس لئے 'پوکے مان کی دنیا' میں وہ سیدھے سادے الفاظ میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔

'ہم ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بڑے بازار میں الجھ کر بونے بن گئے ہیں۔'

نالۂ شب گیر، لے سانس بھی آہستہ، پوکے مان کی دنیا، آتش رفتہ کا سراغ، ذوقی کے ہر ناول میں اس پھیلتے بڑے بازار کو لے کر مکالمے اور معاشی خیالات آسانی سے مل جائیں گے۔ نالۂ شب گیر کے شروعاتی صفحوں میں مشرف عالم ذوقی نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ نئی صدی کی شروعات میں ہی ہماری دنیا پر

معیشت کا بوجھ اس قدر حاوی ہوا کہ ساری دنیا کا بینکنگ سسٹم کرپٹ ہو گیا۔ عالمی معیشت تباہی کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی۔ نالۂ شب گیر میں نئی عورت کا جنم ہوا ہے۔ یہ عورت اسی بازار سے پیدا ہوئی۔ اور اب یہ عورت آزادانہ طور پر اپنی جنگ لڑ رہی ہے۔ نالۂ شب گیر سے یہ اقتباس:

''عورت آج برانڈ بن چکی ہے۔ ایک ایسا برانڈ، جس کے نام پر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اپنے پروڈکٹ کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لئے اس کی مدد لیتی ہیں۔ چاہے وہ جنیفیر لوپیز ہوں، ایشوریہ رائے یا سشمتا سین۔ سوئی سے صابن اور ہوائی جہاز تک، بازار میں عورت کی مارکیٹ ویلیو، مردوں سے زیادہ ہے۔ سچ پوچھئے تو تیزی سے پھیلتی اس مہذب دنیا، گلوبل گاؤں یا اس بڑے بازار میں آج عورتوں نے ہر سطح پر مردوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا ------'' [10]

وومن امپاورمنٹ بھی اسی سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ عورت نہ صرف آزاد ہوئی ہے بلکہ اپنے لئے روزگار کی نئی راہیں بھی تلاش کر رہی ہے۔ اور اس لئے آج کی عورت عالمی سطح پر ہر مورچے پر کامیاب ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے نالۂ شب گیر کے ذریعہ نئی صدی کے اہم مسائل اور مستقبل میں پیش ہونے والے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

'نالۂ شب گیر' کے علاوہ عورت کے روزگار سے وابستہ موضوعات ذوقی کے دوسرے ناولوں کا بھی حصہ رہے ہیں۔ پو کے مان کی دنیا، اپنے دوست ولسی کے ساتھ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور وہ گھر سے باہر اپنے مستقبل کو آواز دیتی ہے۔ شہر چپ ہے میں، رام اوتار شاستری کی دونوں بیٹیاں زندگی کی جدوجہد کرتے ہوئے کچھ کرنے کی خواہشمند ہیں۔ ناول نیلام گھر میں انجم کی دوست امیتا اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کیمپ کے بیمار مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ 'مسلمان' ناول میں ایک طوائف کے درد کو بیان کیا گیا ہے۔ ان سب سے الگ ذوقی کا ناول پروفیسر ایس کی عجیب داستان ہے جہاں پر قدرتی آفات کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ۲۰۰۴ء سونامی کے قہر سے دوچار ہوئی تھی۔ سونامی کی لہروں نے ایک طوفان کھڑا کیا تھا۔ اس طوفان

کا مقابلہ آسان نہیں تھا۔ اس طوفان کا مقابلہ تمام ممالک کو مل کر کرنا تھا۔ قدرتی آفات نے اس بات کا احساس دلایا کہ انسان جنگوں سے کھیل سکتا ہے مگر قدرتی آفات کا اکیلا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اس کے لئے تمام چھوٹے بڑے ممالک کو ایک ساتھ مل کر سامنے آنا ہوگا۔

ذوقی نے سونامی کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ آخر اس تفصیل کی ضرورت کیا تھی۔ سونامی کو گزرے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ اب اس کی بس کہانی لوگوں کو یاد ہے۔ سونامی کی دہشت اب کسی کو یاد نہیں۔ لیکن اس وقت سونامی نے پوری دنیا کو متاثر کیا تھا۔ چاروں طرف انسانی آبادی میں لاشیں ہی لاشیں تیر رہی تھیں۔ سمندر نے قہر برپائے تھے۔ انڈونیشیا اور سری لنکا سے لے کر ہندوستان تک اس کی زد میں تھا۔ جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں کافی بڑی آبادی سونامی کا شکار ہوئی تھی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں سے یہ تباہی کچھ کم نہیں تھی۔ تباہی ہر بار ملک کی معیشت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ سونامی نے بھی معیشت کا کافی نقصان کیا۔ لیکن ایک حقیقت اور بھی ہے جس کے بارے میں مشہور ناول نگار آرنیسٹ ہیمن وے نے کہا تھا کہ انسان عظیم ہے۔ انسان کبھی شکست نہیں کھاتا۔ ہر بار وہ اپنی شکست کے خول سے باہر نکل آتا ہے۔ سونامی گزر گئی۔ انسان سونامی کی شدت سے باہر نکل کر اپنے اپنے روزگار میں لگ گیا۔ کیا زندگی بس یہی ہے۔؟ غور کریں تو یہ سونامی ہماری زندگی میں لہروں کی طرح اپنا رنگ دکھاتی رہتی ہے۔ کہیں عقائد مجروح ہو رہے ہیں۔ کہیں تعلیم کی سطح پر بے راہ روی نظر آتی ہے۔ کہیں نوجوان بھٹکے ہوئے ہیں۔ نفرت اور تشدد نے دنیا کو اپنے چنگل میں لے لیا ہے۔ تہذیبی قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں۔ ذوقی نے ایک بہت بڑے کنواس کو بنیاد بنا کر سونامی کی تخلیق کی ہے۔ اقتباس:

''سمندری سیلاب کے لاکھوں متاثرین کی مدد کے لئے جہاز سے
فضائی امداد اور سازوسامان پہنچائے جارہے ہیں ۔۔۔۔۔
حالیہ تاریخ کی بدترین آفات میں سے ایک ۔۔۔۔۔ سمندری
زلزلہ کا قہر ۔۔۔۔۔ ہزاروں اموات ۔۔۔۔۔ حالانکہ سرکاری
اعداد وشمار کے مطابق ۱۸۵۰۰ اموات کی تصدیق کی گئی ہے۔ جن
میں ۳۲۰۰ صرف جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں مارے گئے

> ہیں۔۔۔۔۔انڈونیشیا میں ۱۸۷۷، سری لنکا میں ۳۰۰۰، ملیشیا
> میں ۲۸ اور تھائی لینڈ میں ۱۳۰۰ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔۔۔۔۔
> جبکہ جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں مرنے والوں کی تعداد
> ۳ ہزار سے زائد بتائی گئی ہے۔ زخمیوں کی تعداد لاکھوں میں
> ہے۔۔۔۔۔گذشتہ چالیس برس میں آنے والا شدید ترین اور
> بیسویں صدی کے آغاز سے اب تک کا پانچواں سب سے بڑا
> زلزلہ ہے۔۔۔۔۔نقصان کا اندازہ لگانے میں مشکل پیش آرہی
> ہے۔۔۔۔۔'' الے

یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنی کارکردگی میں گم رہتا ہے۔ وہ خدا کے وجود سے منکر ہوجاتا ہے۔ یا عبادت کے باوجود بھی اسے انسانیت کا سبق یاد نہیں رہتا۔ایک مہذب سماج اورایک مہذب دنیا ترقی کی ریس میں مسلسل تباہیوں کی طرف بھاگ رہی ہے۔اور یہ بھول جاتی ہے کہ ایک ریموٹ خدا کے ہاتھ میں ہے۔خدا زمین کے تماشے دیکھتا ہوا اچانک ایک دن ریموٹ کے بٹن کو دبا دیتا ہے۔قدرتی آفات آہستہ آہستہ ہمارا سچ بنتے جارہے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ذوقی کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ ناول لکھتے ہوئے وہ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات پر باریکی سے نظر رکھتے ہیں۔

خدا کی عظمت کے آگے انسانی وجود کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔اس لئے آندھی،طوفان، زلزلہ، آتش فشاں یا سنامی جیسے حادثات ہمیں باور کراتے ہیں کہ ہم اپنی حد سے تجاوز نہیں کریں گے۔لیکن انسان جب اپنی حد سے آگے نکلتا ہے، آفات اسے اپنا شکار بنالیتے ہیں۔ زندگی کی خوفناک ریس کا حصہ بنتے ہوئے انسان بھول جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں کیوں آیا ہے۔

پروفیسر ایس کے عجیب داستان کا موضوع قدرتی آفات ہے۔آتش رفتہ کا سراغ میں دہشت گردی کو موضوع بنایا گیا ہے۔قدرتی آفات تو کبھی کبھی نازل ہوتے ہیں۔لیکن آج کی بھیانک دنیا میں تیزی سے بڑھتی ہوئی دہشت گردی نے انسانی زندگی کے آگے سوالیہ نشان لگادئے ہیں۔ یہ المیہ ہے کہ انسانوں کے تحفظ کے لئے اسلحے اور میزائل خریدے جاتے ہیں۔اورانہیں اسلحوں سے انسانی ہلاکت کی کہانی بھی لکھی جاتی ہے۔

آتش رفتہ کا سراغ میں دہشت گردی کے تمام پہلوؤں کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دنیا پر معیشت کا بوجھ اس قدر زیادہ ہے کہ اسلحوں کی خرید فروخت میں مہنگائی کا بوجھ عام آدمی پر پڑھ رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ممالک اس ریس میں پستے جا رہے ہیں۔مشرف عالم ذوقی آتش رفتہ کا سراغ میں دہشت گردی کے وائرس کو اور اس کے پس پردہ بدلتی ہوئی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ذوقی کے موضوعات ہمارا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ نئی صدی کے مسائل تلاش کرتے ہوئے ذوقی کے ناول یہ آسانیاں پیدا کرتے ہیں کہ ہم ان کے مطالعہ سے گزر کر آج کے معاشی موضوعات پر ذوقی کے ناول کھرے اترتے ہیں اور ان کی روشنی میں آنے والے وقت کو باآسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔

(4)

تہذیبی ومعاشرتی موضوعات

مشرف عالم ذوقی کے بیشتر ناولوں میں تہذیبی و ثقافتی موضوعات ملتے ہیں۔ ہر معاشرے کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ اسی تہذیب سے انسان کی مخصوص شناخت قائم ہوتی ہے۔ملک ہندوستان کی تہذیب سینکڑوں ہزاروں برس پرانی ہے۔ یہاں کی تہذیبی فضا میں ایرانی ، یونانی ، آریہ،عرب اورترک جیسی قومیں شامل رہی ہیں۔اس کی وجہ سے مختلف تہذیبوں کا عکس اس معاشرے میں نظرآتا ہے۔ ہزاروں برسوں کے سفر کے بعد،یعنی مغلیہ سلطنت کے عروج وزوال ، برٹش حکومت کے دوسو برسوں کے ظلم کے بعد آخر ہندوستان کو آزادی مل گئی ۔ ملک کو آزادی کے بعد نئی منزلوں سے گزرنا پڑا۔اب ملک آزاد تھا۔غلامی کی اخلاقیات دفن ہوچکی تھی ۔آزادی کے بطن سے نئی تہذیب اپنا سر نکال رہی تھی ۔

ذوقی کے ناولوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہزاروں برسوں کی تہذیب کا عکس ان کے ناولوں میں آسانی سے نظر آجاتا ہے۔ یہاں اس بات کا رنج وملال ہے کہ پرانے اقدار کھوتے جارہے ہیں ۔تہذیبوں کا تصادم جاری ہے۔اکیسویں صدی کے چیلنجز نے ہمارے ملک کومتاثر کیا ہے۔

ذوقی کے شروعاتی ناولوں میں عقاب کی آنکھیں شامل ہے۔عقاب کی آنکھیں ۱۴سال کے ایک بچے کی کہانی ہے۔ یہ بچہ جس دنیا میں سانس لے رہا ہے،اس دنیا سے وہ بہت زیادہ خوش نہیں ہے۔ وہ اس دنیا سے فرار چاہتا ہے۔ اور بالآخر ایک دن وہ انسانی آبادی سے دور گھنے جنگل کی طرف ہجرت کر جاتا ہے۔لیکن آخر ۱۴برس کا یہ بچہ اپنے سماج اور معاشرے میں ایسا کیا دیکھ رہا تھا کہ اسے انسانی آبادی کا تیاگ کرنا پڑا۔؟ ۳۰۰ سے زائد صفحات کے اس ناول میں باریک باریک جزئیات کے سہارے ذوقی سماج اور معاشرے کا جو چہرہ دکھاتے ہیں ،اس چہرے سے ہول آتا ہے۔ یہ قیاس حقیقت سے قریب ہے کہ آزادی کے بعد ہمارے معاشرے میں اس حد تک تبدیلیاں آچکی تھیں کہ ناول عقاب کی آنکھیں کا وہ بچہ اپنی ہی دنیا سے بیزار ہو گیا تھا۔اقتباس:-

’’قدرت نے پیدا کرکے انسانوں کو چھوڑ دیا۔ تاکہ وہ اپنے

ڈھنگ سے اچھے اور برے کو سمجھ سکیں۔ اپنے ڈھنگ سے کام
کرسکیں۔ اپنے ڈھنگ سے خود کی شناخت کرسکیں۔ سب سے
پہلے جب دنیا کا وجود عمل میں آیا تھا تو یہاں صرف دو حقیقتیں
تھیں۔منواور شردھا۔آدم اور حوا۔۔۔۔۔'' ۱۲

الف جنگل میں چلا جاتا ہے۔ وہ برسوں جنگل میں زندگی گزارتا ہے۔ جنگل میں رہتے ہوئے اسے انسان اور جانوروں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ انسان جنگل کے لئے نہیں بنایا گیا۔ انسان ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان کو اپنے لوگوں کے درمیان، اپنے سماج اور معاشرے کے درمیان ہی رہنا ہوتا ہے۔ انسان کی شناخت اس کے ثقافتی اور تہذیبی قدروں سے ہوتی ہے۔ الف لوٹ آتا ہے۔ یہ واپسی اپنی تہذیب میں ایک انسان کی واپسی تھی۔ یہاں 'عقاب کی آنکھیں' کا تذکرہ اس لئے ضروری تھا کہ بقول ذوقی ، یہ ناول انہوں نے صرف ۱۷سال کی عمر میں تحریر کیا تھا۔ ۱۷سال کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ ایک نوجوان وقت کے تصادم اور تہذیب و ثقافت کی صدیوں پرانی کشمکش کو سمجھ سکتا ہو۔ لیکن پہلے ناول سے ہی ذوقی نے اپنے ادب کے لئے تہذیبی و ثقافتی موضوعات کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے بعد بتدریج ان کے جو ناول منظر عام آتے رہے، ان ناولوں میں ان موضوعات پر دردمندی کے احساس کے ساتھ نئی فکر کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ذوقی کا ایک نمائندہ ناول 'شہر چپ ہے'، ہے۔ یہ ناول بیس برس کی عمر میں لکھا گیا۔ اس وقت تک ہمارے معاشرے میں بہت حد تک تبدیلیاں آچکی تھیں۔ رشتے تبدیل ہورہے تھے۔ معاشرہ پہلے سے کہیں زیادہ آزاد ہونے لگا تھا۔ ذوقی بدلتے ہوئے معاشرے کے گواہ بن گئے تھے۔ اقتباس:-

''آپ جو سوچ رہے ہیں، ایسا نہیں ہے، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔
ہاں یہ ضرور ہے کہ اس چھوٹے شہر کے لوگ ایک بند کمرے سے
باہر نہیں گئے ہیں۔ وہ مجھے شاستری جی کی فیملی کے ساتھ سنیما ہال
تک تو جاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں مگر ایک آدمی اور ایک خاندان
کے پیچھے چھپے ہوئے بہت سارے مسئلوں کے حل نہیں کھوج
سکتے۔ میں نے کوئی وقت نہیں برباد کیا ہے پتا جی۔ مجھے جو پانا

ہے جو کرنا ہے میں اس کی تیاری میں لگا ہوں۔صرف وہ لمحہ جس
میں ایک چیختا ہوا پریشان حال نوجوان میرے اندر تھا۔میں نے
اس نوجوان کی تسلی کا سامان کیا ہے۔'' ۱۳

ذوقی ایک داستان گو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے سامنے ماضی اور حال کی پوری دنیا روشن ہے وہ اس دنیا سے کہانی مستعار لیتے ہیں۔یہ کہانی اس وقت کی ہے جب ہماری یہ دنیا بہت حد تک پھیلی نہیں تھی۔ تہذیب کے رنگ مختلف تھے۔ناول میں دو بے روزگار دوستوں کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب پیسوں کی خاطر دونوں کسی بچے کو اغوا کرنے کا پروگرام بناتے ہیں۔ایک گاڑی ٹھیک کی جاتی ہے۔اور دوپہر کے وقت ایک خالی پارک سے ایک بچی کو اغوا کیا جاتا ہے۔لیکن بچی کے معصوم سوال ایسے تھے کہ دونوں کو اس بچی پر ترس آجاتا ہے۔یہاں سے دونوں بے روزگار نوجوانوں کی زندگی تبدیل ہو جاتی ہے۔یہ بچی رام اوتار شاستری جی کی بیٹی تھی جو اسکول میں پڑھ رہی تھی۔اس بچی کے ذہن میں دنیا بھر کی فنتاسی تیرتی رہتی تھی۔وہ پارک میں اس لئے گئی تھی کہ کوئی آئے اور اسے اغوا کرلے لیکن وہ اس بات کو نہیں جانتی تھی کہ اغوا کرنے والے معصوم بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ناول جس دور میں تخلیق کیا گیا اس وقت نئی نئی آزادی کی ہوا چلنی شروع ہوئی تھی۔ذوقی کا قلم ان تبدیلیوں کو محسوس کر رہا تھا۔آگے چل کر اغوا کرنے والوں میں سے ایک ملک کا دانشور بن جاتا ہے۔اور دوسرا رام اوتار شاستری کی بڑی بیٹی سے شادی کر کے خوشی خوشی اپنی زندگی گزارتا ہے۔اس ناول کا حوالہ اس لئے ضروری ہے کہ اس دور میں تہذیب کی نئی دستکیں سنائی دینے لگی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب نہ ٹی وی تھا نہ موبائل،اکثر و بیشتر گھروں میں فریج اور ضروریات کی دوسری چیزیں نہیں تھیں۔ترقی اچانک آئی اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گئی۔اس تصویر کا دوسرا خوفناک رخ ذوقی کے ناول 'لے سانس بھی آہستہ' میں نظر آتا ہے۔جہاں بار بار تہذیبوں کا ذکر سنائی دیتا ہے۔اس ناول کے پس منظر میں غلامی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔پھر یہ کہانی موڑ لے کر نئی دنیا کے دروازے تک پہنچ جاتی ہے۔اس ناول میں نور محمد ایک ناقابل فراموش کردار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ناول کے مرکزی کردار کا ردار کو لگتا ہے کہ ساری دنیا اچانک تبدیلی کی نئی ریس میں شامل ہو رہی ہے۔اور اس دنیا میں لگاتار نئے نئے انسان بنائے جا رہے ہیں۔درج ذیل اقتباس اس بات کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے:

> ''ساری دنیا اچانک ایک نئی تبدیلی کی ریس میں شامل ہوگئی تھی۔
> یہاں نئے انسان بن رہے تھے۔ امریکہ میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر
> ہندستانی مریض کا وہیں سے علاج کر رہا تھا۔۔۔۔۔ سائنس
> نئے انسان کی تلاش کے بعد اب موت پر فتح پانے کی تیاری کر رہا
> تھا اور ادھر نئی تکنالوجی، ڈیجیٹل ویڈیو، لیپ ٹاپ میں ایک ولولہ
> انگیز دنیا نئے نتائج سے دوچار ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ کیا تہذیب
> محض مذہب اور جنگ کے درمیان کی چیز ہے۔۔۔۔۔؟ جس
> کی بنیاد میں مذہب اس پر کنٹرول رکھنے کا کام کرتا
> ہے۔۔۔۔۔؟ لیکن مذہب انسانی جسم پر کتنا کنٹرول رکھ پاتا
> ہے؟ دراصل تہذیب جیسی کوئی چیز کبھی تھی ہی نہیں۔ ہاں مذہب
> کے خوف نے الگ الگ تہذیبی سرنگوں کی بنیادیں ڈال دی
> تھیں۔ ادھر خوف کے بادل ہٹے اور ادھر تہذیبوں کے پل ٹوٹنے
> شروع۔'' [۱۴]

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں تہذیب وثقافت ومعاشرت پر کہیں نہ کہیں سیاست کا دخل ہوتا ہے۔ ہماری سیاست بہت حد تک ہماری تہذیب اور معاشرہ کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ذوقی نے لے سانس بھی آہستہ میں جس دور کا حوالہ دیا ہے اس وقت ملک میں انڈیا شائننگ کی بات چل رہی تھی۔ لیکن انڈیا شائننگ نہیں کر رہا تھا بلکہ بچوں سے لے کر عورتیں اور بزرگوں تک نئی تبدیلی کی ہوا تیز تھی۔ وہ بار بار اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ انسان کو فطرت اپنے تحفظ میں لے رہی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے یہی انسان فطرت کے ساتھ کھلواڑ کر رہا ہے، پہاڑ اور درخت کاٹے جا رہے ہیں۔ ندیاں سوکھ رہی ہیں، ماحولیاتی آلودگی بڑھتی جا رہی ہیں فضا میں دھواں اور گیس پھیلتی جا رہی ہے اس ماحول میں ناول کا ایک کردار پہاڑوں کا رخ کرتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہے کہ ہم ان پہاڑوں کے درمیان کا حصہ بن گئے ہیں، دراصل ذوقی یہاں یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ انسان اندر سے بے حس اور سخت ہوگیا ہے۔ وہ اپنی تہذیب اور اپنی اخلاقیات کو بھولتا جا رہا ہے۔

ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' ختم ہوتی ہوئی تہذیب کا خوبصورت اشارہ ہے۔ ناول کا ایک حصہ

انسسٹ پر مبنی ہے۔ انسسٹ آپسی رشتوں میں ہونے والے جنسی تعلقات کو کہا جاتا ہے۔ یہاں مقدس رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس ناول میں ایک مضبوط کردار پروفیسر نیلے کا ہے۔ پروفیسر نیلے اس دنیا کو قریب سے جانتے ہیں۔ اس لئے جب عبدالرحمٰن کار دار کے سامنے نور محمد کا کردار آتا ہے تو وہ حیران نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اب ہمیں مغرب کو برا بھلا کہنا چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ اب یہ برائیاں ہمارے اپنے سماج کا حصہ بن چکی ہے۔ ہمارے بچے اب ہم سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ وہ جنک فوڈ کھاتے ہیں۔ برگر پیپسی اور پیزا ان کی محبوب غذا ہے۔ اور انٹرنیٹ کے فحش پروگرام ان کے نئے دوست ہیں۔ نئے بچوں نے اس خوفناک دنیا میں پناہ تلاش کرلیا ہے۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ سوشل ویب سائٹس اور انٹرنیٹ نے ہماری زندگی پر قبضہ کرلیا ہے۔ انسان اپنی ذات میں اکیلا ہوتا جارہا ہے۔ وہ چاندنی راتیں اور وہ محبت بھرے دن ختم ہو چکے ہیں۔ جب انسان ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا، محبت بانٹتا تھا۔ آج نئی ٹکنالوجی نے اسے بہت حد تک اپنی ذات کے اندر سمیٹ لیا ہے۔ رشتوں کا تقدس پامال ہو چکا ہے۔ اور اسی لئے پروفیسر نیلے کو اس بات کا احساس ہے کہ اب مغرب کو گالیاں دینا بے کار ہے۔ کیونکہ نئی تہذیب ہمارے گلی کوچوں میں حملہ کر چکی ہے۔ ہمارے بچے تہذیب کے نئے رنگ میں رنگ چکے ہیں۔ کوئی دنیا اس سے زیادہ تباہی کے نزدیک نہیں پہنچ سکتی۔ اس اقتباس سے مزید وضاحت ہوتی ہے:

''پروفیسر نیلے مسکرائے۔۔۔۔ 'ڈرو مت کاردار۔۔۔۔
آؤ۔۔۔۔ میرے ساتھ۔ تمہیں وہ دنیا دکھاؤں۔۔۔۔ شاید
اب جسے دیکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔۔۔۔'' کاردار۔۔۔۔
یہ دیکھو۔۔۔۔ اس دنیا کو دیکھو۔۔۔۔ یہاں Google
ہے۔۔۔۔ Facebook ہے۔۔۔۔
Youtube ہے۔۔۔۔ دنیا میں کچھ بھی تلاش کرنا چاہو تلاش
کرسکتے ہو۔۔۔۔۔۔ ڈرو مت۔۔۔۔۔۔ ادھر دیکھو
Google کے اسکرین پر اپنی نظریں مرکوز کرو۔۔۔۔۔۔

دیکھو۔۔۔۔۔ یہاں میں نے لکھ دیا۔ Family

incest اوراب دیکھو۔۔۔۔کلک کرتے ہی ۔۔۔۔فیملی

انسیسٹ کے ہزاروں خانے روشن تھے۔۔۔۔۔‘‘ ۱۵؎

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرف عالم ذوقی نے ’لے سانس بھی آہستہ‘ کے ذریعہ تہذیب وثقافت کے جس تصادم کو پیش کیا ہے، اس کو پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لے سانس بھی آہستہ کے بعد ذوقی نے ’نالۂ شب گیر‘ لکھا۔ اس ناول میں انہوں نے ناہید ناز کے ذریعہ ایک ایسی عورت کا کردار وضع کیا ہے جو عورت مضبوطی کی علامت ہے۔ لیکن یہ عورت اچانک پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ عورت نئی تہذیب کے راستے تیز تیز چلتی ہوئی ذوقی کے ناول میں داخل ہوگئی ہے۔ ناہید ناز کے روپ میں ہماری تہذیب کو نئی عورت مل چکی تھی۔ عورت جسم کی آزادی سے الگ اپنے لئے کچھ زیادہ آزادی کی مانگ کرنے لگی تھی۔ اب وہ مردوں کے ساتھ اپنا موازنہ نہیں کرتی تھی۔ بلکہ وہ زندگی کی ریس میں مردوں سے آگے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ ناول دہلی کے گینگ ریپ سے شروع ہوتا ہے۔ جب انڈیا گیٹ پر گینگ ریپ کے خلاف احتجاج ہو رہا تھا، اس احتجاج میں ناہید ناز بھی شامل تھی۔ یہ ہماری نئی تہذیب کی سوغات ہے کہ ایک طرف عورت اپنی آزادی کے لئے جنگ لڑ رہی ہے اور دوسری طرف ریپ جیسے واقعات میں اضافہ ہو چکا ہے۔ ایک طرف ہم نئی تہذیب اور نئی دنیا کی باتیں کرتے ہیں اور دوسری طرف آج بھی لڑکیوں کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک طرف عورت بااختیار ہونے کی جنگ لڑ رہی ہے اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ عورتوں کو نسل چلانے کیلئے بیٹی سے زیادہ بیٹوں کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے ہمارا سماج آج کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ نئی تہذیب کی آمد کے باوجود کبھی کبھی لگتا ہے کہ ہم پرانے رسم ورواج کے خول سے ابھی آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ ناول سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

’’میں نے آہستہ سے کہا۔۔۔۔۔’یہ سماج ابھی بھی دو حصے میں تقسیم ہے۔ ایک طرف گھنی پرچھائیاں ہیں اور دوسری طرف طلوع آفتاب کا طلسم۔ ’فطرت؟ فطری اصول ۔۔۔۔جسم کی مانگ۔۔۔؟‘ میں نے غور سے ناہید کی طرف

دیکھا۔۔۔آپ انسان ہیں تو یہ مانگیں لازمی ہیں۔مرد ہو یا
عورت ان مانگوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔آپ ابھی
جوان ہیں تو کیا کوئی ایسی مانگ آپ محسوس نہیں کرتیں؟'' ١٦ؔ

یہ سوچنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ہزاروں برس قبل کی دنیا اور قدیم تہذیب سے ہماری دنیا الگ کیسے ہو رہی ہے۔ ایک مدت تک عورت مردوں کی غلامی کے چنگل میں رہی۔ زبان ہوتے ہوئے اس کے پاس زبان نہیں تھی۔ وہ محض نمائش کی چیز بن کر آ گئی تھی۔ وہ خریدی اور بیچی جاتی تھی۔اس کی بولی لگتی تھی۔عورت کو قدیم زمانے میں کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔مردوں کی دنیا میں وہ محض لونڈی اور داسی بن کر زندگی گزار رہی تھی۔شادی کے بعد اس کی زندگی در و دیوار کی قید میں ہی گزر جاتی تھی۔ یہ دنیا ابھی بہت زیادہ نہیں بدلی ہے۔ ہماری دنیا میں آج عورت دو حصوں میں تقسیم نظر آتی ہے۔عورت کی بڑی تعداد آج بھی بندشوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایسی عورتیں ہیں جو اپنی آزادی کے لئے لمبی اڑان چاہتی ہیں۔ اور اکثر بغاوت کر جاتی ہیں مگر ایسی عورتوں کی تعداد کم ہے۔

ہر بار ایک تہذیب پرانی پڑ جاتی ہے۔ ہر بار ایک دنیا ہمارے لئے نئی ہو جاتی ہے۔ ہر بار تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ یہ انسان بھی عجیب ہے۔اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔کبھی کبھی وہ پرانے رسم و رواج کی زد پر ہوتا ہے۔اور کبھی کبھی وہ اپنے لئے کچھ زیادہ آزادی کی مانگ کرتا ہے۔ ہمارا معاشرہ ، ہمارا سماج آہستہ آہستہ بغاوت کی طرف بڑھ رہا ہے۔غور کریں تو اس سماج میں ناہید ناز جیسے کرداروں کی موجودگی بڑھنے لگی ہے۔مرد اس اس معاشرے کا جبر ٹوٹنے لگا ہے کیوں کہ نئی تہذیب نے مردوں کو بہت حد تک کمزور بنا دیا ہے۔ یہ نئی تہذیب کا کمال ہے کہ عورتیں تعلیم سے لے کر سیاست تک ہر مورچے پر کامیاب ہو رہی ہیں۔کسی بھی معاملے میں عورتیں مردوں سے کم نہیں ہیں۔ نالۂ شب گیر کا جنم نئی تہذیب سے ہوا ہے۔ یہ ناول نئی صدی کے اٹھارہ برسوں اور ان برسوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے وجود میں آیا ہے۔ اس ناول نے عورت کو ایک نئی شناخت دی ہے۔

ایک تہذیب بدلتے موسموں کی ہے تو ایک تہذیب فرقہ وارانہ فسادات کی ہے۔'مسلمان' مشرف عالم ذوقی کا مشہور ناول ہے۔اس میں جنگوں کی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے۔افروز کی پیدائش ایک طوائف کے گھر

میں ہوئی ۔لیکن افروز طوائف نہیں بننا چاہتی تھی ۔اس کا اس ماحول میں دم گھٹتا تھا۔آ گے چل کر ناول میں دو دوستوں کا کردار آ تا ہے ۔ان میں ایک ہندو ہے اور دوسرا مسلمان ۔ایک کا نام شعیب ہے اور دوسرے کا ونئے دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں ۔ایک چھت کے نیچے رہتے ہیں ۔اور اپنی تعلیم مکمل کر رہے ہیں ۔لیکن اسی درمیان ملک میں مختلف جگہوں پر فسادات کے موسم چھا جاتے ہیں ۔ ملک فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں ہوتا ہے۔ اور اس کی آگ اتنی بھیانک ہوتی ہے کہ ونئے اور شعیب کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے ۔ناول میں بہت سے سوال اٹھائے گئے ہیں ۔طوائف علامت کے طور پر سامنے آتی ہے ۔ایسا لگتا ہے جیسے مسلمانوں کو وفاداری کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑی ہو اور وہ معاشرے میں طوائف کی طرح اچھوت بنا دئے گئے ہوں ۔ناول سے یہ اقتباس:

''دروازے پر سچ مچ دستک ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ اتنی رات گئے ۔ چہرے پر خوف پیدا ہوا۔ اس بار دستک کے ساتھ لرزتی ہوئی آواز بھی گونجی تھی۔۔۔۔۔''افروز۔۔۔۔۔ دروازہ کھولو۔۔۔۔۔'' ش۔۔۔ع۔ب۔۔۔۔وہ ایک دم سے چونکی ۔۔۔۔ بھاگتی ہوئی جاکر اس نے دروازہ کھول دیا۔دروازے پر پسینے سے شرابور شعیب کھڑا تھا۔۔۔اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔۔۔''دروازہ بند کرلو۔'' ''شعیب۔۔۔۔ یہ سب۔۔۔۔ اتنی رات گئے ۔۔۔۔''''میں۔۔۔۔میں نے ونئے کا قتل کر دیا۔''اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔۔۔۔''ہاں میں نے ونئے کی ہتیا کر دی۔'' [1]

جنگیں اور فرقہ وارانہ تہذیب کا موسم کچھ اس حد تک مسلمانوں پر مسلط کیا گیا کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کا جینا دوبھر ہو گیا۔ پاکستانی ہونے کا تمغہ ان کے گلے میں لٹکا دیا گیا۔آر ایس ایس جیسی ہندو تنظیمیں مسلسل ان کی وفاداری پر شک کرتی رہیں ۔عدم تحفظ کا احساس مسلمانوں کے درمیان بنا رہا اور وہ کبھی اس احساس سے

باہر نہیں نکل سکے۔

تہذیب ومعاشرت ، یہ موضوعات مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کے لئے نئے نہیں ہیں۔ پہلے ناول 'عقاب کی آنکھیں' میں ذوقی نے نہ صرف اس مسئلے پر گفتگو کی ہے بلکہ مذہب کے تعلیق سے فلسفہ، عمرانیات، معاشرت، اخلاقیات اور معاشیات کے باب میں نئے مکالموں کا اضافہ کیا ہے۔ تہذیب وثقافتی موضوع پر پوکے مان کی دنیا اور لے سانس بھی آہستہ کافی اہم کہے جاسکتے ہیں۔ قدیم وجدید تہذیب کا موازنہ اور نئی صدی کے واقعات وحادثات سے نئے نئے سوال پیدا کرنا ان کی ایک بڑی خوبی ہے۔ یہ موضوعات نئی صدی کے دروازے پر براہ راست دستک دیتے ہیں اور ہمارے لئے کئی بڑے سوال چھوڑ جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معاشرت اور ثقافت جیسے موضوعات پر ذوقی کو دسترس حاصل ہے اور ان موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے ہر بار انہوں نے اپنے ناول کے لئے نئی فضا کا انتخاب کیا ہے۔ موضوع کا نیا پن ان کے ادب کو خاص بنا دیتا ہے۔

(5)

مذہبی موضوعات

مذہب کا دائرہ وسیع ہے۔ مذہبی موضوعات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔اس میں علم فلسفہ شامل ہے۔ ظاہر ہے مذہب انسان کوسنوارنے ،اس کی اخلاقیات کو بہتر بنانے ، زندگی کو سلیقہ سے جینے کا ہنر دیتا ہے۔اس طرح مذہبی موضوعات میں علم اخلاقیات کو شامل کیا جاتا ہے۔اخلاقیات کا ایک تصور یہ ہے کہ وہ معاشرے میں تہذیب کی پاسداری کرے۔ مذہب بھی اخلاقیات کے باب میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔علم عمرانیات مذہب کا ہی ایک حصّہ ہے اس کا موضوع معاشرہ ہے۔اس کا مسئلہ یہ ہے کہ معاشرہ کیسے وجود میں آتا ہے؟ کیسے ترقی کرتا ہے؟ اور کیسے زوال پذیر ہوتا ہے؟ سیاست سے معیشت تک مذہب زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں ہے۔ مشرّف عالم ذوقی کے ناولوں میں مذہبی امور سے متعلق خیالات کی بازگشت موجود ہے۔ نیلام گھر میں اسلام کی خوبیوں کا احاطہ کیا گیا تو پروفسر ایس کی عجیب داستان میں پچاس صفحے پادری جوزف کے اردگرد گھومتے ہیں۔

پروفیسر ایس کی عجیب داستان، یہ کہنا مشکل نہیں کہ یہ ناول ہزاروں برس کی داستان پر محیط ہے۔سونامی کا عذاب کوئی ایک دن میں نہیں آیا۔ایسے عذاب قدرت کی طرف سے پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ لیکن انسان گناہوں کا پتلا بن چکا ہے۔ دنیا میں جرم بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ انسانیت ختم ہو چکی ہے۔لوگ مذہب کو مانتے ہیں لیکن مذہب کے بتائے گئے راستوں پر نہیں چلتے۔ دولت کی فراوانی ہے۔انسان اپنی زندگی عیش وعشرت میں بسر کررہا ہے۔اور پھر ایک دن خدا سونامی بھیج دیتا ہے۔ پروفیسر ایس کی عجیب داستان کی کہانی پر غور کریں تو پروفیسر ایس کا ایک ایسا چہرہ ہمارے سامنے آتا ہے جو انسانیت کے لئے کلنک ہے۔ پروفیسر ایک بڑا دانشور ہے مگر اس کے اندر ایک بیڈ مین یا ویلن رہتا ہے۔ پروفیسر ایس ظلم کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔اس کی محبت انوکھی ہے۔وہ سیما سے پیار کرتا ہے۔لیکن نہیں چاہتا کہ چاند یا روشنی کی کرنیں سیما کا دیدار کریں۔ وہ سیما کو گھر کی چاردیواری میں قید رکھتا ہے۔اور سیما اس گھر کے اندر زبردست گھٹن محسوس کرتی ہے۔ پروفیسر اپنی تعریف سننا پسند کرتا ہے۔ جو لوگ اس کے قصیدے پڑھتے ہیں ان کو وہ پیسوں سے

نوازتا ہے۔اور جو اسے پسند نہیں کرتے ، وہ انہیں اس دنیا سے ہی غائب کرادیتا ہے۔ پرویز سانیال اس ناول کا اہم مرکزی کردار ہے۔اس کا باپ غریب ہے،مگر باپ چاہتا ہے کہ پروفیسر ایس جیسا دانشور اس بچے کو کچھ بنادے۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ پروفیسر ایس پرویز سانیال سے ملتا ہے اور دم بخود رہ جاتا ہے۔ پرویز پروفیسر کا بھی نام تھا۔ دونوں کے چہروں میں مشابہت تھی۔ پروفیسر پرویز کو تربیت دینے کا وعدہ کرتا ہے مگر اپنی خوفناک شرط رکھ دیتا ہے۔اس درمیان ناول میں ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جو بدلتے ہوئے انسان کا مکروہ چہرہ پیش کرتے ہیں۔ دنیا ترقی کررہی ہے۔سائنس اور ٹکنالوجی کی دوڑ میں دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ہم خدا اور اس کے وجود کو اگر مانتے ہیں تو اس کے پیچھے صرف ہماری غرض ہوتی ہے۔ جب عالمی موسم پر خونی بادل منڈلاتے ہیں تو پرفیسر پادری سے ملنے آتا ہے۔

چرچ کا پادری پروفیسر ایس کو ایک مقدس دنیا میں لے جاتا ہے۔ پروفیسر کو اچانک احساس ہوتا ہے کہ اس کا قد چھوٹا ہوگیا ہے۔مقدس کتابوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔آسمان سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ پروفیسر سوچنا شروع کرتا ہے کہ کیا اس سے کچھ غلطی ہوئی ہے۔اس نے کوئی گناہ کیا ہے۔صدیوں کی کیسی برف ہے، جو انسانی گناہوں کا بوجھ سمیٹ کر، پگھل کر سونامی بن گئی ہے۔ پروفیسر کو پرانی زندگی یاد آتی ہے۔ برسوں پیچھے چھوٹا ہوا بچپن یاد آتا ہے۔اور ادھر ایک کہانی پرویز سانیال کے باپ کی ہے۔ وہ بہار مظفر پور سے ہجرت کر کے کلکتہ آیا تھا۔کلکتہ میں وہ نکسلائٹ تحریک کے ہاتھ چڑھ گیا۔ یہاں سے ہوکر اس کی ملاقات ادیتی سانیال سے ہوتی ہے۔ وہ وہیں رہنے لگتا ہے۔ اور وہاں نماز کی ادائیگی کرتا ہے۔ ادیتی کو اس پر پیار آجاتا ہے۔ دونوں شادی کرلیتے ہیں۔اور پھر پرویز پیدا ہوتا ہے۔اب اس کے پاس نئی زندگی ہے۔لیکن اس کی خواہش ہے کہ اس کا بیٹا پرویز سانیال بہت بڑا آدمی بنے۔لیکن وہ اس بات سے واقف نہیں ہے کہ دراصل وہ اپنے بیٹے پرویز کو ایک قصائی کے حوالے کررہا ہے۔ پرویز سانیال کی تربیت شروع ہوتی ہے۔اور موسم کا مزاج بدلنا شروع ہوجاتا ہے۔ پروفیسر کو اپنی پرانی زندگی سے بہت کچھ یاد آجاتا ہے۔مثلاً:

''آہ،موسیو' پروفیسر ایس اتنے آہستہ سے بڑبڑایا کہ بہت قریب
ہوتے ہوئے بھی پادری تک اُس کے الفاظ کی رسائی نہ
ہوسکی۔۔۔۔ آنکھوں کے آگے شیشے کا ایک لامتناہی سمندر

ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔۔۔۔اور اُس کی لہروں سے آگ کے شعلے

اٹھ رہے تھے۔‘‘ [۱۸]

ذوقی نے پروفیسر ایس کے کردار کے طور پر ایک ایسے کردار کی تخلیق کی ہے جس کو اردو ادب میں کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ ہر ظالم اور تانا شاہ کی طرح پروفیسر کا بھی ایک ماضی ہے۔ پروفیسر اس ماضی سے دور نہیں بھاگ سکا۔ ذوقی ماہر نفسیات ہیں وہ ایسے کرداروں کے اندر داخل ہو کر علم نفسیات کے باریک سے باریک پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔ پروفیسر کے اندر ایک بزدل انسان بسا ہوا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبراتا ہے لیکن تنہائی اس کی مجبوری ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب کسی بھی قید خانے کا تصور اسے پاگل کر دیتا ہے۔ اگر کھڑکی یا دروازے نہ ہوں تو وہ اس کمرے میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ بیماری اس حد تک بڑھتی ہے کہ اسے ہوائی جہاز اور بند بند کمروں سے ہول آنے لگتا ہے۔مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں بار بار مذہب کا حوالہ دیا ہے۔

ناول ’نیلام گھر‘ میں تیزی سے پھیلتی ہوئی بدبو کو علامت اور استعارے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں مذہب کا خوف دکھایا گیا ہے۔ جب دنیا میں گناہ بڑھ جاتے ہیں، خدا آسمان سے عذاب بھیجا کرتا ہے۔ ناول نئے ماحول کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔کریم بیگ اس ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ جو ایک آفس میں کام کرتے ہیں۔آفس کا ماحول علامتی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہاں جو لوگ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں ان لوگوں کے درمیان خدا کی کوئی حیثیت یا وجود نہیں ہے۔ یہ تمام لوگ خدا کے منکر ہیں۔آفس میں باس کا ایک کردار ہے جو عیاشیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔کریم بیگ کے ریٹائرمنٹ میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں مگر ایک وقت ایسا تھا جب وہ آفس والوں کی زندگی کا عام حصہ بن گئے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ ہنگامے کرتے تھے۔مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی خدا کا خوف ان پر طاری ہوتا گیا۔ جب پہلی بار وہ بدبو کی زد میں آئے تو شدت سے انہیں اپنے مذہب کا خیال آیا۔اس خیال کو ناول نگار نے اس طرح پیش کیا ہے:

’’اور کریم بیگ کو یاد آیا۔۔۔۔جب پہلی بار اُنہوں نے کمرے
کی گرد ہٹائی تھی ۔۔۔۔قرآن پاک کی دھول جھاڑی تھیں
۔۔۔۔رحل کو صاف کیا تھا۔تسبیحیں دوبارہ مضبوطی سے تھام لی

تھی ۔اور اپنے اخلاق کی کمزوریوں پر فتح پا کر بشاش قدموں
سے آفس گئے تھے۔۔۔۔تو رگھوبیر، رتھ اور مائیکل کی آنکھیں
تعجب سے پھیلتی چلی گئیں۔۔۔۔رتھ نے اس کا راستہ روک دیا
تھا۔۔۔اوراس کی پیٹھ پر ایک زوردار دھپ لگا کر بے حیائی
سے بولا تھا۔۔۔کیوں بے! تو بھٹک رہا ہے کیا۔۔۔؟'' 91

کریم بیگ کا نیا چہرہ آفس والوں کو پسند نہیں آیا۔ کیونکہ آفس والوں کی نظر میں وہ بدل چکے تھے۔ سب سے پہلے رگھوو بیر ان کے راستے کو روک کر کھڑا ہوا۔ پھر یہ بات ان کے باس تک پہنچ جاتی ہے۔ادھر بدبو پھیل رہی ہے۔اور ادھر کریم بیگ اپنے آپ سے مطمئن ہیں کہ اب وہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔انہیں بچپن یاد آتا ہے جب وہ اپنے والد بزرگوار کی انگلیاں تھامے مسجد جایا کرتے تھے۔ پھر وقت گزرا، شادی ہوئی لیکن گھر کا ماحول بدل چکا تھا۔ وہ نئے حالات میں ڈھل چکے تھے۔اس گھر میں مذہب کا کوئی تصور باقی نہیں تھا۔ انجم ان کا بیٹا بھی اسی راستے پر چل نکلا مگر وہ کبھی اپنے بیٹے کو مذہب کے راستے پر چلنے کی تلقین نہیں کر سکے۔ جب بدبو کا حملہ ہوتا ہے تو تمام پرانے دن کریم بیگ کو یاد آ جاتے۔

ناول 'نیلام گھر' میں ایک اہم کردار مس نیلی کا ہے۔مس نیلی باس کی منظورِ نظر کہی جاتی تھی۔ نیلی کو کئی بار کریم بیگ نے سمجھانے کی کوشش کی۔مگر نیلی ہمیشہ اس سے دور دور رہی۔اور آخر ایک دن مس نیلی کا قتل ہو جاتا ہے۔ پولیس کو مس نیلی کی لاش ملتی ہے۔کریم بیگ کا احتجاج رنگ لاتا ہے۔ایک دن وہ آفس چھوڑ کر مسجد کی امامت قبول کر لیتے ہیں۔لیکن اس درمیان بدبو کا قہر جاری رہتا ہے۔کہانی میں واقعات کا تسلسل ایسا ہے کہ قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔ جب کریم بیگ مذہب کا سہارا لیتے ہیں تو اچانک پیغمبروں کی کہانیاں انہیں یاد آنے لگتی ہیں۔فتنہ اور فساد ہر زمانے میں ہوا۔حضرت نوح کے زمانے میں بھی۔حضرت نوح کو اپنے لوگوں کے لئے ایک بڑی سی کشتی بنانا پڑی۔ پھر خدا نے اپنا عذاب بھیجا۔زبردست عذاب آیا۔ جو منکر تھے وہ خدا کے عذاب کا شکار ہوئے۔ جیسا کی اس اقتباس سے ظاہر ہے:

''حضرت نوحؑ کے زمانے میں بھی ایسا ہی فتنہ اور فساد برپا ہوا۔
نوحؑ نے سمجھایا مگر لوگ مخالفت پر اتر آئے۔۔۔۔زہریلے بیج

بوتے رہے۔فتنہ بپا کرتے رہے کہ یہ وہی تھے۔وہی۔۔۔۔جو
عوام پر حکومت کرنے والے تھے۔۔۔۔جو خود سر تھے جنہیں اپنی
سیاست کے ختم ہو جانے کا خدشہ تھا ...... تو زوروں کی بدبو
پھیلی۔۔۔۔اور اُن کی چیخیں آسمانی پردوں میں سما گئیں۔'' کہ
اے نوحؑ! اگر تم واقعی سچے ہو تو ہم پر عذاب لاؤ۔۔۔۔جس
سے تم ڈرایا کرتے تھے۔۔۔۔'' [۲۰]

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی موضوعات کو بیان کرنے میں مشرف عالم ذوقی کامیاب ہیں۔ مسلمان، ذبح، شہر چپ ہے جیسے ناولوں میں اخلاقیات اور مذہب کی بلند سطح نظر آتی ہے۔ بیان اور آتش رفتہ کا سراغ کے پس منظر میں مذہب حاوی ہے۔ ان دونوں ناولوں میں مذہب کے بگڑے ہوئے رجحان کو پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں سیاست، مذہب کا حصہ ہے۔ سیاست ہندو اور مسلمان کے مابین دیوار کھڑا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ مذہب کا غلط استعمال ہے جس سے آزادی کے بعد کا ہندوستان دوچار رہے۔ نیلام گھر اور پروفیسر ایس کی عجیب داستان میں مذہب کو ہی زندگی جینے کا صحیح راستہ کہا گیا ہے۔ اور نئے سوال پیدا کئے گئے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ مذہبی موضوعات پر لکھتے ہوئے ذوقی نے کہیں بھی اپنی فکر سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ مذہب ان کے ناولوں میں ایسا استعارہ ہے جو زندگی سنوارنے کے کام آتا ہے۔

(حواشی)

۱۔مشرف عالم ذوقی ، ناول ۔ بیان، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۳

۲۔مشرف عالم ذوقی ، ناول ۔ بیان، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۲۵۔۲۴

۳۔مشرف عالم ذوقی ، ناول ۔ بیان، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۲۹۔۲۸

۴۔یونس خاں، ذوقی تخلیق اور مکالمہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۰۔۳۹

۵۔تسنیم فاطمہ، ذوقی تخلیق اور مکالمہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۵۔۳۶

۶۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۵

۷۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۶

۸۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۷

۹۔تسنیم فاطمہ، ذوقی تخلیق اور مکالمہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۶۷

۱۰۔مشرف عالم ذوقی ، نالۂ شب گیر، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۸

۱۱۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۲۵

۱۲۔مشرف عالم ذوقی ،عقاب کی آنکھیں، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۳۱۴

۱۳۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۹۸

۱۴۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۶۵

۱۵۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۳۰

۱۶۔مشرف عالم ذوقی ، نالۂ شب گیر، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۳۹۳

۱۷۔۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹڈ ص۔۱۵۴

۱۸۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۸۳

۱۹۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۴۱

۲۰۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۵۶۔۱۵۵

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا فنی تنقیدی تجزیہ

۵.۱۔ پلاٹ

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں پلاٹ کو پیش کرنے سے پہلے ایک سرسری نظر پلاٹ کی تعریف پر ڈالنی چاہئے۔

جب مختلف واقعات کو ایک فطری مسلسل بامعنی و باطنی ربط و آہنگ اور ہم آہنگی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے تو اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ پلاٹ میں اسباب وعلل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پلاٹ واقعات کے ایک پورے ڈھانچے کا نام ہے۔کسی بھی ناول کی کامیابی کی دارمدار بڑی حد تک اس کے پلاٹ پر منحصر ہوتا ہے۔ پلاٹ جتنا گھتا ہوا اور مربوط ہوگا اس قدر وہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔ناول میں پلاٹ کے واقعات کو مختلف انداز سے ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ ہر ناول میں پلاٹ کی ترتیب وتنظیم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پلاٹ بنانا ایک قسم کا فن تعمیر ہے اور اچھے پلاٹ والے ناول کا ہر حصہ اس طرح تعمیر ہوتا ہے جیسے کسی عمارت کے الگ الگ حصے۔ایک سیدھا سا پلاٹ بنانا ویسا ہی ہے جیسے کوئی بت تراش کچھ خاص فنی قاعدے کے مطابق کسی پتھر کی سل کو تراش کر ایک خوش نما بت بنائے مگر خوبی یہ ہے کہ اس میں بناوٹ کا اثر یہ ہو جیسے کسی بت تراش کے بت کا اصل سے مطابق ہونا ضروری ہے۔ ویسے ہی پلاٹ کا کسی اصل قصہ کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ پھر جیسے تراشے ہوئے بت میں حقیقت کے ساتھ حسن یا دل کشی ضروری ہے۔ ویسے ہی ناول کے پلاٹ میں ایک فنی حسن وخوبی کا وجود لازم ہے الغرض پلاٹ کی بناوٹ جتنی زیادہ دل کش ہوگی اتنا ہی اچھا پلاٹ ہوگا۔ بقول ای۔ایم فورسٹر:

> ’’ہماری زندگی دو زندگیوں سے مل کر بنی ہے، ایک زندگی وقت کے حساب سے اور دوسری کچھ خاص قدروں کے حساب سے۔لیکن ناول وہی اچھا ہے جس میں دوسرے قسم کی زندگی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ناول کی ادبی اہمیت اس کی کردار نگاری پر منحصر ہے اور اگر کوئی ناول نگار کردار نگاری کی قوت نہیں رکھتا تو وہ صیح معنی میں ناول نگار کہلائے

جانے کے لائق نہیں ہے۔'' [1]

جب ہم مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کے پلاٹ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے ناولوں کے پلاٹ پیچیدہ ہیں۔جس کی مثال ہمیں ناول ''نیلام گھر''، ''آتش رفتہ کا سراغ''، اور ''لے سانس بھی آہستہ'' میں ملتا ہے۔ہم ان تینوں ناولوں کا ایک کے بعد ایک کا مختصر جائزہ پلاٹ کے حوالے سے لیں گے۔

پہلے ہم مشرف عالم ذوقی کے ناول ''نیلام گھر'' کے پلاٹ کا جائزہ لیں گے۔مشرف عالم ذوقی کے ناول ''نیلام گھر'' کا پلاٹ پیچیدہ ہے۔اس میں سماج و سیاست کی مختلف منزلیں اور اس میں شامل مختلف سیاسی ونظریاتی دھارے اور واقعات وحادثات سے اس ناول کا پلاٹ ترتیب دیا گیا ہے۔اس ناول کے پلاٹ میں تنظیم وترتیب اور ربط وتسلسل کا ایسا التزام ہے جس سے قاری پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

ناول کا پلاٹ سیاسی واقعات،سماج میں پھیلی برائیوں، دفتروں میں افسر شاہی، پولیس کے ظلم و جبر،عورتوں کا استحصال اور آج کل کے رونما ہونے والی سیاسی چالوں پر مشتمل بندھا ٹکا ہے۔

''نیلام گھر'' میں پلاٹ موضوع اور کرداروں پر مشرف عالم ذوقی کی مضبوط گرفت نے اس ناول میں ایک ایسی کشش اور تاثیر پیدا کر دی ہے کی قاری کو ایک لمحے کے لئے دور نہیں ہو پاتا۔

اس ناول کے مطالعے سے پہلے حصے میں ہی جہان پور کے ہندو مسلم فسادات کی اطلاع کریم بیگ کو ملتی ہے اور وہ اس خبر پر افسردہ ہو جاتا ہے۔

> ''ابا۔۔۔جہان پور میں پھر ہندو مسلم فساد ہو گیا۔اس کا انداز ایسا تھا کہ کریم بیگ نے محسوس کیا، جیسے انجم چھپتے ہوئے طنز آمیز نظروں سے کہہ رہا ہو۔۔۔ابا لیجئے ملک کا ایک اور تحفہ۔۔۔۔ابا کیا ان پاگلوں ،احمقوں کو مذہب کے نام پر فسادات سے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔۔۔۔ابا کیا دنیا میں ایک اور صرف ایک مذہب کا قیام ممکن نہیں ہے جس کو متفقہ طور پر سب لوگ مان سکیں۔'' [2]

پھر ناول نگار ہمیں فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے ماضی میں لے جاتا ہے۔ جہاں انہوں نے ہمیں انجم جیسے بزرگ کے ذریعے سماج میں پھیلی تیز بدبو جو زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی ہے اور آزادی کے بعد کے ہندوستان کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

کہانی میں بہت سے واقعات ایک کے بعد ایک نمودار ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے بڑی ہی ہوشیاری سے ان واقعات کو ایک ہی لڑی میں جوڑا ہے۔ کہانی میں کبھی یہ نہیں لگتا یہ کیوں اور کیسے ہو گیا۔ اس طرح سے کہانی میں تمام واقعات کے اسباب وعلل موجود ہیں۔

یہ ناول ابتدا ہی میں قاری کو تجسس کی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے اور نیلام گھر کے کریم بیگ اور انجم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کہانی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ اور قاری تمام حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے۔

کہانی کہنے کے فن میں مشرف عالم ذوقی کو مہارت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر واقعہ دوسرے واقعہ کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس ناول کو پلاٹ میں متعدد ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو کہانی کو دلچسپ بنانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں۔

''نیلام گھر'' کے پلاٹ کی کامیابی کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ آغاز سے انجام تک دلچسپی اور تجسس کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ یہ ناول مربوط پلاٹ اور اثر انگیزی کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ ناول پلاٹ کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے لحاظ سے ایک کامیاب ناول ہے۔ یہ ناول واقعات کے اعتبار سے سیاسی، سماجی اور فرقہ وارانہ فسادات کی حقیقی تصویر کشی کرتی ہے۔ مختلف واقعات کو انہوں نے کرداروں کے ذریعے بخوبی پیش کیا ہے جس سے واقعات و کردار کے درمیان ہم آہنگی برقرار رہی ہے۔ اسی لئے ناول کے مطالعے میں دلچسپی اور تجسس کی کیفیت شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس طرح ''نیلام گھر'' کا پلاٹ مربوط اور سلجھا ہوا ہے۔ مصنف نے جس ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ان کی تخلیقی وفنی صلاحیت کو روشن کرتا ہے۔ مصنف نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بڑی ہی بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''آتش رفتہ کا سراغ'' ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول کا پلاٹ پیچیدہ

ہونے کے ساتھ ساتھ مربوط اور سلجھا ہوا ہے۔ ناول کا آغاز بٹلہ ہاؤس کے دلکشا انکلیو میں رہنے والے ارشد پاشا کے خاندان سے ہوتا ہے جہاں ان کی بیوی، باپ اور بیٹا اسامہ بھی رہتے ہیں۔ ارشد پاشا خود ایک صحافی ہیں۔ بابری مسجد کا فیصلہ آنے والا ہے اور ہر ایک کے دل و دماغ پر خوف اور ڈر طاری ہوا ہے۔ اسی دوران ایک انکاؤنٹر ہوتا ہے جس میں بہت سے بے گناہ لڑکے مارے جاتے ہیں اور ان لڑکوں میں اسامہ کے دوست بھی شامل تھے۔ یہ ملک کا سب سے بڑا انکاؤنٹر تھا۔

اسامہ کا دوست علوی ہے جس کو پولیس حراست میں لیتی ہے اور ارشد پاشا جو اسامہ کے والد ہیں وہ ڈر جاتے ہیں کہ کہیں اسامہ کو پولیس گرفتار نہ کر لے اور ارشد پاشا اسامہ کو ڈر کی وجہ سے اپنے ایک دوست تھاپڑ کے گھر بھیج دیتا ہے۔ پولیس اسامہ کو تلاش کرتی ہے۔ لیکن اسامہ کو یہ قطعی منظور نہیں کہ وہ پولیس کے ڈر اور خوف سے جیے۔ اس لئے وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور انسانیت کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے گھر میں ماتم چھا جاتا ہے۔ اسامہ کی ماں جس این۔ جی۔ او میں کام کرتی ہے سیاسی لیڈر اس این۔ جی۔ او میں اپنی سازشیں رچا کر اس کو بند کرانا چاہتے ہیں۔ اسی دوران بابری مسجد کا فیصلہ سامنے آتا ہے جو کہ مسلمانوں کے حق میں نہیں ہوتا ہے جو تینوں فرقوں کو خوش کرنے کے لئے تھا اور فیصلہ سننے کے بعد علوی کے والد کو ہارٹ اٹیک آ کر ان کا انتقال ہوتا ہے۔ پھر اس کی لاش کے ساتھ سیاست کا گندہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ ''میر صاحب'' علاقے کے لیڈر تھے اور ان کی تجویز کو اپناتے ہوئے لاش کو چوک میں رکھ کر اس کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ جو کہ بے سود ہوتا ہے۔ اس ناول میں تھاپڑ ارشد پاشا کا قریبی دوست ہوتا ہے جو ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے لیکن جب تھاپڑ کے چہرے سے نقاب اٹھتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تھاپڑ کون ہے اور اس کے گینگ (Gang) کا کیا مقصد ہے۔ ارشد پاشا ایک وکیل سے ملنے جاتا ہے تاکہ وہ اسامہ کو ڈھونڈنے میں اس کی مدد کرے لیکن ارشد پاشا اس میں ناکام ہوتا ہے۔ ناول کا اختتام بہت ہی حیرت انگیز انداز میں ہوتا ہے اور قاری بہت دیر تک ایک عجیب سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔ یہاں ارشد پاشا کی تلاش ختم نہیں ہوئی اور ایک نئی تلاش کی شروعات ہوتی ہے۔ اس ناول میں ہندوستانی مسلمانوں کے کرب کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح لوگ پولیس اور حکومت کی ظلم و زیادتی، بے سکونی اور بے اطمینانی کی آگ میں جل رہے ہیں۔

ذوقی نے اس وقت ملک میں مسلمانوں کی جوصورت حال ہے اس کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس ناول کے پلاٹ میں ربط وتسلسل کا پورا عکس ملتا ہے۔جس سے قاری کے دل ودماغ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ناول کا پلاٹ سیاسی حالات، واقعات ،مسلمانوں کوشکار بنائے جانے کی واردات پولیس کے ظلم وجبر اور آج کل کی سماجی چالوں پر مشتمل ہیں۔

ناول ''آتش رفتہ کا سراغ'' میں پلاٹ ،موضوع اور کردار کی وجہ سے ذوقی نے اس ناول میں ایک ایسی کشش پیدا کی ہے جو قاری کو کبھی اپنے سے الگ ہونے نہیں دیتی۔

کہانی میں بہت سے واقعات ایک کے بعد ایک سامنے آتے ہیں۔ناول نگار نے بڑی ہی فنکارانہ انداز سے ان واقعات کو ایک ہی لڑی میں پروتا چلا جاتا ہے۔انہوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کا بھی ہندوستان دکھانے کی کوشش کی ہے۔ناول کا ٹرننگ پوائنٹ اب شروع ہوتا ہے جب آزادی کے بعد سے لے کر اب تک مسلمانوں کو ہی قصوروار ٹھہرایا گیا ہے:

> ''گاندھی جی کا قتل ہوتا ہے۔۔۔مسلمان اپنے اپنے گھروں میں بند ہوجاتے ہیں۔(کیوں) کیسا خوف ہے یہ؟۔۔۔۔۔اگر کسی مسلمان نے قتل کیا ہے تو؟) برسوں بعد اندرا گاندھی کا قتل ہوتا ہے۔ مسلمان ایک بار پھر اپنے گھروں میں بند۔۔۔۔(کیوں؟) راجیو گاندھی کا قتل ہوتا ہے، جب تک قاتلوں کی خبر نہیں آجاتی، پورا مسلم معاشرہ دہشت اور خوف کے خیمے میں رہتا ہے کہ اب فساد شروع۔۔۔۔(کیوں؟)'' ۳۶

یہ وہ دور تھا جب مسلمان نام سے بھی ڈر لگتا تھا، جب لوگ نماز پڑھنے سے ڈرتے تھے۔غرض مسلمان ہونے کی ہر نشانی سے ڈر لگتا تھا اور شاید ارشد پاشا کو اسی لئے اپنے بیٹے اسامہ کے بدلنے سے ڈر لگنے لگا تھا کیوں کہ اس دور میں اسامہ جیسے نوجوانوں کو دہشت گرد کا الزام دے کر پولیس حراست میں لیتی تھی۔

> ''میں رباب سے پوچھتا ۔۔۔۔۔کہاں گیا ہے اسامہ ۔۔۔۔۔؟ مسجد لیکن یہ مسجد جانے کا کون سا وقت ہے۔۔۔۔۔

؟باہر سے جماعت آئی ہوئی ہے۔اس کے دوست آئے تھے۔
وہی اُس کو لے کر چلے گئے۔۔۔۔۔،جماعت۔۔۔۔۔؟میں
خوفزدہ لہجے میں پوچھتا۔۔۔جماعت سے اُس کا کیا
کام۔۔۔۔۔؟'' ۱۳؎

یہ ناول شروع سے ہی قاری کو تجسس کی کیفیت میں غرق کر دیتی ہے۔آتش رفتہ کا سراغ کے ارشد پاشا اور اسامہ سے جانکاری حاصل کرنے کے لئے اس کی چاہت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس کے بعد با قاعدہ طور پر کہانی کی شروعات ہوتی ہے۔اور قاری ساری حقیقتوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔اس ناول کے پلاٹ میں متعدد ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جو کہانی کو دلچسپ بنانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔اس ناول کے پلاٹ کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک تجسس کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔یہ ناول مربوط پلاٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اثر انگیزی کے اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔یہ ناول واقعات کے اعتبار سے سیاسی،یعنی ہندوستان کی دونوں حکومتوں،بھاجپا اور کانگریس اور ساتھ ہی ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کی عکاسی کرتا ہے۔جس سے کرداروں اور واقعات کے بیچ ربط وتسلسل اور ہم آہنگی برقرار رہی ہے۔اسی لئے قاری کی توجہ شروع سے لے کر آخر تک قائم رہتی ہے۔اس طرح ناول ''آتش رفتہ کا سراغ'' کا پلاٹ بے حد پیچیدہ ہونے کے علاوہ مربوط،اثر انگیز اور سلجھا ہوا ہے۔ناول نگار نے جس توانائی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ انکی فنی کاوشوں کو اجاگر کرتا ہے۔مصنف نے اس ناول میں آزادی سے لے کر اب تک کے مسلمانوں کی حالات کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

لے سانس بھی آہستہ:۔

اس ناول کا پلاٹ کافی پھیلا ہوا ہے،پیچیدہ اور بے شمار مسائل اور متنوع موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔مشرف عالم ذوقی کی تکنیک ہر وقت قاری کو چونکانے والی ہوتی ہے۔اس ناول کے مطالعے سے پہلے ایسا لگتا ہے کہ یہ قدرت کے جبر کی کہانی ہے۔

اس ناول کو ذوقی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ایک حصے میں ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی

کشمکش کو دکھایا گیا ہے وہیں دوسری اور تہذیبوں کے تصادم کا چرچا نظر آ رہا ہے۔اس ناول کی شروعات کاردار خاندان سے ہوتی ہے۔کاردار خاندان دراصل استعاراتی کے طور پر استعمال ہوا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کا اشارہ کرتا ہے۔عبدالرحمٰن کاردار کے والد وسیع کاردار اور اس کے باقی گھر والے مولوی محفوظ علی کے کہنے پر کسی گمشدہ خزانے کی تلاش میں حویلی کی کھدائی کرتے ہیں۔

''ایک جادونگری تھی ۔۔۔یہ حویلی ایک جادوگر تھا۔۔۔مولوی
محفوظ اور ایک جادو کا ڈبہ۔۔۔یہ گمشدہ خزانہ۔۔۔۔۔'' ۵

اس ناول میں ذوقی نے دونسلوں کو پیش کیا ہے ایک وہ جسے خزانے سے دلچسپی ہے اور دوسری نسل وہ جو خزانے کو کچھ اور سمجھتی ہے۔اسی دوران کھدائی کی بات پولیس تک پہنچ جاتی ہے اور فوراً پولیس انسپکٹر کاردار کی حویلی میں تلاشی کے لئے آتے ہیں۔جس کی وجہ سے کاردار انسپکٹر کو بیزاری کے ساتھ کھدائی کی ہوئی جگہ پر لے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

''یہ۔۔۔اپنی قبر کھود رہا تھا۔۔۔لوگ تو اپنے مرنے کے بعد قبر
میں دفن ہوتے ہیں۔قبر بھی گورکن کھودتے ہیں۔لیکن میں وسیع
احمد کاردار، ولد سمیع احمد کاردار۔۔۔۔۔کاردار خاندان کا یہ بد
نصیب وارث،اس آزاد ہندوستان بدنصیب حویلی کی میت
اٹھاتے اٹھاتے اتنا تھک گیا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر
کھودنے لگا۔۔۔۔اگر اپنی زندگی میں اپنی قبر کھودنا ناجائز ہے تو
پھر جو سزا چورکی وہ میری۔۔۔۔لے چلئے کو
توالی۔۔۔۔میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔۔۔۔'' ٦

دراصل یہ خزانہ ماضی کے تحفظ کی علامت ہے۔جو انسان اور فطرت کے درمیان ایک کڑی بن گئی ہے۔یہ خزانہ جو وسیع کاردار کے گھر میں موجود ہے جس کو وہ کھدائی کر کے حاصل نہیں کر پاتے۔اصل میں یہ ملک کی سیاست ، خودغرضی اور لالچ کا اشاریہ ہے کہ کس طرح سیاست نے ہماری صدیوں کی تہذیب اور روایت کو کھوکھلا کر ڈالا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ ذوقی نے ملک میں ہونے والے فسادات اور دنگے کی عکاسی

بڑی ہی بہترین انداز میں کی ہے۔انہوں نے رتھ یاترا سے لے کر بابری مسجد کے انہدام تک کا ذکر اس میں پر اثر انداز میں کیا ہے۔

ناول کے دوسرے حصے میں تہذیبی تصادم کو پیش کیا گیا ہے۔ذوقی نے اس ناول میں ایک تہذیب کے ختم ہونے کا ماتم کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جہاں ایک تہذیب ختم ہوتی ہے وہیں دوسری تہذیب کا جنم ہوتا ہے۔اسی لئے جب گاؤں والے نور محمد سے عبدالرحمٰن ملتا ہے تو اس کو اس میں ایک نئی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے اور جس پر عبدالرحمٰن کا ردار یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے:

''میں نور محمد۔۔۔۔، میں نے اس کے کندے پر ہاتھ رکھا
۔۔۔۔کچھ رشتے انجانے ہوتے ہیں۔زیادہ کریدو گے تو ہاتھ
جل جائیں گے۔۔۔۔بس سوچنا بند کرو۔ ۔۔۔۔دنیا کے
سارے رشتے اپنے ہیں اور ہر رشتے میں ایک احساس سانس
لے رہا ہے۔کچھ رشتوں کی تعریف ہم انسانوں نے ہی گڑھی ہے
اور کبھی قدرت اس تعریف کو ایک تجربے کے تحت اُلٹ دیتی
ہے۔۔۔۔، میں نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا۔۔۔۔سوچو
مت۔۔۔تمہارا سارا خوف اسی سوچ کو لے کر ہے۔تہذیبیں
اپنی عمارت کا بوجھ خود اُٹھاتی ہیں نور محمد۔۔۔۔۔'' ؎

اس ناول کا پلاٹ دراصل دو خاندانوں کے قصوں سے تیار کیا گیا ہے۔ پہلا قصہ عبدالرحمٰن کا ردار کا ہے جن کا تعلق بلند شہر سے تھا اور دوسرا قصہ نور محمد کا ہے۔یعنی قصہ نور محمد کے خاندان سے متعلق ہے۔عبدالرحمٰن کا ردار اپنی زندگی مایوسی اور تنہائی کے ساتھ بلند شہر سے دور ایک پہاڑی پر گذارتے ہیں۔عبدالرحمٰن کا ردار کا قریبی دوست ''پروفیسر نیلے'' کچھ دنوں کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ وہاں آجاتے ہیں جہاں وہ دونوں ایک ساتھ پہاڑیوں پر گھومتے پھرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کے احساسات و جذبات کو سمجھتے ہیں اور پھر ایسے ہی عبدالرحمٰن کا ردار کو وہ وقت یاد آتا ہے جب نادرہ ان کے گھر میں پہلی بار آئی تھی جو ان کے ماموں کی بیٹی ہے۔نادرہ نے نہ صرف اپنی پھوپھی اور پھوپھا کے دل میں جگہ بنالی تھی بلکہ وہ عبدالرحمٰن کے دل میں بھی

بس گئی تھی۔اس کہانی میں جہاں ایک طرف عبدالرحمٰن اور نادرہ کے عشق کی کہانی سامنے آتی ہے تو دوسری طرف پرانی تہذیب اور روایت دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔مشرف عالم ذوقی نے جس طرح ٹوٹتی ہوئی تہذیبوں، قدروں اور رسم و رواج کو بیان کیا ہے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ سب بہت قریب سے دیکھا ہے۔ دیکھا جائے تو آج کل کے معاشرے میں ان ساری چیزوں کی اہمیت ہی ختم ہوگئی ہے جیسے پرانی روایتیں، پرانی قدریں اور پرانی تہذیبیں وغیرہ۔اور اس درمیان ایک نئی تہذیب اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں جس سے نئی نسل بے حد خوشی سے استقبال کر رہی ہے۔

اس ناول میں ایک کہانی نور محمد کی ہے جس کی زندگی ایک لاش کی طرح ہے۔اس کی بیٹی نگار جو کہ معذور ہے وہ خود کچھ نہیں کرسکتی ان کا سارا کام نور محمد کرتا ہے۔وہ ان کے لئے کچھ کرنے کو تیار ہے۔وہ ایک ایسے راستے پر چل رہا ہے جہاں اس کی کوئی غلطی نہیں ہے لیکن کیا کرے وہ مجبور اور لاچار ہے۔اصل میں مجبوری انسان کو کبھی کبھی حیوان بننے پر مجبور کرتی ہے۔نور محمد نے باپ اور بیٹی کے رشتے کو ہی تار تار نہیں کیا بلکہ پوری انسانیت کو پامال کیا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ بڑا ہی تہہ دار نظر آتا ہے۔اس میں ذوقی نے تہذیب و اخلاقیات کا نوحہ بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نئی ٹکنالوجی کے اس دور میں تہذیب و اخلاقیات کے فکر مند نظر آتے ہیں۔مشرف عالم ذوقی کا یہ ناول موضوع اور فکر کے لحاظ سے ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔اس ناول میں ابتداء سے آخر تک قاری کی دلچسپی اور تجسس برقرار رہتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا پلاٹ پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ اور پراثر بھی ہے۔یہاں ہم ناولوں کے پلاٹ پر نظر ڈالتے ہوئے اس کا تجزیہ کریں گے کہ ذوقی نے اپنے ناولوں میں جو پلاٹ پیش کیے ہیں وہ کس نوعیت کے ہیں۔جب ہم ان کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پلاٹ پر مضبوط گرفت نے ان کے ناولوں کو ایک ایسی کشش اور تاثیر سے بھر دیا ہے جو قاری پر ایک لمحہ کے لئے گراں نہیں گذرتا ہے۔ان میں فطری ارتقاء موجود ہے کوئی واقعہ بے ربط معلوم نہیں ہوتا ہے اور ان کے پلاٹ میں کہیں نا ہی بعید از قیاس باتوں کا ذکر ہے اور نہ ہی ناممکن الوقع بات کا اظہار ہے، کشمکش حیات سے ان کے

ناول مزین ہیں۔ جہاں ایک باب کا خاتمہ ہوتا ہے وہیں پر دوسرے باب کا منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔اس کی مثال ہمیں ناول ذبح میں ملتی ہے۔

ناول ''ذبح'' کا پلاٹ بنیادی طور پر ہندوستان میں دلتوں کی حالات زار ہے۔ ناول ایک خاص کردار عبدل کے ارد گرد گھومتا ہے۔عبدل محض ایک ذریعہ اور واسطہ ہے جس پر گذری ہوئی افتاد کے توسط سے سماج کے اس نچلے طبقے کے مسائل کو ابھارا گیا ہے۔جس کا ذکر خود ناول نگار نے ان الفاظ میں کیا ہے اور ناول کے محرکات کا ذکر کیا ہے۔ یہ دلت کردار بچپن سے ہی انہیں پریشان کر رہا تھا۔۔۔عبدل ایک (Real) ریئل یعنی زندہ کردار ہے۔۔۔۔عبدل کو ہر جگہ ناکامی ملتی ہے۔۔۔۔دنگے کا وہ واقعہ جہاں عبدل ایک کمزور آدمی کو لوٹنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ منظر اندرا گاندھی کے قتل کے صرف دو دنوں بعد ان کی آنکھوں کے سامنے سے گذرا تھا۔عبدل میں امید کی نئی کرن جگانے کے لئے ذوقی نے یہ واقعہ یہیں سے مستعار لیا ہے۔

اس ناول میں انہوں نے نئی ایجادات کے آنے سے مختلف پیشہ ور اور غریب طبقے پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اس کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی ملک یا قوم اسی وقت ترقی یافتہ کہلا سکتی ہے جب کہ وہاں کے ہر فرد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں، وہ صحت منداور خوشحالی کی زندگی گذار رہا ہو۔ترقی سماج کے ہر فرد کے لئے شمولیتی ہونی چاہئے جب ملک ترقی کر رہا ہو، نئی نئی مشینیں ایجاد ہو رہی ہوں تو ان کے سبب بے روزگار ہونے والے ان روایتی پیشہ وروں کی باز آبادکاری کی طرف سرکار اور منصوبے بنانے والے ذمہ داروں کو متوجہ ہونا چاہئے ورنہ ملک اور سماج میں معاشی عدم توازن اور بڑھے گا۔اور اکثر معاشی بد حالی انسان کو جرائم کی دنیا میں لے جاتی ہے، ناول میں عبدل کا کردار اس بات کے وثوق کے لئے کافی ہے۔

ناول ''بیان'' کا پلاٹ سادہ اور مربوط ہے۔اس کی کہانی بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی ہے۔اس کہانی میں ذوقی نے واقعات کو بڑی فطری انداز میں قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ناول کا آغاز نئی اور پرانی نسل کی جدو جہد سے ہوتا ہے اور یہ تصادم شروع سے لے کر آخر تک ہے۔اس میں انہوں نے دو فکروں اور دو خیالوں کا ٹکراؤ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چاہے وہ تہذیب کی سطح پر ہو، عمر کی سطح پر یا مذہب کی سطح پر، نئی نسل اپنے انداز سے سوچتی ہے اور پرانی نسل اپنی تہذیب کو

گلے لگائے ہوئی ہے۔ پھر ناول نگار نے وہ دور دکھانے کی کوشش کی ہے جو ٦ دسمبر سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں مذہب کے نام سے سیاست کی جاتی ہے، سماج میں نفرت پھیلائی جاتی ہے اور پورا ملک مذہب کے خانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔اس بارے میں برکت حسین لکھتے ہیں:

''ابھی اینٹھومت زیادہ جوش بھائی! وہ دن دورنہیں، جب بازار میں مول کرنے جاؤ گے تو پوچھا جائے گا۔کس کی تھالی چاہئے۔۔۔ہندو کی تھالی یا مسلمان کی تھالی۔'' ۸

اس ناول کا پلاٹ پرانی اور صالح انسانی اقدار کے اعتبار سے پنڈت بالکمند شرما جوش اور چودھری برکت حسین اور بدلتے ہوئے سماج کے اردگرد گھومتی ہے۔ یہ دونوں ہمیشہ اپنے پرانے وقت کو یاد کرتے ہیں اور پھر اس کا ماتم کرتے ہیں۔ برکت حسین تو حالات کے ساتھ ساتھ وقت کا سمجھوتا کچھ حد تک کر لیتے ہیں مگر بالمکند شرما جوش حالات اور وقت کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر پاتے۔جس کی وجہ سے وہ ایک دن بیمار ہو کر مر جاتے ہیں اور ان کی وصیت ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اردو میں لکھی ہوئی ہے۔ حالانکہ بالمکند شرما تو مشترکہ تہذیب کی علامت ہیں۔

اس ناول میں نئی نسل کی نشاندہی تنویر حسین، نریندرا اور انیل کرتے ہیں۔تنویر حسین تو مسلم نوجوان ہے جبکہ نریندرا اور انیل بھارتیہ جنتا پارٹی اور کانگریس کی علامت ہیں۔اور یہ ایسے کردار ہے جو اس ناول کے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں معاون اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

''شہر چپ ہے'' مشرف عالم ذوقی کا ایک اہم ناول ہے۔ پلاٹ کے لحاظ سے جب اس ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا پلاٹ سادہ ہے۔اس ناول میں ذوقی نے غریب متوسط طبقے کی لاچاری، بے بسی اور بے روزگاری کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس کہانی کا ہیرو انیل ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بے روزگار ہے اور روزگار کے لئے ادھر ادھر بھٹکتا ہے۔انیل کے ساتھ اُس کا دوست رگھو بیر بھی پریشان اور غمگین ہے۔دونوں ایک دن تنگ آکر ''سیٹھ رام اوتار'' کی بیٹی ''مینا'' کو اغوا کرتے ہیں۔لیکن مینا اپنے گھر کے آزادانہ ماحول میں رہ کر پہلے ہی اس سب کے لئے تیار تھی کہ کوئی مجھے اغوا کر کے لے جائے اور مجھ سے پیار کرے۔ذوقی نے مینا کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بڑے

اور امیر لوگوں کے بچے آزادانہ ماحول میں بگڑ جاتے ہیں اور اس آزادی سے ان پر کیسا اثر پڑتا ہے۔ انیل اور رگھو بیر مینا کی بات سن کر حیران ہوتے ہیں اور رگھو بیر واپس چلا جاتا ہے لیکن انیل اب اس کو گھر چھوڑنے چلا جاتا ہے اور گھر پہنچ کر مینا کا باپ انیل کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور پھر اپنی بڑی بیٹی کی شادی انیل سے کرواتا ہے اور انیل ان کے پیسوں سے اپنا کاروبار شروع کرتا ہے۔

رگھو بیر پیسوں کے معاملے میں خالی ہاتھ ہے۔ ایک دن جب اس کی ماں بیمار پڑتی ہے تو اس کے پاس ماں کے علاج کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ جس کی وجہ سے اس کی ماں مرجاتی ہے۔ اور اب اس کے گھر میں ایک اپاہج بہن ہوتی ہے وہ گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ رگھو بیر ان پریشانیوں سے تنگ آکر اس گھر کو بیچ کر چلا جاتا ہے۔ ذوقی نے اس ناول کا قصہ فلمی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول کے ذریعے ذوقی نے ہندوستان کے بے روزگار، لاچار، بے بس اور غریب نوجوانوں کی عکاسی کی ہے، جو حالات سے مجبور ہو کر غلط راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔

ناول ''مسلمان'' کا پلاٹ سادہ، مربوط اور پر اثر ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس ناول کی شروعات گوہر بائی کے کوٹھے سے کی ہے جہاں ان کی بیٹی افروز اس کو روز چوری سے دیکھتی ہے۔ گوہر بائی عزیز انساء کی بیٹی ہے۔ جس کو بٹوارے کے زمانے میں ایک لڑکا اغوا کر کے رانی منڈی میں شہناز بائی کے کوٹھے پر بیچ دیتا ہے اور وہاں عزیز بائی ایک لڑکی گوہر کو جنم دے کر مر جاتی ہے اور پھر شہناز گوہر کو طوائف بننے کے لئے تیار کرتی ہے۔ اور پھر گوہر بائی افروز نام کی لڑکی کو جنم دیتی ہے جو الطاف حسین کی ناجائز اولاد ہے۔ گوہر افروز کو تعلیم دلانا چاہتی تھی تاکہ وہ اس طوائف کے کاروبار سے دور رہے۔ لیکن ایک دن اچانک ان کی زندگی میں ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو افروز کی پوری زندگی کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس ناول میں فرقہ وارانہ فساد کی ایک آواز گونجتی ہے جس کی لپیٹ میں پورا ہندوستان آجاتا ہے۔ گوہر بائی کے گھر کو آگ لگا دی جاتی ہے تو افروز اپنی جان بچا کر نواب کے گھر پہنچتی ہے۔ یہاں ذوقی نے مفلسی کی زندگی، غلامی کی زندگی اور ساتھ ہی ساتھ دو تہذیبوں کے تصادم کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ ذوقی نے پلاٹ میں اسی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔

اس کے علاوہ ذوقی کے اور بھی ناول ہیں مثلاً پوکے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا

سونامی، نالہ شب گیر،عقاب کی آنکھیں وغیرہ۔ان سارے ناولوں کے پلاٹ سادہ،مربوط اور پیچیدہ ہونے کے علاوہ پراثر بھی ہیں۔ذوقی کا ایک اور تازہ ترین ناول''مرگ انبوہ'' ہے جو حال کی اشاعت ہے۔اس ناول کا پلاٹ سادہ،مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ پراثر اور پیچیدہ ہے۔اس ناول کی کہانی میں واقعات ایک کے بعد ایک سامنے آتے ہیں۔کہانی کی شروعات''موت سے مکالمہ'' سے ہوتی ہے جہاں ذوقی نے بلو وہیل گیم کا تذکرہ کیا ہے جو موت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں جادوگر ہے وہ اپنے جادو سے لوگوں کو نچاتا ہے۔ذوقی نے اصل میں موجودہ دور کی عکاسی کی ہے، جہاں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آج کل کی دنیا بالکل ایلومناتی (شیطان کے پجاری) کی طرح ہے جیسے فلم،اسپورٹس، سیاست وغیرہ،اب لوگ خدا سے کچھ نہیں مانگتے بلکہ سب کچھ شیطان سے مانگتے ہیں اور شیطان سے مانگنے پر مل بھی جاتا ہے۔اسی لئے ذوقی نے آج کل کے دور کو شیطان کا دور قرار دیا ہے۔جس کی وجہ سے ناول میں مرزا پاشا یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ:

> ''یہ دور شیطانوں کا دور ہے۔آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو
> شیطان بننا ہوگا۔۔۔۔۔اب یہ لوگ تمہارے خداؤں سے کچھ
> نہیں مانگتے۔یہ شیطان سے پاور مانگتے ہیں اور شیطان انہیں
> پاور سے نوازتا بھی ہے۔'' 9

یہاں ذوقی نے دور حاضر کے سلگتے ہوئے مسائل، سسکتی ہوئی انسانیت، دم توڑتی تعمیری قدریں اور ظالمانہ شازشیں جیسے مسائل کی عکاسی کی ہے۔

ناول نگار یا قصہ گو کو صورت حال کے بیان میں جس طرح غیر جانب دار ہونا چاہئے وہ سب ہمیں ذوقی کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ پلاٹ کے تعلق سے آخری بات یہ ہے کہ ان کے ناولوں میں پلاٹ کی ترتیب میں واقعات کی فطری بہاؤ، ماحول کا تاثر،کرداروں کی جزبات نگاری کا جادو ضرور ہوتا ہے جو ہمیں ان کے ناولوں میں صاف نظر آتا ہے۔جس کی وجہ سے قاری بڑے ذوق وشوق سے ان کے ناولوں کو پڑھتا ہے اور اس تجسس میں رہتا ہے کہ آگے کا قصہ کیا ہوگا۔

۵.۲۔کردارنگاری

ہر قصے کی بنیاد کرداروں پر ہوتی ہے۔کہانی کرداروں کے اردگرد بنی جاتی ہے، کردار ہی قصے کو آگے بڑھاتے ہیں ۔کردار ہی کے سبب قصہ میں نشیب وفراز پیدا ہوتے ہیں ۔کردار دو خانوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں ۔ایک پیچیدہ یعنی (Round) دوسرا سپاٹ یعنی (Flat) جن کرداروں میں ارتقا ہوتا ہے یعنی جو ناول میں ابتدا سے آخر تک ایک جیسے رہتے ہیں وہ سپاٹ (Flat) کہلاتے ہیں اور جو کردار حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں وہ پیچیدہ یعنی (Round) کہلاتے ہیں ۔

ای ۔ایم ۔فارسٹر کے مطابق :

''یک رخے کرداروں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ قاری انہیں فوراً پہچان جاتا ہے۔ناول نگار کے لئے یہ سہولیت ہوتی ہے کہ ان کو کبھی دوبارہ متعارف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قاری انہیں بعد میں بھی آسانی سے یاد رکھتا ہے اور وہ اس کے ذہن میں رہتے ہیں ۔کیونکہ حالات و واقعات ان میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے۔'' [۱۰]

ناول میں کردار اور کردارنگاری کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ناول کا بنیادی عنصر قصہ پن ہے۔ہم قصہ بیان کر سکتے ہیں لیکن پڑھنے والا انسان کے اعمال ،افعال اور حرکات میں دلچسپی رکھتا ہے۔وہ اعمال وافعال جن میں حرکت ہے، تبدیلی ہے، تصادم ہے، قاری کو صرف اسی بات میں دلچسپی نہیں ہوتی ہے، کہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ کیوں کرتے ہیں؟ وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کیسے لوگ ہیں؟ ان کے خدوخال، ان کا رنگ وروپ، چال ڈھال، ان کی پسند ناپسند سب کچھ قاری کی دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں، ہم ناول پڑھنے کے دوران اور بعد میں منظر نگاری ، پلاٹ ، مکالمے سب کچھ بھلا دیتے ہیں مگر ہم صرف ان جیتے جاگتے کرداروں کو یاد رکھتے ہیں جنہیں ناول نگار زندگی بخشتا ہے۔

ناول میں کردار اہم رول ادا کرتے ہیں ۔یہ ناول کا مضبوط ترین ستون ہوتا ہے۔ناقدین نے تو

اسے پلاٹ سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ جبکہ کہانی کے سارے ڈھانچے کا انحصار پلاٹ پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ البتہ کردار کے بغیر کسی کہانی کا وجود ناممکن ہے۔ کیونکہ کسی بھی کہانی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح کردار کے سہارے ہی پیش آتے ہیں۔ ناول نگار کو تو یہ سہولت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ناول میں کردار پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈال سکتا ہے تا کہ اسے ہر ایک روپ میں دیکھا جائے۔ جس سے اس کی پوری شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ کردار چونکہ ناول کی جان ہوتے ہیں اس لئے ایک کامیاب کردار نہ صرف کہانی کے واقعات ہی کو آگے بڑھاتا ہے بلکہ مصنف اور قاری کے درمیان ایک ربط کی حیثیت رکھتا ہے۔

ناولوں میں کرداروں کی دو قسم ہے۔ ایک مرکزی کردار ہوتا ہے اور دوسرا ضمنی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام طور پر ناول نگار اپنی کہانیوں میں مرکزی کردار کے ذریعے ناول کا تانا بانا تیار کرتے ہیں جبکہ وہ ضمنی کرداروں کو وقتی طور پر موقع ومحل کے حساب سے ان کا سہارا لیتا ہے۔ جو کہ قصہ یا واقعہ کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو کردار نگاری ناول کی جان ہے اور ناول نگار کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں جیتے جاگتے کرداروں کو پیش کرے جو کہانی پر اثر انداز ہوتے ہیں تا کہ پڑھنے والے ان کرداروں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ناول نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ کرداروں کی ذہنی، جذباتی ،نفسیاتی اور سماجی زندگی سے واقفیت رکھتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس عہد کی تہذیب وتمدن ، سیاسی وسماجی حالات ومسائل کی مکمل معلومات رکھتا ہو جس عہد میں وہ کرداروں کو پیش کرے۔ مختصر یہ کہ ناول نگار جتنا اچھا کردار وضع کرے گا اتنا ہی اچھا وہ ناول کی تخلیق کر سکتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے تمام ناولوں میں ہمیں سماج اور معاشرے کا پورا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جس میں ہمیں سماج کے ہر فرد کا چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ ذوقی ایک ایسے ناول نگار ہیں جو کبھی اپنی آنکھوں سے کسی منظر کو اوجھل ہونے نہیں دیتے۔ وہ جو کچھ اپنی تیز آنکھوں سے دیکھتے ہیں اسے کہانی یا واقعہ کے طور پر پیش کرنے کی بھر پور کوشش کرتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں ہمیں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے ساتھ ساتھ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے

والے کردار جا بجا ملتے ہیں۔ان کے ناولوں میں ہمیں ہندو اور مسلم، مرد اور عورت، نوجوان اور بچوں کے کردار اپنی اپنی کہانی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان میں ڈاکٹر، اساتذہ، پروفیسر، زمیندار، نوکر، کلرک، طالب علم، بے روزگار، دہشت گرد، چور، تاجر، مظلوم اور پولیس وغیرہ سبھی شامل ہیں۔انہوں نے تقریباً سماج کے ہر ایک طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو اپنے ناولوں میں بڑی اچھی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی اپنے ناولوں میں کرداروں کی صرف باطنی کیفیت کو ہی نہیں بلکہ ان کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔کیوں کہ وہ کرداروں کے رگ وپے میں داخل ہونے کا فن بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔وہ کرداروں کی نفسیات، چال وچلن، ذہنی کشمکش، جذبات واحساسات اور حرکات وسکنات کو فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کے کردار ہمیشہ زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں۔

ذوقی کے ناولوں میں کئی کردار ہیں مگر ہم یہاں ان کے اہم کرداروں کا تجزیہ کریں گے جن کی وجہ سے ان کے ناولوں میں جان پڑ گئی ہے۔ذوقی کا ناول ''نیلام گھر'' کردار نگاری کی وجہ سے ایک اہم ناول ہے۔اس ناول میں کوئی کردار غیر ضروری نہیں ہے۔کریم بیگ سے لے کر دفتر کے صاحب اور چپراسی تک ہر کردار مختلف واقعات اور حالات کی پیش کش میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

یہ ناول فرقہ وارانہ فسادات اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو پیش کرتا ہے اور اس میں عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے استحصال کو خصوصا اجاگر کیا ہے۔لیکن اس ناول میں مصنف نے نسوانی کردار کی تخلیق میں فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔مس نیلی (سلمہ) اور مسز بھٹنا گر کا کردار قاری کو متاثر کرتا ہے۔عورتوں پر ہونے والے ظلم وجبر اور استحصال کو مصنف نے بڑے ہی بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے مخصوص سماج میں یہ عورتیں اس قدر مجبور و بے بس ہیں کہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم وجبر کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرتی ہیں۔اور معاشی مجبوریوں کی وجہ سے مصلحت پسندی پر مجبور ہیں۔رضیہ، مس نیلی، مسز بھٹنا گر اور نمیتا جیسے کرداروں کی خارجی زندگی ہی نہیں بلکہ مصنف نے ان کی داخلی زندگی اور ان کے جذبات واحساسات کو بھی پیش کیا ہے۔

ناول میں ماجرا کے ساتھ کردار کی پیش کش بڑی اہمیت رکھتی ہے۔اس ناول کے اہم کرداروں میں

مذکورہ بالا کرداروں کے علاوہ اور بھی ہیں۔مثلاً رتھ، مائیکل،سموئیل، رگھوبیر، ورما، کانتا پرساد وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار ''کریم بیگ'' ہے۔کریم بیگ پورے ناول کی روح ہے، ناول کا پورا قصہ کریم بیگ کے ارد گرد گھومتا ہے۔کریم بیگ کی شخصیت متضاد کیفیات کی حامل ہے، ایمانداری اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔وہ پوری زندگی حالات سے سمجھوتا ہی نہیں کرتا ہے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔کریم بیگ ایک تنہا فرد ہوتے ہوئے بھی پورے سماج کی برائیوں سے لڑتا ہے اور حوصلہ نہیں کھوتا۔ جہاں تک عزائم اور حوصلوں کا تعلق ہے کریم بیگ کسی رزمیہ ہیرو سے کم نہیں، پیشے کے اعتبار سے کریم بیگ ایک کلرک ہے۔جس آفس میں وہ کام کرتا ہے وہاں ایک صاحب ہے جو کہ ایک درندہ صفت ہے دوسری طرف کریم بیگ نہایت نیک ہے۔اس کے دفتر میں ایک عورت ہے جس کا نام مس نیلی ہے۔مس نیلی کی پراسرار موت پر پورے شہر اور آفس والوں کو تعجب ہوتا ہے کہ وہ کون تھی؟ اس لاوارث لاش کا وارث کون ہوگا؟ شہر میں کوئی اس کی لاش لینے کو نہیں آتا۔کریم بیگ کا ضمیر اسے جھنجوڑتا ہے اور وہ اس کی لاش لینے ہسپتال جاتا ہے۔ پولیس اس پر شک کرتی ہے کہ تم فرقہ پرست اور دہشت پسند جماعت سے تعلق رکھتے ہو۔کریم بیگ مس نیلی کا ماضی بتاتا ہے جس پر پولیس کو یقین نہیں آتا۔کہانی کے آخری حصے میں کریم بیگ ملک میں پھیلی بداخلاقی اور سماج کی برائیوں کو دیکھ کر تنگ آجاتا ہے اور پھر اپنی جان دے دیتا ہے۔

اس ناول میں ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سب مذہب سے بیزار ہیں اور روزی روٹی کے چکر میں اپنے ضمیر تک کا سودا کرتے ہیں۔اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ باور کرایا ہے کہ ملک آزاد تو ہوا لیکن ہم آزاد ہونے کے باوجود آزاد نہیں ہیں کیونکہ آج بھی ملک کے کونے میں ذات پات اور اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش دیکھنے کو ملتی ہے۔اس طبقاتی کشمکش میں نہ جانے کتنے کریم بیگ جیسے لوگ استحصال کا شکار ہوتے ہیں اور سماج میں پھیلی ہوئی برائی اور ہر ظلم وستم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

انجم اس ناول کا ایک اور اہم کردار ہے۔انجم کریم بیگ کا بیٹا ہے جو اس ناول کا مثالی کردار ہے۔ذوقی اس مثالی کردار کے بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میں نے انجم کے کرادر میں ایک ایسے بزرگ کو دیکھنے کی
ضرورت محسوس کی جس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ نیلام ہو
رہا ہے۔بدلتے ہوئے وقت سے رشتے بے معنی ہو چکے
ہیں۔قدریں ختم ہوچکی ہیں۔مذہب صرف خوف کی علامت کے
طور پر رہ گیا۔اور یہ فتح انسان اپنی بربادیوں کا جشن منا رہا
ہے۔'' [۱۱]

اس ناول کی ابتدا انجم سے ہوتی ہے جو اپنے کمرے سے تیز بدبو کو اٹھتا ہوا محسوس کرتا ہے دھیرے دھیرے یہ بدبو زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو جاتی ہے۔انجم کا کردار اس ناول میں نوجوان نسل کی نمائندگی کرتا ہے جو سیاست کے سبب سماج میں پھیلی برائیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے اور اپنی کوششوں کے ذریعہ عوام میں بیداری لانا چاہتا ہے۔جس کے نتیجے میں اسے جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں لیکن ان مشکلات کے باوجود اپنے عزائم پر قائم رہتا ہے۔

انجم ان برائیوں کو دور کرنا چاہتا تھا۔وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ تم لوگ ابھی سوئے ہو۔اس پھیلی ہوئی بدبو کے باوجود آج ہمیں جاگنا ہے جو کرنا ہے ہمیں خود ہی کرنا ہے،ہمیں عوام کو جگانا ہے۔نہیں چاہئے ہمیں ایسی حکومت جو اندھی ہو،لنگڑی ہو۔۔۔جو ہمیں ان برائیوں سے بچانے کے لئے کچھ نہیں کرپاتی ہے۔ایسی ناکارہ حکومت نہیں چاہئے۔ہم نے کل انصاف اور حقوق کے لئے لڑا تھا اور ہم آج بھی اسی کے لئے لڑیں گے۔دیکھنا جیت آخر کار ہماری ہوگی۔ان برائیوں کی وجہ سے بعض لوگ رورہے تھے،بعض چلا رہے تھے۔سب لوگ ان برائیوں سے بچنے کی کوشش کررہے تھے جو ہر گلی،کوچے اور سڑکوں پر پھیلی تھی۔۔۔مگر اس کے باوجود ہنگامہ برپا تھا۔۔۔اور شہر میں جب برائیاں پھیلیں تو انجم اپنے چند دوستوں سے خطاب کررہا تھا۔۔۔

''میرے دوستو''۔۔۔میرے بھائیو۔۔۔۔وقت آچلا
ہے۔۔۔تم ایک لمبی نیند سوتے رہے۔۔۔۔اس سے انجان ہو
کر کہ کوئی تمہارے اِردگرد بدبو کے بیج بوتا رہا۔۔۔۔تم سوتے
رہے اور وہ اپنا کام ختم کر کے روپوش ہوگیا۔۔۔۔تم ایک طویل

نیند کے بعد جاگے۔۔۔۔۔اور جب نیند تباہی تمہارے گھروں
پر دستک دے رہی تھی۔۔۔۔۔تم نے صاف محسوس کیا کہ حکومت
کتنی کمزور ہوگئی ہے۔۔۔۔۔میں کوئی نیا وعدہ۔۔۔۔کوئی نیا
فرمان لے کر تمہارے پاس نہیں آیا بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ ہم سب
مل کر محبت کی ایک موٹی رسی بن سکتے ہیں۔۔۔۔۔ہم سب مل کر
اس بدبو سے جنگ کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔'' [۱۲]

انجم کہتا ہے کہ میرے دوستو اب بھی وقت ہے ہمیں کچھ کرنا چاہئے ورنہ کل تک بہت دیر ہوچکی ہوگی۔ہمیں حکومت کو صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ ہمیں ایسی حکومت کی ضرورت نہیں جس میں ہمارے بچوں،عزیزوں،دوستوں اور عورتوں کو روز مرنا پڑے۔ہم سب ایک مدت سے جھیل رہے ہیں۔۔۔اگر ہماری حکومت نے شروع میں ہی اس بدبو کو محسوس کیا ہوتا تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ایک دن انجم اور اسکا دوست امت دیواروں پر پوسٹرس لگا رہے تھے تو انہیں پولیس دیکھ لیتی ہے اور پولیس پیچھے پیچھے ان کے گھر تک آتی ہے اور انجم کو گرفتار کرتی ہے۔کریم بیگ اپنے بیٹے کے جیل جانے کا صدمہ برداشت نہیں کر پاتے۔

مشرف عالم ذوقی کی شخصیت اس اعتبار سے منفرد اور اہم ہے کہ ان کا ماحول،ان کے کردار اور واقعات ہندوستان اور خاص کر کے ہندوستانی مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ اپنے سماج کے متوسط اور نچلے طبقے سے اپنے ناولوں کے لئے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ان کے کردار جس ماحول اور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں،اسی ماحول اور طبقے کی زبان بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ناول''ذبح'' کا ایک کردار''عبدل'' ہے۔عبدل اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔اس کردار کو ناول نگار نے ناول میں اس طرح پیش کیا ہے کہ،اس کردار کو بنانے سنوارنے اور اس کی ظاہری و باطنی تمام کیفیات سے واقف کرانے کے لئے ذوقی نے بے حد محنت کی ہے۔لگتا ہے اس کردار کو صفحہ قرطاس پر لانے سے پہلے ذوقی نے اس کردار پر گہرا مشاہدہ کیا ہے۔جس کا ذکر ذوقی نے اس طرح کیا ہے۔

''عبدل سقہ کوئی کردار نہیں۔یہ کردار بچپن سے میرے ساتھ رہا
ہے جب سے آنکھیں کھلی ہیں تب سے اس ڈیل ڈول والے

عبدل مشک والے کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔'' ۱۳؎

عبدل بھشتی چودھری خاندان میں پانی بھرنے کے کام پر معمور تھا۔لیکن جب پانی کی قلت کو پورا کرنے کے لئے نئی ترکیب وجود میں آئی تو گھر میں ہینڈ پائپ لگنے لگے جسکی وجہ سے عبدل جیسے ہزاروں لوگوں کی روزی روٹی کا ایک مسئلہ بن گیا۔ یہ سچ ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اور نئی ایجادات سے انسانی زندگی کو آرام فراہم ہوتا ہے لیکن وہیں یہ ایجادات ہزاروں لوگوں کی زندگی کے لئے جہنم بن جاتی ہیں۔اسی طرح عبدل جیسا قوی جسامت والا شخص وقت کے ساتھ خود کو بے سہارا اور لاچار محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو دوسرا کوئی کام نہیں آتا۔ حالانکہ عبدل نے کئی کام کرنے کی کوشش کی جیسے بجلی کا کام، رکشا چلانا، وغیرہ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ جب مایوسی اور ناکامی کے اندھیروں میں وہ ڈوب جاتا ہے تو حالات سے مجبور ہو کر اپنے لڑکے اشرف کے بہکاوے میں آکر چوری کرنے لگتا ہے لیکن اس نے کبھی چوری اور لوٹ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ اپنے گھر کی بدحالی کی پوری ذمہ داری اپنے ناکارہ لڑکے پر ڈال دیتا ہے۔ خاص کر آوارہ اشرف کو جسکی وجہ سے اس کو ذلت آمیز برتاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا نقشہ ناول نگار نے اس طرح پیش کیا ہے۔

''آج وہ سب کے لئے نفرت کا کردار تھا اس نے مہرن کی آنکھوں میں بھی اپنے لئے گہری نفرت دیکھی تھی۔مگر کیا سچ مچ وہ اس ذلت کا ذمہ دار ہے؟ اسے رہ کر اشرف پر غصہ آرہا تھا۔۔۔۔۔۔ہاں اشرف نہ ہوتا تو راہ دلدل میں اترتا بھی نہیں۔ ۱۴؎

''ذبح'' کا ایک اور اہم کردار ''چودھری رشید'' ہے جو خاندانی جاہ وجلال، عزت وافتخار اور پرانی روایتوں کی علامت ہے۔اس ناول میں جہاں عبدل اہم کردار ہے وہاں چودھری رشید بھی بے حد اہم اور طاقتور ہے۔ بدلتے وقت اور حالات سے سمجھوتہ، خاندانی وقار عظمت وحشمت کے خلاف تھا۔ٹوٹ کر بکھر جانا گوارہ تھا، لیکن جھک جانا شان وشوکت کے خلاف تھا۔ ذوقی نے اس کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے۔

''غلامی کے زمانے تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلا۔ پھر آزادی کی نئی اُڑان نے سب کچھ ختم کرنا شروع کردیا۔ چودھریوں کی

چودھراہٹ مرگئی۔ پاکستان بنا تو گلی چھوڑ چھوڑ کر لوگ پاکستان
جانے لگے۔ساری جائیداد اونے پونے بیچ کر لوگ چلے
گئے۔چودھریوں کے محلے اور چودھراہٹ کی رونق ختم
ہوگئی۔چودھری خاندان پر زوال آگیا۔۔۔۔۔۔'' ۱۵

چودھری رشید کا کرداراس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ پرانی قدروں کا چاہنے والا ہے۔تقسیم کے بعد وہ اپنے دوستوں اور پرانی روایتوں کی یادوں کو سینے سے لگا تا ہےاور خاندانی وقار جاہ وجلال کا بکھرنا موت سے کم نہیں سمجھتا ہے۔اس کے علاوہ ناول کے اور بھی کئی کردار ہیں مثلاً اسلم،جینو میاں،سلامت چچی،رجوا،مشتری،مہرن وغیرہ۔

مشرف عالم ذوقی اپنے ناولوں میں کرداروں کا انتخاب بہت ہی مناسب اورمتوازن انداز میں کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں میں ہر مذہب، ہر طبقے اور ہر جنس کے کردار پیش کئے ہیں اور واقعات کے مطابق ان کاتعین بھی کیا ہے۔ان کے کرداروں میں ہمیں مختلف سماجی، سیاسی،تہذیبی اور مذہبی گروہ بندی نظرآتی ہے۔ان کے سب کردار اپنی خصوصیات لے کر ناول میں شامل ہوتے ہیں اور یہ الگ الگ زندگی کے پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جس کی وجہ سے یہ ناولوں کی فضا پر پوری طرح چھا جاتے ہیں۔''بیان'' مشرف عالم ذوقی کا ایک اہم ناول ہے۔اس ناول میں انہوں نے مختلف کرداروں کے حوالے سے ہندوستان اور ہندوستانی لوگوں میں بدلتی ہوئی سیاسی وسماجی صورت حال اور یہاں کے المناک ماحول کی بھر پورعکاسی کی ہے۔اس ناول میں کرداروں کی تعداد اچھی خاصی ہے مگر اس ناول کا مرکزی کردار''بالمکند شرما جوش'' ہے۔اس کردار کے بارے میں انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ:

''آرہ کے چھوٹے سے شہر میں اس کردار کو میں نے دیونند
سہائے پارسا آروی اور جین صاحب کی شکل میں اتنی بار دیکھا
کہ جب بیان لکھنے کا وقت آیا تو یہ دونوں کردار مجھ پر حاوی ہوکر
ایک زندہ کردار میں بدل گئے۔بالمکند شرما جوش کی کردارنگاری
ایک مشکل فن ہےاور ریاضت چاہتی ہے۔'' ۱۶

اس ناول کے کردار دوحصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ کردار جوگنگا جمنی ہندوستانی تہذیب اور انسانی رشتوں کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔مثلاً پنڈت بالمکند شرما جوش اور چودھری برکت حسین دوسرے وہ کردار، جیسے بالمکند شرما جوش کا بیٹا ''انیل'' اور برکت حسین کا بیٹا ''منا'' جونئی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔اورنسوانی کرداروں میں مالو، اوما، تلسی، جمیلہ اورشمیم عرف شمی وغیرہ ہیں۔

اس ناول کا سب سے زندہ اورمتحرک کردار بالمکند شرما جوش ہیں جو ایک فلسفی، شاعر، حساس، فرشتہ صفت اور سیکولر مزاج انسان ہیں۔ان کا کردار ایسا ہے کہ انہیں خون خرابے سے سخت نفرت ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہندومسلم روایت اورمشترکہ تہذیب کا نمونہ ہیں۔ان کے دل ودماغ کوفسادات نے تارتار کردیا ہے۔وہ ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں جوقدیم روایت کی پاسداری کرتا ہے، جسے وطن سے محبت اورانسان دوستی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے اوراسی حالت کی وجہ سے یہ بھولنے کی بیماری میں بھی مبتلا ہوجاتے ہیں۔چونکہ بالمکند شرما جوش ایک حساس انسان ہیں۔اس لئے فرقہ وارانہ فساد کے ہولناک منظر کی تاب نہ لاکر ان کی موت ہو جاتی ہے۔مرنے سے پہلے ہی ان کواپنے موت کا احساس ہوگیا تھا اور وہ مایوس بھی تھے کیوں کہ ان کے سارے خواب پاش پاش ہوگئے تھے۔ان کودو بیٹے ہونے کے باوجود ایسا لگتا تھا کہ وہ بے وارث ہیں کیونکہ ان کو ماننے اور سمجھنے والا کوئی نہیں۔جس کی وجہ سے ان کو اپنی زندگی گھٹتی اور سسکتی ہوئی نظر آتی ہے۔جوش کو ہندومسلم میں فرق اور گھر کے حالات اور ملک میں ہورہے فسادات نے بہت متاثر کیا اور زندگی کے آخری دنوں میں ان کو بھولنے کی بیماری ہوگئی جس کی وجہ سے ان کی موت ہوتی ہے۔ناول نگار اس بات کو ایسے بیان کرتا ہے:

> ''بہت کچھ سوچتا ہوں۔یہ بھی ۔۔۔۔کہ میں جا رہا
> ہوں۔اور میرا کوئی وارث نہیں ہے۔۔۔۔۔جو میری میراث،
> میری وراثت سنبھالتا۔۔۔جو مجھ سے جڑی روایتیں میرے بعد
> بھی جاری رکھتا۔۔۔۔۔میرے بعد کوئی نہیں ہے۔یہ حق بات
> مجھے کھائی جارہی ہے۔۔۔۔۔بالمکند شرما جوش کسی گہری سوچ
> میں ڈوب جاتے ہیں۔۔۔۔'' ۱۷

برکت حسین اس ناول کا ایک اہم کردار ہے۔برکت حسین ایک باعزت انسان ہیں۔پرانی تہذیب

اور پرانی روایت کے قائل ہیں۔ ملک اور شہر میں ہونے والے دنگے ،فساد سے وہ پریشان نظر آتے ہیں۔ وہ بالمکند شرما جوش کے دوست ہیں اور ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ دونوں دوست کی سوچ ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔اور ایک دوسرے کے دکھ، درد میں کام آتے ہیں اور دونوں آپس میں گفتگو کر کے دل کا غبار نکالتے ہیں۔:

''آواز کمزور پڑ جاتی ہے۔'' کیا کہوں۔۔۔اپنا آپ نکالنے
والا بھی تو کوئی ہو۔۔۔درد باٹنے والا۔۔۔تم آجاتے ہو تو دل
کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا ہے برکت حسین۔۔۔۔'' ۱۸؎

ذوقی نے اس ناول میں وطن پرستی، انسان دوستی اور خون خرابہ سے نفرت کا پیغام دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ناول میں جذبات واحساسات کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں کہ پڑھتے ہوئے قاری کو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ ان کی اپنے ہی دل کی آواز ہو۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کے جذبات کو بری طرح کچل دیا ہے۔اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی جان و مال اور عزت وآبرو خطرے میں ہے۔سہمے ہوئے مسلمانوں کے احساسات وجذبات کی عکاسی ذوقی نے ناول میں اس طرح کی ہیں:

''زمانہ خراب ہے،مسلمانوں کے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔' ۱۹؎

ناول ''شہر چپ ہے'' کردار نگاری کے لحاظ سے ایک بہترین ناول ہے۔اس میں ذوقی نے کرداروں کے ذریعہ ہندوستان کے بے روزگار، لاچار اور بے بس نوجوانوں کی عکاسی کی ہے جو حالات سے مجبور ہو کر غلط راستے پر چل پڑتے اور اپنا سب کچھ تباہ وبرباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔اس ناول میں تو کئی کردار ہیں جیسے انیل، رگھو بیر، مینا، انورادھا، ارمیلا اور رام اوتار وغیرہ جو ناول کو اختتام تک پہنچانے میں مدد دیتے ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار انیل ہے اور پورے ناول کی کہانی اسی کے اردگرد گھومتی ہے۔انیل پڑھا لکھا ایک نوجوان ہے مگر قاری کے سامنے ایک بے روزگار کی حیثیت سے آتا ہے۔دراصل انیل ایک ایماندار اور سادہ مزاج شخصیت کا مالک ہے۔انیل اپنے حالات سے پریشان ہو کر نوکری کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا ہے۔جب رگھو بیر انیل کو اپنے پلان میں شامل کرتا ہے تو انیل اس کا ساتھ دینے سے بالکل انکار کر دیتا ہے اور

رگھو بیر کو اس طرح سمجھا تا ہے:

''انیل بالکل سناٹے میں آ گیا'' کیا بکتے ہو۔۔۔۔۔رگھو بیر یہ
جرم ہے۔پھر پتہ چل گیا تو ؟۔۔۔۔۔۔انیل کی آنکھوں کے
آگے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ سارے بدن میں جیسے
تیز کپکپاہٹ دوڑ گئی تھی۔'' ۲۰؂

مشرف عالم ذوقی نے انیل کے ذریعہ دراصل اس عہد کے لوگوں کے دلی جذبات، احساسات اور خیالات کو قاری تک پہنچانے کی بہترین کوشش کی ہے۔

انیل بچپن میں بہت ہی الگ تھے۔ان کو اپنے والد نے کبھی سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا ہمیشہ ان کو خوش رہنے کی تلقین کرتے تھے اور ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ بیٹا خوش رہو، ہنسو اور مسکراؤ یہی زندگی ہے۔ یہ زندگی چار دن کی ضرور ہے لیکن اگر انسان ہنس کر اور مسکرا کر گزارے تو چار برسوں کی ہو جائے گی۔

اس ناول میں انیل کے ذریعے یہ پیغام دیا ہے کہ یہ جو شہر میں دنگے فساد ہو رہے ہیں اور لوگوں پر جو ظلم و جبر ہو رہا ہے، اس ظلم و ستم کو تو سارا شہر برداشت کرتا ہے۔لوگ تنگ آ گئے تھے اس بے روزگاری سے مگر اس کے حل کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ انیل بھی اس بے روزگاری کے عالم میں گرفتار تھا مگر وہ لاکھ کوششوں کے باوجود اس سے چھٹکارا نہیں پا رہا تھا۔

رگھو بیر بھی اس ناول کا اہم کردار ہے۔وہ انیل کی طرح پڑھا لکھا ہے مگر بے روزگار، وہ بے روزگاری کے لئے ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے۔ انیل کے ساتھ اس کو مصیبت اور پریشانیوں نے گھیر رکھا تھا۔رگھو بیر کو پیسوں کی سخت تنگی تھی اور آخر کار رگھو بیر ان پریشانیوں سے تنگ آ کر اپنے گھر کو بیچ دیتا ہے اور اپنے دوست انیل سے کہتا ہے:

''انیل! میں سچ مچ لٹ گیا۔تم ہی بتاؤ۔اب اتنی بڑی دنیا میں
کہاں جاؤں۔میں نے بڑی دیر کر دی انیل۔۔۔۔اور جب
میں بہت دیر کے بعد یہاں آیا تو معلوم ہوا، ماں میرا ساتھ ہمیشہ
کے لئے چھوڑ چکی ہے اور بہن کا بستر خالی ہے۔شاید میری اپاہج

بہن اپنی خوداری کے ساتھ مجھے کنگال سمجھ کر روانہ ہوگئی جانے
کہاں چلی گئی مجھے بتائے بغیر۔میں اب اسے کہاں تلاش
کروں۔کہاں ڈھونڈوں سوچا ہوگا کہ ایک بھائی اپنا جیب خرچ
بھی ٹھیک طرح سے نہیں نکال پاتا ہے وہ اس کی روٹیوں کا انتظام
کیسے کر سکے گا۔۔۔۔میں لٹ گیا انیل۔۔۔۔مجھے اب کچھ بھی
سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' [۲۱]

ناول ''مسلمان'' کردار نگاری کے لحاظ سے ایک اہم ناول ہے۔اس ناول میں کئی کردار ہیں لیکن ہم یہاں اہم کرداروں پر روشنی ڈالیں گے جن کے لئے ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے ہے۔ایسے کرداروں میں گوہر بائی،افروز،نواب الطاف حسین اور شعیب وغیرہ شامل ہیں۔جو اس ناول کو اختتام تک پہنچانے میں کارگر ثابت ہوتے ہیں۔

''افروز'' اس ناول کا ایک مثالی کردار ہے جو گوہر بائی اور الطاف حسین کی ناجائز اولاد ہے۔بچپن سے وہ اپنی ماں کو ناچنے کے ساتھ ساتھ الگ الگ لوگوں سے ملتے ہوئے دیکھتی ہے اور ہمیشہ اس تذبذب میں رہتی ہے کہ آخر یہ کون لوگ ہیں جن سے اماں ملتی ہیں۔اپنی نئی پہچان بنانے کی خواہش کے لئے دہلی پہنچتی ہے۔ جہاں پر اسے مسلمان ہونے کی بنا پر بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے علاوہ وہ یہاں کئی پارٹیوں کو دیکھتی ہے مثلاً بی۔جے۔پی،آر۔ایس۔ایس، بخاری کے علاوہ شہاب الدین کو دیکھتی ہے جو جنتا کا بھلا کرنے والا ہے مگر ان میں سے کوئی مسلمانوں کا بھلا کرنے والا نہیں ہے۔یہاں تک کہ مسلمان عورتوں کے متعلق یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ وہ پردے کے بغیر دفتر یا باہر کا کام نہیں کرسکتیں۔اس لئے افروز اپنا نام بدلنے پر مجبور ہوتی ہے اور وہ اپنا نام انجو رکھتی ہے۔مگر اسی نام کے ساتھ ساتھ وہ اپنی شناخت کھوتی ہے۔افروز نوکری کے واسطے کافی جدو جہد کرتی ہے مگر کہی نوکری نہیں ملتی۔جہاں پر بھی وہ انٹرویو کے لئے جاتی ہے لیکن ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے انہیں کئی سوالوں کے جوابات دینے پڑتے ہیں مثلا:

''نو ویکنسی مس افروز۔۔۔۔تم مسلمان ہو۔۔۔۔۔معاف
کرنا۔۔۔اس لئے پوچھ رہا ہوں۔۔۔۔مسلمان لڑکیاں

ایسی بہت کم ہوتی ہیں جواس طرح اسٹرگل کرنے باہر نکلتی
ہے۔۔۔۔۔۔تمہارے یہاں اس قدر پردہ ہے۔۔۔۔۔بائی
داوے۔۔۔۔۔آگے ویکنسی نکلی تو۔۔۔۔۔'' ۲۲

افروز کے کردار کو ذوقی نے ایک ہمدرد، جذباتی لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر اور انصاف پرست کے طور پر ناول میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی ماں اور بدی ماما کو انصاف دلانے کے لئے جاگیرہ جیسے خطرناک شخص کے خلاف جدوجہد کر کے اس کا اصلی چہرہ سب کے سامنے لانے کی کوشش کرتی ہے۔

شعیب بھی اس ناول کا اہم کردار ہے جو ایک مسلمان لڑکے کا رول ادا کرتا ہے۔ شعیب مسلمان ہونے کی وجہ سے ایک بے روزگار نوجوان ہے۔ شعیب کے ذریعے ذوقی نے مسلمانوں کے مسائل کی عکاسی کی ہے مثلاً ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔ وہ آجکل کس ذہنی تناؤ سے گذر رہے ہیں۔ یا یہ کہ سیاست نے اسے کس طرح گمراہ کر دیا ہے۔ شعیب کا کردار ایک ایسا کردار ہے کہ وہ حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتا نہ ہی وہ حالات سے لڑتا ہے بلکہ وہ اس کے بجائے حالات سے فرار ہونے کا راستہ نکالتا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے افروز کو نام بدل کر نوکری تلاش کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ شعیب جب ونے کا قتل کرتا ہے تو افروز سے کہتا ہے:

''ہاں میں نے قتل کر دیا۔ نہ کرتا تو وہ میرا کر دیتا۔'' ۲۳

اس ناول میں ذوقی نے ان کرداروں کے ذریعے آزادی کے بعد کے مسلمانوں اور مشترکہ تہذیب کا نوحہ بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کا المیہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و جبر، فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمان ہونے پر بے روزگاری کی مشکلات، غرض ایسے مسائل ہیں جس کو ذوقی نے بے باک اور نڈر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں ذوقی لکھتے ہیں:

''مسلمان ۱۹۹۰ء میں لکھا گیا تھا لیکن آج دنیا کافی بدل چکی
ہے۔ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت اور اس کے بعد
ہندوستان میں ہونے والے دنگے، بھرٹاڈا اور پوٹا، گودھرا اور
گجرات، ہندوستانی مسلمان کی مستقبل کی تواریخ بد سے بدتر

> ہوتی جارہی ہے۔افسوس کے ذوقی کا ۱۹۹۰ء کا سوال اب بھی جواب کا منتظر ہے۔ ۲۰۰۱ء کے بعد اب یہ سوال پورے دنیا کے سامنے ہے، دنیا کی دو بڑھتی قومیں ایک دوسرے کے سامنے اور یہ ڈر کہ ایک کی آنکھ لگ گئی تو دوسرا چھرا بھونک دے گا۔۔۔،اور مجبوری یہ ہے کہ ہم ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں ایک آسمان ایک چھت کے نیچے۔'' ۲۴

ناول ''پوکے مان کی دنیا'' کرداروں کے لحاظ سے ایک بہترین ناول ہے۔اس میں جو کردار اہمیت کے حامل ہیں وہ روی، کنچن اور سنیل کمار رائے، اسنیہہ، تتن، ریا،مولانا بخاری،شہاب الدین،نکھل اڈوانی،مسز کھرانہ،مسز بھاٹیہ،منتری جی وغیرہ۔

اس ناول کا مرکزی کردار سنیل کمار رائے ہیں جو کہ ایک جج ہیں۔وہ دور اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کے ذمہ دار فرد ہیں۔وہ جرم کے بجائے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ جرم کیوں اور کیسے سرزد ہوا اور وہ ہمیشہ سماج یا معاشرے میں ان ہی وجوہات کو ڈھونڈنے اور دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا ماننا یہ ہے کہ صرف ایک جرم کو سزا دینے سے پورے جرم کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ ہمیں ان کی بنیادی جڑوں تک جانا چاہیے اور پھر وہیں سے ان کا خاتمہ کرنا چاہیے۔سنیل کمار رائے ایک باعمل،سنجیدہ اور فرض شناس کردار ہے۔سنیل کمار رائے اپنے پیشے کا لبادہ اوڑھ کر جینا نہیں چاہتے۔ان کے جذبات ہیں،خواہشات ہیں۔گھر کا ہر فرد یہ بھول گیا ہے کہ سنیل کمار رائے ایک شوہر ہے، باپ ہے، دوست ہے اور ہماری طرح ایک انسان بھی ہے۔ان سے زندگی کے ہر معاملے پر بات ہوسکتی ہے۔مگر افسوس اس بات کا ہے کہ کوئی بھی اسے ایک باپ،شوہر اور دوست کے اعتبار سے بات نہیں کرتا۔سب بات کرتے ہیں تو پیشے کو دیکھ کر یا جج مان کر۔ذوقی نے سنیل کمار رائے کے ذریعے سے یہ باور کرایا ہے کہ بڑے سے بڑا شخص چاہے وہ ڈاکٹر ہو،کلکٹر ہو، پروفیسر ہو یا انجینئر ہو یا کوئی اور ہو۔وہ پہلے ایک انسان ہی تو ہوتا ہے،اس کے پاس بھی دل ہوتا ہے،خواہشات کے علاوہ احساسات اور جذبات ہوتے ہیں۔وہ اپنے آپ کو باٹنا چاہتے ہیں مگر افسوس تو تب ہوتا ہے جب سنیل کمار رائے کے بچے ان کے کمرے کو لاک اپ کہتے ہیں۔سنیل کمار رائے اس بات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''لاک اپ۔۔۔یعنی میرا کمرہ۔بچے اس کمرے کولاک اپ کہتے
ہیں۔لاک اپ جہاں قیدی رہتے ہیں۔قیدی کون ہے؟ میں ہوں
قیدی۔اپنے گھر کے اس لاک اَپ میں بند۔۔۔پتہ نہیں کب کیسے
میرے اس کمرے کا نام لاک اپ پڑ گیا۔''　　۲۵

ناول میں روی کنچن ایک بارہ سال کا بچہ ہے۔یہ اس ناول کا ایک ایسا کردار ہے جس کے ارد گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔روی کنچن عام بچوں سے بہت ہی مختلف ہے ہمیشہ اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔وہ اپنا سارا وقت ٹی۔وی سیریلز کے ساتھ گذارتا ہے خاص کر کے سیریل ''پوکے مان''۔اس سیریل کو وہ بار بار دیکھتا ہے۔اس کے علاوہ پوکے مان کے کارڈ،ٹیٹو اور پوسٹرس جمع کرنے کا بڑا شوقین ہے۔ناول نگار نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''یقیناً وہ بچہ ہے۔پوکے مان پسند کرنے والا بچہ۔''۔۔۔۔بس
پوکے مان کارڈس۔۔۔۔سارا سارا دن۔۔۔۔ٹی۔وی۔
۔۔۔۔، پوکے مان کی دنیا۔۔۔۔کرسی کے دوسری طرف منہ
کئے روی کارڈس سے کھیل رہا تھا۔۔۔۔بچہ اپنے کھیل میں اس
طرح منہمک تھا کہ اسے کسی کی پرواہ ہی نہ تھی''　　۲۶

ذوقی نے یہاں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایسی چیزوں سے بچوں کو دور رکھنا چاہئے۔جس سے ایک بچہ برائی کی طرف جا سکتا ہے۔ذوقی نے بچوں کی نفسیات کی عکاسی بہترین انداز میں کی ہے ان کا ماننا ہے کہ بچہ جو کچھ دیکھتا ہے اسے وہ بغیر سوچے سمجھے اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔بالکل ویسے ہی جیسے روی کنچن برائی اور اچھائی کے بغیر غلط کام کر بیٹھتا ہے۔اس ناول میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور دکھایا گیا ہے جہاں بچے اپنے وقت سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ماں باپ کے پاس اپنے بچوں کے لئے وقت نہیں ہے۔انہوں نے بچوں کی نفسیات کے ذریعے اس دنیا کا نقشہ کھینچ کر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے کرادر ہمیں حقیقت سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ان کا ناول ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' کردار نگاری کے لحاظ سے ایک اہم ناول

ہے۔اس ناول میں کئی کردار ہیں جیسے پروفیسر ایس (مرکزی کردار کی حیثیت)،احمد علی،سندیپ دا، پرویز سانیال، سیما،ادیتی سانیال، چارو سانیال،غلام محمد،جینی کشواہا وغیرہ۔

اس ناول کا اہم کردار پروفیسر ایس جس کا اصلی نام صدرالدین پرویز قریشی ہے۔ان کی شخصیت کو ڈھالنے میں ذوقی نے کافی محنت کی ہے اور ہمارے سامنے ایک ایسا کردار ابھرتا ہے جو ایک نرم گفتار، بے حد پر کشش شخصیت کا مالک، اپنی تحریروں سے جادو جگانے والا،لوگوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانے والا،لوگوں کا استحصال کرنے والا اور جنسی طور پر بے حد سفاک شخص ہمارے سامنے آتا ہے۔ پروفیسر ایس کا کردار جھوٹے، مکار اور فریبی شخص کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ سچ سے بھاگنے والا،غرور اور تکبر کی چادر میں لپٹا ہوا شخص ہے۔ محلے کے سارے لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔

دراصل پروفیسر ایس، پرویز سانیال کو اپنا کلون (Clone) بنانا چاہتا ہے۔ذوقی نے نہ صرف اس کی نفسیاتی خواہشوں کا مذاق اڑایا ہے بلکہ اس کی دھجیاں اڑائی ہیں۔اگرچہ پروفیسر ایس پرویز سانیال کو مستقبل بنانا چاہتا ہے لیکن اپنی تمام تر کاوشوں کے باوجود پرویز کے اندر اپنی سفاکی کی منتقلی نہیں کرپاتا۔ پرویز اپنے دس سالہ تجربے میں پروفیسر سے شدید نفرت کرنے لگتا ہے۔انتہا یہ ہے کہ وہ اسے پستول سے قتل کرنا چاہتا ہے کیونکہ پروفیسر نے پرویز سانیال کا سب کچھ اپنے بس میں کرلیا ہے۔

''مجھے اس کا قتل کر دینا چاہئے۔۔۔۔۔
مگر کیوں؟
کیونکہ اس نے مجھے۔۔۔۔۔۔آنکھوں میں ڈھیر سارا
اندھیرا جمع تھا آنکھیں میری تھیں مگر ان آنکھوں سے
دیکھتا وہ تھا۔۔۔۔۔۔ پاؤں میرے تھے مگر چلتا وہ تھا
احساس میرے تھے،حاوی وہ ہو جاتا تھا پروفیسر
دماغ میرا تھا،مگر سوچتا تھا پروفیسر۔۔۔۔آنکھیں، ہاتھ، پاؤں،
جسم، یہاں تک کہ دماغ۔۔۔۔کسی پر بھی میرا اختیار کہاں
تھا۔۔۔'' ۲۷

پروفیسر کی کم سن بیوی سیما جو اس ناول کا سب سے زیادہ متاثر کرنے والا کردار ہے۔ سیما پل پل اس کے ساتھ مرتی رہی ہے اور پرویز کی بانہوں میں جا کر زندگی کا نشہ حاصل کر چکی ہے۔ وہ اسے پستول سے مارنے کے بجائے اس کو عجیب سی بیماری میں مبتلا کر کے مارنے کا پلان بناتی ہے۔ ایسے سفاک شخص کا انجام کچھ ایسا ہی ہوتا ہے، جب اس کے بے حد قریبی لوگ ہی اس کے خاتمے کا سبب بنتے ہیں۔

اس ناول میں احمد علی کا کردار متاثر کن ہے کیونکہ ناول کی کہانی کا ایک حصہ ان پر بھی مبنی ہے۔ کبھی کبھی احمد علی کا کردار اس ناول میں پروفیسر ایس سے بھی مضبوط نظر آنے لگتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس کردار کو نہ جانے کتنے رنگوں سے سجایا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں یہ ہر وقت الگ الگ رنگ میں نظر آتا ہے۔ کبھی وہ بے روزگاری کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی وہ آندولن کاری کا مریڈ بننے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ مگر دوسرا رخ یہ ہے کہ احمد علی ایک دیندار اور مذہبی آدمی ہے اس لئے وہ ادیتی کے کمرے میں نماز پڑھ کر مسلمان ہونے کی کہانی بیان کرتا ہے اور وقت آنے پر وہ ایک جذباتی باپ کا رول بھی نبھاتا ہے۔

احمد علی اپنے بیٹے کو بڑا بنانا چاہتا تھا۔ ان کو پہلے ایسا لگتا تھا کہ اگر میرے بیٹے کو پروفیسر جیسا گائڈ اور استاد ملے گا تو اس کی زندگی بن جائے گی مگر احمد علی کو کیا پتہ کہ پروفیسر جیسے مکار اور فریبی کی وجہ سے میرے بیٹے پرویز سانیال کی زندگی بنے گی نہیں بلکہ بگڑ جائے گی۔ وہ پاگل جیسا ہو جاتا ہے جب وہ اپنے بیٹے کی کیفیت کے بارے میں سوچنے لگتا ہے تو اس کے کانوں میں بار بار یہ آواز گونجتی رہتی ہے کہ یہ سب پروفیسر کی وجہ سے ہو رہا ہے، تمہارے بیٹے کا مجرم یہی پروفیسر ہے۔ ایک دن جب بوڑھا ڈاکٹر احمد علی کو پروفیسر کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے تو احمد علی تب ان کی باتوں کو مذاق سمجھتا ہے۔ بوڑھا ڈاکٹر ہمیشہ یہی کہتا تھا۔:

''ایک دن دیکھنا۔۔۔احمد علی، تیرے بیٹے کو پوربیا
ہوالے جائے گا۔۔۔اُس کے چکر میں مت پڑ۔'' ۲۸

لیکن اس وقت احمد علی کو پرویز کی شخصیت کا نشہ سوار تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی ایک بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اب ان کے اندر دل سے صرف یہی آواز اٹھتی ہے:

''سوچتے کیا ہو۔۔۔وہی ہے۔وہی۔۔۔۔تمہارا مجرم۔۔۔۔
تمہارے بیٹے کا۔احمد علی۔۔۔۔۔پروفیسر کو مت معاف کرنا۔

اس نے تمہارے یقین کا خون کیا ہے۔'' ۲۹

مشرف عالم ذوقی کے ناول ''آتش رفتہ کا سراغ'' میں کردار اپنی ایک انفرادی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ان کرداروں کے ذریعے ہمارے سامنے مسلمانوں کی بے بسی، لاچاری، مجبوری اور مظلومی کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ قاری کو ان کی زندگی کے ہر پہلو کو دکھانے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ناول کے اہم کرداروں میں ارشد پاشا، تغلق پاشا، انور پاشا، تاجور پاشا، اجے سنگھ تھاپڑ، صفدر علی، انسپکٹر ورما، احمد صاحب وکیل اور اسامہ پاشا وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نسوانی کرداروں میں رباب، نجمہ، صوفیہ، شمیمہ، آنندی، صبیحہ وغیرہ ہیں جو ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اصل کردار اس ناول میں 'وقت' ہے جو ایک کہانی کو دوسری کہانی کے ساتھ جوڑنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس کی بڑی مثال ''ارشد پاشا'' ہے جو صرف ایک مسلمان کردار کے طور پر سامنے نہیں آتا بلکہ ہندوستان میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

اس ناول کا ایک اہم کردار ''اسامہ'' ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جسے ایک لمبے عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے کم عمری میں ہی بڑے بڑے سادھوؤں اور دانشوروں کو یہ کہنے پر مجبور کیا ہے کہ اس کا مقصد کتنا عظیم ہے۔ ہم نہیں سمجھ رہے ہیں کہ آخر وہ کر کیا رہا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے مذہب پر قائم رہنے والا۔ جس کی وجہ سے یہ سب کو اپنا بنانے میں لگا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس کردار کے لئے ایسا نام رکھا ہے جس کے خوف سے ہندوستان کیا بلکہ پوری دنیا لرز رہی ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ بھی اس نام سے خوفزدہ ہے۔:

> ''یہ نام اچانک اسے بھاری پڑنے لگا تھا۔۔۔ پہلے جو لوگ اس
> نام کی تعریف کرتے تھے، اچانک ہی یہ نام ان کے لئے خطرے
> کا سائرن بن گیا تھا۔ ۱۱/۹ کے حادثے نے اسامہ بن لادن
> کو دہشت گردی کی علامت بنا کر پیش کیا تھا۔'' ۳۰

اسامہ اب ان حالات سے تنگ آ گیا تھا وہ اس منظر سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ مگر کیا کرتا ہر لمحہ وہ زیادہ سے زیادہ اس منظر کی زد میں خود کو محسوس کر رہا تھا۔ جو بھی پہلی بار یہ نام سنتا تھا وہ چونک جاتا تھا۔ لیکن نام میں کیا

ہے انسان تو اس کے کام سے پہچانا جاتا ہے۔اس بات کا ذکر ناول میں ارشد پاشا اس طرح کرتے ہیں :

> ''شکسپئر نے کہا تھا، نام میں کیا رکھا ہے۔۔۔لیکن یہاں یہ نام
> میرے بیٹے کی پریشانیوں کا باعث بن گیا تھا۔میری مجبوری یہ تھی
> کہ اب میں اس نام کی جگہ کوئی دوسرا نام نہیں رکھ سکتا تھا۔لیکن
> مجھے کیا پتہ تھا کہ ایک دن یہ نام وقت کی زنبیل سے ایک نئے
> چہرے کو برآمد کرلے گا۔۔۔ایک ایسے نئے چہرے کو جسے میں
> پہچان بھی نہیں پاؤں گا۔''   [۱۳]

ذوقی نے یہاں اس ناول میں اسامہ کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح یہاں اسامہ پر ایک دہشت گرد ہونے کا الزام لگ رہا ہے جبکہ وہ دہشت گرد نہیں ہے بلکہ ایک عام مسلمان کی حیثیت رکھتا ہے۔اسی طرح ہندوستان کے کروڑوں مسلمان دہشت گرد نہیں ہوسکتے ہیں۔اسامہ اس سسٹم سے تنگ آ گیا ہے اور ایک دن اسی پریشانی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔وہ الگ الگ شہروں میں جا کر الگ الگ لوگوں سے ملتا ہے اور پھر ان سے مل کر ان کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن اہم بات یہ ہے کہ اسامہ اپنی نئی منزل ڈھونڈنے کے لئے دہلی سے میرٹھ، میرٹھ سے ہری دوار، ہری دوار سے اجودھیا، اجودھیا سے شملہ جاتا ہے۔ لیکن ہر جگہ وہ اپنی پہچان بدل بدل کر جاتا ہے اور ہر جگہ اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے جس کی وجہ سے ان شہروں کے لوگ اس سے متاثر ہوکر ہمیشہ اس کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ناول نگار نے اس کردار کے ذریعہ یہ بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینا یا ثابت کرنا کس قدر آسان کام ہے۔

اس ناول کا ایک اور کردار تھاپڑ ہے یعنی اجے سنگھ تاپڑ۔یہ ایسا کردار ہے جو انصاف پسند ہونے کے ساتھ ساتھ، ہمدرد انسان اور سیکولر ذہن رکھنے والا انسان ہے۔تھاپڑ ارشد پاشا کا قریبی دوست ہے۔وہ ارشد پاشا کا قدم قدم پر ساتھ دیتا ہے۔جب بٹلہ ہاوس انکاونٹر ہوتا ہے تب وہ اسامہ کو اپنے گھر میں چھپا رکھتا ہے اور جب اسامہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے تب وہ ارشد پاشا کا ساتھ دیتا ہے۔

رباب اور ارشد پاشا کو اسامہ کے جانے کے بعد جو غم ملا ہے اس غم میں تھاپڑ ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور پھر ارشد پاشا کے ساتھ اسامہ کی تلاش میں بھیس بدل کر ہر جگہ جاتا ہے۔تھاپڑ اصل میں سنگھ کا آدمی ہے،

وہ سنگھ کے لئے کام کر رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کو توڑنے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رہ کر ان کی کمزوریوں کو جاننا چاہتا ہے۔ اس کردار کی مکاری کا ایک خاص پہلو ہے کہ کوئی اس کو پہچان ہی نہیں پاتا۔ اس کے بارے میں تھاپڑ خود بتاتا ہے۔۔۔

> ''میں سنگھ کا آدمی ہوں۔ اور سنگھ کا آدمی کہاں نہیں ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے جو آدمی آپ کو تسلی اور دلاسہ دے رہا ہو، وہ بھی سنگھ کا ہی آدمی ہو۔ جو آدمی آپ کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو، وہ بھی سنگھ کا آدمی ہو۔۔۔ جو آدمی آپ کے گھر کا نوکر، خدمتگار یا گہرا دوست ہو، وہ بھی سنگھ کا آدمی ہو۔۔۔ سنگھ کے آدمی کو کہاں کہاں تلاش کریں گے آپ۔۔۔؟ وہ کسی بھی بھیس میں، کسی بھی روپ میں آپ کے پاس ہو سکتا ہے۔۔۔ اور آپ اسے پہچان بھی نہیں پائیں گے۔'' ۳۲

تھاپڑ نے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا ہے کہ میں تب کاشی کے کالج میں ہی پڑھائی کر رہا تھا جب میں سنگھ کا ممبر بن گیا، میں نے باقاعدہ اس تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ وہ اپنے کام میں کوئی دخل اندازی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسکا جو مشن تھا اس کے لئے اسے ایک مسلمان خاندان کی ضرورت تھی۔ اس کو جب ارشد پاشا مل جاتا ہے تو ساری پریشانی ختم ہو جاتی ہے اور ارشد پاشا سے دوستی کا ہاتھ ملا کر اس کے گھر آنا جانا شروع کرتا ہے لیکن جب ناول کے آخری صفحات پر تھاپڑ کی سچائی سامنے آتی ہے تو ارشد پاشا چونک جاتا ہے۔ ذوقی تھاپڑ کے ذریعے اس سچائی سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں جس پر کبھی میڈیا نے بات نہیں کی ہوگی کیونکہ تھاپڑ کی خبر بیچ ہو کر بھی دبائی جاتی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ رشتے کمزور پڑ گئے، انسانی قدریں ختم ہو چکی تھی، معصوم مرد وعورت اور بچوں کا قتل کیا جا رہا تھا، نہ جانے کتنے گھر جلا دیئے گئے تھے۔ ذوقی نے اس ناول میں ان کرداروں کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف ظلم و جبر، لاچاری اور مجبوریوں کو دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس لاچاری اور مجبوری کو ہم نے اپنا مقدر سمجھ لیا ہے۔ ہم کبھی مذہب میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور کبھی فلسفے کا

سہارا لیتے ہیں۔ یہاں ناول میں مسلمانوں کے ہر جگہ نفرت اور دہشت گرد ہونے کا الزام بار بار لگایا جاتا ہے۔:

''چاروں طرف تو دنگے بھڑک رہے ہیں۔ مارا کون جا رہا ہے۔۔۔۔۔مسلمان ۔۔۔۔ ہر جگہ نفرت کا شکار ہے۔ مسلمان۔ ۔۔۔۔مسلمان۔۔۔۔آتنک وادی۔ دہشت گرد ۔۔۔۔'' ۴۳

ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' ذوقی کا ایک اہم ناول ہے۔اس ناول کے کردار اپنی ایک الگ اور منفرد اہمیت رکھتے ہیں۔اس ناول کے کئی کردار ہیں مثلاً نور محمد، نظر محمد، سارہ، دڈو، ابو بابا، حلیمہ، پروفیسر نیلے، عبد الرحمٰن کا ردار، وسیع کاردار، مولوی محفوظ، نادرہ، رقیہ، نگار وغیرہ لیکن یہاں ہم ناول کے اہم کرداروں کا جائزہ لے گے۔

ناول کا اہم کردار ''نور محمد'' ہے۔ یہ اس ناول کی روح ہے۔نور محمد ایک ایسا بدقسمت کردار ہے جو شروع سے ہی محبت کا پیاسا اور مارا ہے۔جس کو زندگی میں نہ ماں کا پیار نصیب ہوتا ہے، نہ بیوی کا اور نہ ہی بچوں کا۔ وہ زندگی کے آخری لمحات تک مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ پہلے وہ اپنی ماں کی دشوار گذار زندگی کا سامنا کرتا ہے پھر نادرہ سے محبت کی جسکو وہ مرتے دم تک نبھاتا ہے۔جس کا نتیجہ 'نگار' ہے۔نگار ان کی معذور بیٹی ہے جس کا رونا نور محمد کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔لیکن نور محمد کو اس کا رونا پریشان نہیں کرتا بلکہ نگار کا رونا اس کو سکون دیتا ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی نگار کے لئے ہی صرف کرتا ہے۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ پورے معاشرے سے اپنا رشتہ منقطع کرتا ہے۔ جب نگار ۱۸ سال کی ہوتی ہے تو نور محمد ایک شفیق اور مہربان باپ کی طرح اس کی ہر خواہش کو پورا کرتا ہے۔نور محمد کو اپنی نادرہ کی محبت زندہ رکھنے کے لئے یہ سب کرنا پڑتا ہے مگر قسمت میں کچھ اور لکھا تھا اور وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہئے تھا:

''ہاں۔۔۔۔،
اس نے لمبی سانس بھری اور دھماکہ کر دیا۔۔۔میں نے طلب پوری کر دی۔۔۔پوری کر دی۔۔۔،۔۔۔،۔۔۔۔میں خوف

زدہ ہوکر پیچھے ہٹتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔’کیا۔۔۔۔۔؟‘اور کوئی

راستہ نہیں تھا۔۔۔۔۔،وہ رو رہا تھا۔۔۔۔۔ Now

she is pregnant---۔‘‘ ۳۴

پردہ فاش ہونے پر نگار اب اپنے باپ کو مجرم کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے۔وہ نور محمد کو مارتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ نفرت کرنے لگتی ہے۔لیکن اسی دوران ’’جینی‘‘ پیدا ہوتی ہے اور پھر دو سال بعد ہی نگار کا انتقال ہو جاتا ہے۔یہاں پھر نور محمد اپنی محبت کی نشانی کے لئے سب کچھ کرتا ہے کیونکہ وہ مجبور ہے۔نور محمد شہر چھوڑ کر گاؤں چلا جاتا ہے اس کو لگتا ہے کہ یہ بات چھپ جائے گی کہ نگار ماں بننے والی ہے لیکن گاؤں میں یہ بات خود ہی پھیل جاتی ہے حالانکہ انہوں نے گاؤں والوں سے ہر بات چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی جب عبدالرحمٰن کا رداراس سے ملاقات کے لئے گاؤں آتا ہے تو نور محمد اس سے کہتا ہے۔:

’’نگار حاملہ تھی۔۔۔اور کچھ دنوں بعد یہ بات سارے گاؤں
والوں کو معلوم ہونی ہی تھی۔ ۔۔۔۔،وہ رو رہا
تھا۔۔۔۔۔ایک بیٹی ایک بیوی بن گئی تھی۔۔۔میں کیا کرتا
بھیا۔۔۔۔کیسے برداشت کیا ہوگا یہ سب۔۔۔آپ سوچ سکتے
ہیں۔۔۔۔آپ نہیں سوچ سکتے۔یہ عذاب ہے۔قدرت کا
عذاب۔۔۔اور قدرت نے اس عذاب کے لئے میرا انتخاب
کیوں کیا۔میں بس یہ نہیں جانتا۔۔۔۔‘‘ ۳۵

زندگی گذارنے کے لئے اور نادرہ سے کئے گئے وعدے کو پورا کرنے کے لئے نور محمد ’’جینی‘‘ کو زندہ رکھتا ہے۔اس وجہ سے وہ اپنا شہر، علاقہ اور یہاں تک کہ اپنا وطن بھی چھوڑ دیتا ہے۔اس ناول میں ذوقی نے نور محمد کو بے بس اور لاچار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مجبور باپ کی حیثیت سے قاری کے سامنے لایا ہے اور نور محمد اپنے حالات سے پریشان ہو کر اپنے بھائی جیسے دوست عبدالرحمٰن کاردار کو خط لکھ کر اپنے گاؤں ولاس پور بُلاتا ہے۔:

’’بھیا۔۔۔بس اسی لئے آپ کو خط لکھا۔۔۔کون ہے آپ کے

> سوا میرا۔۔۔۔اور میں۔۔۔۔۔؟ کس امید پر بلند شہر کے رشتہ داروں سے ملنے جاتا۔۔۔۔انہیں کیا بتاتا۔۔۔۔۔جینی کو بھی کچھ نہیں معلوم۔۔۔آپ سمجھ رہے ہیں نا بھیا۔۔۔،لیکن قدرت کا ظلم کہ اس کی ماں بھی میری بیٹی تھی۔۔۔۔وہ رو رہا تھا۔۔۔ قدرت کا انتظام۔۔۔۔اور یہی تو جاننا ہے مجھے کہ اس انتقام کے لئے خدا نے میرا انتخاب ہی کیوں کیا۔'' ۳۶

نگار اس ناول کے اہم کرداروں میں سے ایک ہے۔نگار کا کردار اس ناول میں ایک زندہ لاش کی طرح ہوتا ہے۔یہ نور محمد اور نادرہ کی بیٹی ہے۔جو ایک معذور ہے اور اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔اسکا دماغ جسم کو قابو نہیں کر پاتا۔وہ اس ناول میں بے بس ہونے کے ساتھ ساتھ لاچار اور مجبور نظر آتی ہے۔نگار کی پیدائش کے دو سال بعد ہی ان کی ماں نادرہ کا انتقال ہوتا ہے۔نگار کو کسی چیز،فرد،رنگ و بو یا جذبات کا احساس نہیں ہوتا۔ان کا سارا کام نور محمد کو کرنا پڑتا ہے۔ان کو کھلانے، پلانے،نہلانے یہاں تک کہ کپڑے بدلنے کا کام اسی کو دیکھنا پڑتا ہے۔جب وہ ۱۸ سال کی ہوتی ہے تب اس کی زندگی میں کوئی بدلاؤ نہیں آتا لیکن ایک روز جب وہ کسی بدکاری کی شکار ہو جاتی ہے تو ان کے اندر ایک انسانی احساس جاگتا ہے جس کی وجہ سے وہ غصہ کرتی ہے۔اس کردار کے بارے میں ذوقی ایک انٹرویو میں رضوانہ شمسی سے گفتگو کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

> ''نگار کا کردار میرے لئے ایک مشکل کردار تھا میں نے اس کردار میں آزادی کے ۶۵ برسوں کے ہندوستان کو روتا بلکتا ہوا محسوس کیا تھا۔۔۔یہ کردار میرے لئے ایک ایسا کردار تھا جس میں بہت حد تک میں نے اس ملک سے بہت حد تک میں نے اس ملک میں مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کو بھی محسوس کیا تھا۔۔۔نگار ایک علامت بن جاتی ہے۔۔۔یہ وہی وقت ہے جب ملک فرقہ وارانہ فسادات کی آندھی میں کھو چکا ہے۔۔۔۔ آڈوانی جی کی رتھ یاترائیں نفرت سے بھرا ہوا ماحول پیدا کر رہی تھیں اسی پر آشوب موسم میں نگار پیدا ہوتی ہے۔آج کی

حقیقت کو پیش کرنے کے لئے مجھے نگار سے بہتر کردار کوئی دوسرا

نظر نہیں آیا۔'' ۳۷

اس ناول کا ایک اور اہم کردار ''عبدالرحمٰن کاردار'' ہے۔ ناول کا ایک بڑا حصہ اس کردار کے ارد گرد ہی گھومتا ہے یعنی یہ پورا ناول شروع سے آخر تک چھا جاتا ہے۔ ناول کا راوی بھی خود اس کردار کی شکل میں قاری کے سامنے آ جاتا ہیں۔ دراصل ذوقی نے اس کردار کو حال کے مسلمانوں کی علامت بنا کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ عبدالرحمٰن کاردار آزادی سے ایک گھنٹہ پہلے ہی ایک غلام ملک میں جنم لیتا ہے۔۔۔ اور ایک گھنٹہ بعد ہی ملک کو آزادی مل جاتی ہے۔ ذوقی اس کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ کردار اپنی جگہ ایک مضبوط کردار ہے۔۔۔ عبدالرحمٰن جیسے
لوگ ہمارے آس پاس آسانی سے مل جائیں گے۔۔۔ ایسے
لوگ دولت پیدا کرتے ہیں۔۔۔ اپنی آسانی کے لئے گھر بناتے
ہیں۔۔۔ سکون سے رہنا چاہتے ہیں۔۔۔ اپنی سہولیت سے محبت
کرتے ہیں۔۔۔ لیکن محبت کے لئے کوئی جنگ نہیں لڑتے
۔۔۔ لیکن ایسے لوگوں کا مشاہدہ بہت گہرا ہوتا ہے۔۔۔ میں نے
عبدالرحمٰن کاردار کے اسی مشاہدے سے فائدہ اُٹھایا اس لئے
ناول کا بڑا حصہ اسی کردار کے اِردگرد گھومتا ہے۔۔۔۔ اس
پورے ناول میں عبدالرحمٰن کاردار دراصل ایک فوٹوگرافر ہے جو
آزادی کے بعد سماج میں آئی ہوئی تبدیلیوں کی تصویریں اتار رہا
ہے۔'' ۳۸

دراصل عبدالرحمٰن کاردار پروفیسر نیلے کا دوست ہوتا ہے اور وہ بے چین رہتا ہے کہ کب میں پروفیسر نیلے کو اس کی زندگی میں آئی نئی تبدیلیوں سے آگاہ کروں۔ کاردار پہاڑیوں کے بیچ ایک گھر میں اپنی (۱۸) اٹھارہ سالہ پوتی سارہ کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ شروع میں ہی جب عبدالرحمٰن کاردار کو خط ملتا ہے تو اس خط کو پڑھنے کی ہمت ہی نہیں کر پاتا۔ وہ ماضی کے یادوں میں چلا جاتا ہے جہاں اس کو نادرہ کی محبت یاد آتی ہے جو سفیان ماموں کی بیٹی اور ان کی محبوبہ ہے۔

اصل میں عبدالرحمٰن کا ردار ایک سچا عاشق ہونے کے ساتھ ساتھ دردمند اور وفادار شخصیت کا مالک ہے۔ وہ نگار کو اپنی بیٹی سمجھ کر اس کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ عبدالرحمٰن کا ردار نادرہ سے تو محبت کرتا ہے مگر اس کو پانے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی جد و جہد کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن جب وہ نادرہ کو یقین دلاتا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں تو نادرہ اسی محبت کا واسطہ دیتے ہوئے نگار کا خیال رکھنے کے لئے عبدالرحمٰن کا ردار سے وعدہ لیتی ہے۔

عبدالرحمٰن کا ردار صرف بدلتی ہوئی قدروں اور نئی تہذیبوں کو ہی نہیں بلکہ نئے تقاضوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

''پروفیسر نیلے'' بھی اس ناول کا اہم حصہ ہے۔ یہ عبدالرحمٰن کا ردار کے پڑوسی اور دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک راز دار ہیں۔ پروفیسر نیلے ناول میں ایک مضبوط کردار کی شکل میں قاری کے سامنے آتے ہیں۔ اسی کردار کو عبدالرحمٰن کا ردار اپنی ماضی کی پرسوز کہانیاں سناتا ہے اور جب وہ بچوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ کے لئے خوشخبری ہے کہ سارہ واپس آ گئی ہے تو پروفیسر نیلے مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر عبدالرحمٰن کا ردار سے کہتے ہیں زندگی کتنی عجیب ہے ہم ساری عمر بچوں کے لئے زندہ رہتے ہیں پھر ایک زمانہ آتا ہے جب ہم بچوں کو دیکھنے کے لئے ترس جاتے ہیں اور ان بچوں کو پھر ہماری ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ پروفیسر نیلے ایک مذہب پرست انسان کے علاوہ تجربہ کار ہیں۔ ایک جگہ عبدالرحمٰن کا ردار کو کہتے ہیں۔

''دیکھو کا ردار۔۔۔۔،

پروفیسر نیلے مسکرائے۔۔۔کتنا خوبصورت شعر ہے۔۔۔۔۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

یہی کانچ کا باریک شیشہ ہماری دنیا ہے۔ یعنی ہماری اور تمہاری مہذب دنیا اور اسی باریک شیشے کی دنیا میں ہم اپنے رہنے کے لئے جتن کر رہے ہیں لیکن اگر ہم اور آپ اس باریک شیشے کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو یہ اتنا نازک اور باریک ہے کہ ہماری سانسوں سے بھی اس کو ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔ جب بھی ہم لوگ اس دنیا کو

دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم بھول جاتے ہیں کہ اوپر سے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے اور وہ ہے قدرت اور اسی قدرت نے عبدالرحمٰن کا کردار کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ اقتباس:

''پروفیسر نیلے ہنس رہے تھے۔۔۔تمہاری کہانی بھی تم نے کہاں
لکھی کا ردار۔۔۔، قدرت نے لکھی ہے۔۔۔اور قدرت جس
قدر حسین ہے، اتنی ہی سفاک بھی۔۔۔وہ تمہیں پتہ بھی نہیں چلنے
دیتی، اور تمہاری زندگی کے سفر کو موڑ دیتی ہے۔۔۔،'' ۳۹

''نالۂ شب گیر'' میں کئی کردار ہیں لیکن ان میں زیادہ اہم صوفیہ مشتاق احمد اور ناہید ناز ہیں۔ ''صوفیہ'' کا کردار معاشرے کے اس چہرے کی نقاب کشائی کرتا ہے، جہاں عورت گھر کی باندی ہے۔ بندشوں میں اس کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ خوف کی علامت بن کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ صوفیہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی، ناول کی ابتدا صوفیہ مشتاق احمد سے ہوتی ہے۔ وہ ایک بدقسمت لڑکی ہے جو ہمیشہ پیار اور محبت سے محروم رہی۔ اس کے والدین کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا۔ صوفیہ کے بھائی بہن سمجھتے تھے کہ وہ ان پر بوجھ ہے۔ اسی لئے اس کی شادی کسی سے بھی کرانا چاہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔

ناہید ناز اس ناول کا ایک اور اہم نسائی کردار ہے۔ یہ ایک باغی کردار ہے۔ ایک کردار جس کا جنم تو خوف سے ہوا ہے مگر وہ خوف کا خول اتارتے ہوئے پورے مرد سماج سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ ناہید ناز کا کردار ایک علامتی کردار میں ڈھل جاتا ہے جو صدیوں سے مردوں کے سائے میں ظلم و بربریت کی چھاؤں میں کراہ رہی ہے۔ تعلیم نسواں کو فروغ دینے کی کوشش رہی ہو یا عورت کو آزادی دینے کا معاملہ، اس حقیقت سے آنکھیں موندنے کی ضرورت نہیں کہ عورت کبھی آزاد نہیں ہو پائی۔ تعلیم حاصل کرنے، کیریئر بنانے اور روزگار پانے کے باوجود اس کی حیثیت مرد سے کم تر رہی ہے۔ ناہید ناز میں قوت برداشت کا مادہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کا وجود یہ سب قبول کرنے کو تیار تھا۔

ناہید ناز کا جنم ایک حویلی میں ہوا تھا جہاں بہت سے مرد رہتے تھے۔ ان میں ناہید ناز کے قریبی رشتہ دار کے ساتھ دور کے بھی رشتہ دار بھی شامل تھے۔ اور اسی دوران اس کو ایک حادثہ پیش آتا ہے کہ ناہید ناز کی چچیری بہن جس کی عمر ۱۷ سال کی تھی، وہ ماں بن جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے گھر میں طوفان آ جاتا ہے اور گھر

والے اسے زہر دے کر مار دیتے ہیں۔ناہید نکہت کی ہی عمر کی تھی۔ پہلے وہ مردوں سے بغاوت کرتی ہے۔۔۔وہ ان کے پاس جاتی ہے اور پوچھتی ہے کس نے مارا میری نکہت کو،لیکن ایک رشتہ دار ناہید کو ڈانٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بے غیرت اندر جاؤ۔جس پر ناہید ناز کو بہت غصہ آتا ہے کیونکہ وہ مردوں سے انتقام لینے کا اپنے دل میں ٹھان لیتی ہے اور وہ مرد کے پورے نظام کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

ان نسائی کرداروں کے ذریعے ذوقی نے سماج کی ان تلخ حقیقتوں کی عکاسی کی ہے کہ دور جہالت اور آج کے زمانے کی عورت یکساں ہے کیونکہ اس زمانے میں اس کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا اور آج کے اس دور جدید میں بھی اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔دور جہالت میں اس کو زندہ دفن کیا جاتا تھا اور آج اس کو زندہ دفن کیا جاتا ہے صرف طریقے بدل گئے ہیں۔آخر اس طبقے کے ساتھ اس طرح کی ناانصافی کیوں ہوتی ہے؟ دراصل آجکل کا انسان مادہ پرست بن گیا ہے جو اس طبقے کو صرف اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے اور اس کو استحصالی نظروں سے دیکھتا ہے۔

اس ناول میں ذوقی نے نسوانی کردار کی تخلیق میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔خدیجہ اور نازیہ اپی کا کردار ایسا ہے جو ظلم وستم اور زیادتیوں کو برداشت کرتی ہیں،وہیں صوفیہ مشتاق احمد اور ناہید ناز جیسے کردار تخلیق کیے ہیں جو آج کے دور کی مضبوط ارادوں والی عورت کی نمائندگی کرتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے مخصوص سماج میں یہ عورتیں اس قدر مجبور اور بے بس ہیں کہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک طرف تو عورت کو پوجا جاتا ہے لیکن دوسری طرف ایسا سلوک کیا جاتا ہے جسے بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

ذوقی نے ان نسوانی کرداروں کے ذریعے یہ دکھانے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ دور کے سماج میں عورتوں کو وہ مقام نہیں ملتا ہے جو ایک عورت کو ملنا چاہئے۔آج کے معاشرے نے ایک عورت کا گھر سے باہر نکلنا دشوار بنا دیا ہے۔جوں ہی وہ باہر قدم رکھتی ہے ہر انگلی اس کی طرف اٹھتی ہے اور ہر کوئی اس کو کسی نہ کسی طریقے سے ہوس کا شکار بنانا چاہتا ہے۔آخر کب تک ایسا ہوتا رہے گا۔کب تک عورت اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھے گی۔المیہ یہ ہے کہ عورت اپنے گھر میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتی ہے۔اگر چہ ایوانوں میں بلند

دعوے کیے جاتے ہیں کہ عورت مرد کے برابر ہے اور اس کو وہ تمام حقوق دیئے گئے ہیں لیکن یہ باتیں ایوانوں تک ہی محدود ہیں۔ اس ملک کی شہری ہونے کے ناطے وہ تحفظ کا حق رکھتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں مرد چاہے کتنی بڑی غلطی کیوں نہ کرے لیکن غلط ہمیشہ عورت کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ ذوقی نے ناہید ناز کے کردار کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج کی عورت کمزور نہیں ہے بلکہ وہ اب ناہید ناز کی طرح بہادر بن گئی ہے۔

''عقاب کی آنکھیں''، مشرف عالم ذوقی کا پہلا ناول ہے۔ جو انہوں نے صرف ۱۷ سال کی عمر میں لکھا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ''الف'' ہے جو چھوٹی سی عمر میں اپنے گھر کے آزادانہ ماحول میں انسانی فطرت کو دیکھتا ہے اور پھر اس کے ذہن پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک دن نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ الف اپنی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو کر اپنے اِردگرد تمام لوگوں سے نفرت کرنے لگتا ہے اور ایک دن یہ نفرت یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی نفرت کرنے لگتا ہے۔ یہ بارہ سال کا ایک بچہ ہے جس کے کردار کے ذریعے ذوقی نے بچوں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ناول کے بارے میں ذوقی ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> ''میرا پہلا ناول 'عقاب کی آنکھیں' میں بھی ایک بچہ ہے۔ جو اپنی معصوم آنکھوں سے دنیا کے جبر اور استحصال کا جائزہ لے رہا ہے۔ پہلے ناول سے ہی میں نے ایسے بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔۔ جنھیں سماج تو بچہ سمجھتا ہے لیکن وہ اپنی عمر سے بہت آگے نکل چکے ہوتے ہیں۔'' [۴۰]

مشرف عالم ذوقی نے الف کے کردار کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے ذریعے انہوں نے بچوں کی ذہنی کشمکش کی بیماریوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں ذوقی نے الف کو ملک کی علامت بنا کر پیش کیا ہے کہ کس طرح ہمارا ملک نہ جانے ایسی کتنی بیماریوں کا شکار ہے۔ الف اپنے منفی خیالات اور ذہنی سکون ڈھونڈنے کی تلاش میں ایک دن گھر سے بھاگ جانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کردار کے علاوہ ناول میں کئی ضمنی کردار شامل ہیں جو اس ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ ضمنی کرداروں میں الف کے

ماں باپ، بھائی بہن، بھابھی کے علاوہ پڑوسی مسز ڈولچی، الف کی دوست لزی کے ساتھ ایک ایسے ڈاکٹر کا کردار بھی ہے جو خود کبھی ایسی بیماری کا شکار رہ چکے ہیں۔

الف کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو اپنے والدین اور بھابھی کے درمیان قائم فطری، جذباتی تقاضوں کو نہیں مانتا اور پھر آہستہ آہستہ ایک نفسیاتی مریض بن جاتا ہے اور ذوقی نے اسی کم سن بچے کی نفسیات کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات کی عکاسی بھی انوکھے انداز میں کی ہے۔

اس ناول میں ڈاکٹر بھٹ ایک ضمنی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر بھٹ کا کردار ایک ایسا کردار ہے جس کا ماضی الف سے الگ نہیں ہے۔ ڈاکٹر بننے سے پہلے وہ ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا تھا۔ لیکن وہ سب سے نفرت نہیں بلکہ اپنی ماں سے کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی ماں کی بے راہ روی برداشت نہیں کرپاتا جو وہ اس کے باپ کے دوستوں سے ساتھ کرتی ہے اور آخر میں اس کی ماں سلینڈر پھٹ جانے سے مرجاتی ہے جس کا الزام بھٹ پر لگایا جاتا ہے۔ اس کی دماغی حالت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے اسے بری کردیا جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھٹ اس بیماری سے نکل آتے ہیں اور ایک کامیاب ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد انجم اپنی کتاب ''جہان فکشن'' میں ذوقی کی کردار نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ (مشرف عالم ذوقی) اپنے ڈکشن کا استعمال کردار کی حیثیت، اس کے معیار اور اس کی نفسیات دھیان میں رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عبارت میں یا کرداروں کے مکالمے میں ایسے جملے لکھتے جاتے ہیں جو ساخت کے اعتبار سے مختصر ہوتے ہیں مگر ان کے اندر جو گہرائی چھپی ہوئی ہے وہ قاری کے ذہن اور اس کے وجود میں تلاطم پیدا کر دیتی ہے۔'' [۱۴۱]

ناول ''مرگ انبوہ'' کردار نگاری کے لحاظ سے ایک کامیاب ناول ہے۔ اس ناول کے کئی کردار ہے مثلاً جہانگیر مرزا، سارہ جہانگیر مرزا اور ان کا بیٹا مرزا پاشا کے علاوہ ریمنڈ، تارادیش پانڈے، سبحان علی، سمیرا، سعدیہ، راکیش وید، زرین حیدر، مولوی فرقان وغیرہ۔ لیکن یہاں ہم اس ناول میں مرکزی کردار کے حوالے

سے جائزہ لے گے۔ جہاں تک اس ناول میں مرکزی کردار کی بات ہے تو اس کے دو مرکزی کردار ہیں، ایک جہانگیر مرزا اور دوسرا ان کا بیس سالہ بیٹا مرزا پاشا۔

اس ناول کی پوری کہانی ان دو مرکزی کرداروں کے اردگرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے اور ذوقی نے ان کے ذریعے قاری کو موجودہ دور کے سیاسی اور سماجی حالات سے آگاہ کراتا ہے۔ جہانگیر مرزا ایک ادیب ہے مگر اس کا بیٹا پاشا مرزا باپ کے لکھنے پڑھنے کو ایک فضول کام سمجھتا ہے، وہ اسے نفرت کی نظروں سے دیکھتا ہے کیونکہ مرزا پاشا کو کہانیاں لکھنا نہیں آتا اور نہ ہی وہ لکھنا چاہتا ہے۔ وہ موجودہ دور کی نسل کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں آج کل کے بچے پزا اور برگر کو پسند کرتے ہیں اور فاسٹ فوڈ کلچر کو اپناتے ہیں۔ ائی پیڈ اور لیپ ٹاپ پر پڑھنے والی نسل کو کتب خانہ کباڑ خانہ لگتا ہے اور یہ نسل اپنا ائیڈیل اسٹیفن ہاکنگ، اسٹیو جابز، بلگیٹس اور مارک زکر برگ جیسے لوگوں کو مانتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں کردار نگاری کا مفصل جائزہ لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں کردار نگاری کی جانب خصوصی توجہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں کرداروں کے انتخاب اور ان کی نفسیات اور پھر ان کی پیش کش پر خاصا عبور حاصل ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں کرداروں کی خوبیاں اور خامیاں دونوں کو ابھارنے کی ہر دم کوشش کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ کردار نکھر کر قاری کے سامنے آجائے۔ ان کے کردار اسی ماحول میں سانس لیتے ہیں جس میں ہم اور آپ جی رہے ہیں اور پورے برصغیر خاص طور پر ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۵.۳۔تکنیک

تکنیک دراصل وہ فنی اصول ہے،جس سے ہر فنکار اپنے فن یا تخلیق کوکسی خاص سانچے میں پیش کرنے کے دوران کام میں لاتا ہے۔ناول میں بھی یہ اصول کارفرما رہتے ہیں۔ ہر ناول نگار قصے کو بیان کرنے میں یا واقعات کوظاہر کرنے میں کسی تکنیک سے کام لیتا ہے،ایسا کم ہی دیکھنے کو آیا ہے کہ کسی ناول نگار نے ناول میں کسی ایک ہی تکنیک کا سہارا لیا ہے، بلکہ وہ بیک وقت کئی تکنیکوں کا استعمال کرتا ہے،لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ کسی ایک تکنیک سے زیادہ کام لیتا ہے۔

ہر موضوع کی تکنیک الگ الگ ہوتی ہے۔ممتاز شیرین اپنی تصنیف ''اردو روایت اور مسائل'' میں تکنیک کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

''تکنیک کی صیح تعریف ذرا مشکل ہے مواد،اسلوب اور ہیت سے ایک علیحدہ صنف فنکار مواد کو اسلوب سے ہم آہنگ کرکے ایک مخصوص طریقے سے پیش کرتا ہے، افسانے کی تعمیر کی جس طریقے سے مواد ڈھلتا ہے وہی تکنیک ہے۔'' ۴۲

کسی بھی فن پارے کی تخلیق میں تکنیک ایک اہم حصہ ہے۔فن پارہ کسی مخصوص تکنیک کے سہارے ہی وجود میں آتا ہے،اردو ناول میں اب تک مختلف قسم کی تکنیک کا استعمال ہوا ہے مثلاً فلیش بیک کی تکنیک ،شعور کی رو کی تکنیک، ڈائیری کی تکنیک، بیانیہ تکنیک وغیرہ وغیرہ۔تکنیک کے حوالے سے ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

''ناول کچھ فنی اصول پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر باسلیقہ ناول نگار قصّہ کے بیان کرنے میں یا کردار کے ظاہر کرنے میں کسی خاص تکنیک سے کام لیتا ہے۔'' ۴۳

تکنیک دراصل اس خاص انداز یا طریقے کو کہتے ہیں ،جس کے ذریعے ایک فنکار اپنے جذبات، احساسات اور تجربات کو موثر انداز سے پیش کرے۔اب ایک فنکار اپنے احساسات، جذبات اور تجربات کو کس انداز اور کس طریقے سے یا کس ہیت میں پیش کرتا ہے یہ اس کے منتخب موضوع اور افتادطبع پر منحصر ہے۔

اس حوالے سے جب ہم نے مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں تکنیک کا جائزہ لیا تو ہمیں وہ اس

تجربے میں کامیاب نظر آئے۔انہوں نے جو تکنیک اپنے ناولوں میں زیادہ تر استعمال کی ہے وہ بیانیہ اور فلیش بیک کی تکنیک ہے لیکن کہیں کہیں وہ شعور کی رو اور ڈائیری کی تکنیک کے علاوہ فلیش فارورڑ کی تکنیک کا بھی استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی نے اپنے ناولوں میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ ماضی کی ایسی تصویر کشی کی ہے اور ماضی کو حال میں اس طرح سمویا ہے کہ سب کچھ حال میں گزرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، ماضی کو حال میں پیش کرنے کے فن سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ماضی کو حال میں پیش کرنے کے دو انداز ہو سکتے ہیں جن سے دو الگ الگ تکنیکیں بن گئی ہیں لیکن ان میں بڑا نازک سا فرق ہے۔ پہلی تکنیک کے ذریعے ذہن میں ماضی کا عکس یوں دکھاتے ہیں کہ بنتے ہوئے نقوش کی ہو بہو تصویر اترتی چلی جاتی ہے، صرف وہی باتیں بیان کی جاتی ہے جو ذہن میں آتی ہیں مثلاً کسی پورے واقعے میں چند خاص باتوں کا خیال آئے تو انہی کا ذکر کرتے ہیں، پھر ذہن اچانک کسی دوسرے واقعے کی طرف منتقل ہو تو پہلے واقعے کی کوئی تفصیل بتائے بغیر دوسرے واقعے کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے ایک مخصوص طرز تحریر ہوتی ہیں۔ اس ذیلی ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ مشرف عالم ذوقی نے جن تکنیکوں کا استعمال کیا ہے انہیں ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

''نیلام گھر''، یہ ناول ان کا ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول میں مشرف عالم ذوقی نے فلیش بیک تکنیک کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ ناول ''نیلام گھر'' میں ایک موضوع ''عذاب'' کے نام سے ہے جس سے قاری کا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔ ناول نگار نے اس میں دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بدبو ایک عذاب ہے جو لوگوں پر نازل ہوا، ذہن میں ڈھیر سارے سوالات اٹھنے لگتے ہیں کہ یہ کریم بیگ کون ہے؟ آفس کے باقی لوگ (ملازم) اس کا ساتھ کیوں نہیں دیتے، اور کریم بیگ کے چلے جانے کے بعد سب کو یہ احساس ہوتا ہے کہ کریم بیگ صحیح تھا اب آفس کے سب لوگ کریم بیگ کو یاد کرتے تھے خاص کر کے رگھو بیر۔

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے، اور کہیں کہیں فلیش بیک کی تکنیک سے قصے کو آگے بڑھایا ہے۔ اس طرح نیلام گھر میں روایتی اور جدید تکنیک کا حسین امتزاج موجود ہے۔

''نیلام گھر'' کی پوری کہانی واحد متکلم غائب کی زبانی کہی گئی ہے۔ اس بیچ میں ناول کے کرداروں

کے درمیان گفتگو کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے، اور یہ گفتگو یا مقالمے کرداروں کی ذہنی کیفیت سے واقف کراتے ہیں۔

کہانی میں کئی واقعات یکے بعد دیگرے وقوع پزیر ہوتے ہیں اور کہانی میں کئی غیر متوقع موڑ آتے ہیں، کہانی میں موجودہ سماج کی بدعنوانیوں، دفتروں میں آفسر شاہی اور پولیس کے جبر کی کہانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے اپنے ناولوں میں بظاہر بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے لیکن جب ہم ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں کہیں کہیں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اس کی مثال ہمیں ان کی ناول ''ذبح'' میں ملتی ہے۔ یہ ناول بیانیہ ہے کیونکہ اس ناول کو مشرف عالم ذوقی نے اس وقت لکھا جب ۱۹۴۷ء میں ہمارا ملک آزاد تو ہوا لیکن ہمارے ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کے لئے یہ بہت ہی صبر آزما دور تھا۔ کیونکہ ہمارا ملک ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور اس تقسیم نے ہمارے ملک کو کافی نقصان پہنچایا۔ آزاد ہندوستان کے مسلمان دو طرح کی شہریت رکھتے تھے۔ دوسری جانب اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کا المیہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ ہونے والے سوتیلے سلوک نے اس سے اقتصادی طور پر کمزور بنا دیا تھا۔ ذوقی نے اسی اقلیتی طبقے کو بیانیہ کے طور پر اپنے ناول ذبح میں ہیرو بنا دیا ہے جو دھیرے دھیرے وقت اور زمانے کی تیز چھری سے ذبح ہوتا جا رہا ہے۔

ذوقی نے ان کی خستہ حالی اور پریشانی کی عکاسی بہت ہی حقیقی انداز میں کی ہے۔ اقتباس:

> ''شہر کی رات کو تاریکی نے ڈھک لیا تھا لوٹتے وقت عبدل کے
> ذہن میں بس یہی دو جملے تیر رہے تھے۔ بہت برا ہے زمانے کا
> ترقی کر جانا اس سے بھی برا ہوتا ہے کسی پیشے کا مر جانا۔'' ۴۴

اس ناول کا راوی واحد غائب ہے۔ انہوں نے بڑے ہی بہترین انداز میں عبدل سقہ کے خاندان کی کہانی کو پیش کیا ہے کہ کس طرح وہ پہلے مشک بھرنے کا کاروبار کرتا تھا۔ لیکن پھر حالات کی وجہ سے کیسے بے روزگار ہوئے۔ پہلے وہ ایمانداری سے کام کرتے تھے لیکن اب ترقی کی وجہ سے آج کے معاشرے میں ان کی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے۔

اس ناول سے ذوقی نے یہ پیغام دیا ہے کہ کوئی بھی ملک یا قوم اسی وقت ترقی یافتہ کہلاسکتی ہے جب کہ وہاں کے ہر فرد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں، اور ہر فرد صحت منداور خوشحال زندگی گذار رہا ہو۔ترقی میں ہر فرد کی شمولیت ہونی چاہیئے جب ملک ترقی کر رہا ہو، نئی نئی مشینیں ایجاد ہو رہی ہوں تو اس کے سبب بے روزگار ہونے والے ان روایتی پیشہ وروں کی باز آبادکاری کی طرف سرکار اور منصوبے بنانے والے ذمہ داروں کو متوجہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ ملک میں سماج اور معاشی عدم توازن اور بڑھے گا۔ اور اکثر معاشی بدحالی انسان کو جرائم کی دنیا میں لے جاتی ہے جیسا کی اس ناول میں عبدل کا کردار ہے۔

کہانی کا راوی واحد متکلم حاضر ہے۔فلیش بیک کی تکنیک کے استعمال سے ناول میں کہانی کبھی ماضی کی طرف جاتی ہے تو کبھی حال کا منظر نامہ دکھاتی ہے۔ کہانی کے راوی نے عبدل کے کردار کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اس کی ان تمام اچھائیوں سے واقف ہے زمانہ جن سے واقف نہیں اور اس کے بری راہ پر نکل جانے کے اسباب سے بھی واقف ہے۔

بیانیہ میں واحد غائب کا راوی بیک وقت کئی جگہ کے واقعات کو نقل کر سکتا ہے۔مگر واحد غائب کی مجبوری یہ ہوسکتی ہے کہ کردار کی اندرونی کیفیت زیادہ گہرائی کے ساتھ نہیں بیان کر سکتا، مگر ناول کے بیچ میں راوی کی شکل میں واحد متکلم پھر حاضر ہو گیا ہے۔ پلاٹ میں جب واحد متکلم ہوتا ہے تو اس کے ساتھ یہ مجبوری ہوتی ہے کہ وہ کہانی کے ہر حصے میں نہیں دکھایا جا سکتا وہ صرف ان احوال کا ہی بیان کر سکتا ہے جہاں تک اس کی رسائی ممکن ہوسکتی ہے۔ واحد متکلم خود پر بیتی ہوئی کیفیت کا اظہار آسانی سے کرتا ہے۔اور قاری پر یہ گراں بھی نہیں گذرتا ہے۔لہذا جہاں جہاں اس ناول میں ملک اور معاشرے یا وسیع پس منظر کا ذکر ہے وہاں تو مصنف نے خود کو واحد غائب رکھا ہے مگر جب کردار کی نوعیت و کیفیت کا صحیح نقشہ کھینچنا ہو تو مصنف واحد متکلم کی صورت میں کھل کر سامنے آ گیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول کی کہانی کو اس طرح نفیس اور نمونہ فن میں ڈھال کر پیش کیا ہے کہ قاری کو بار بار پیچھے جا کر غور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، انہوں نے اپنے بہترین رومانیت سے بھر پور بیانیہ انداز کے ساتھ ساتھ ''شعور کی رو کی تکنیک'' کا سہارا لیا ہے، جو مغربی افسانوی روپ میں پہلے سے متعارف و

روشناس رہی ہے۔لیکن اردو میں چند نا کام تجربوں کے سوا اس کا استعمال کم تر ہی نظر آتا ہے۔اس سے پہلے اردو میں سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر اس تکنیک کا استعمال کر چکے ہیں۔یہ اردو کے لئے کوئی نئی تکنیک نہیں ہے۔ناول نگار نے بڑے اچھے انداز میں عبدل کے ماضی کو بیان کیا ہے کہ کس طرح سے وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ خوش تھا لیکن بعد میں جب مشک کا کاروبار کم ہو گیا تو وہ غریبی کا شکار ہو گیا،سب کی نظروں میں عبدل غلط تھا،مگر اس کی مجبوری کو کوئی نہیں سمجھتا۔

مشرف عالم ذوقی نے اس تکنیک کا استعمال 'شعور کی رو کی تکنیک' ناول 'عقاب کی آنکھیں' میں کیا ہے۔'عقاب کی آنکھیں' میں راوی خود ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔انہوں نے ناول کی شروعات ڈائیری کے لکھنے سے کی ہے اور آہستہ آہستہ پھر ماضی میں پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنی پچھلی زندگی سے کون سا تجربہ حاصل کیا ہے۔اقتباس:

> ''آج جبکہ میں یہ ڈائیری لکھنا شروع کر رہا ہوں۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ۔اسے کہاں سے شروع کروں،کہاں ختم کروں-سب سے پہلے میں تمہیں یاد کر رہا ہوں ،لڑی! یاد ہے بچپن کے اُس بے حد خوبصورت دور میں ایک تم ہی تھیں ،جس سے میں باتیں کیا کرتا تھا۔اس بہانے تم مجھے دوست بھی کہہ سکتی ہو۔'' ۴۵

یہ ناول ذوقی نے کم عمری میں تحریر کیا۔اس وقت ان کا تجربہ،فکر زندگی اتنی پختہ نہیں تھی لیکن پھر بھی ایک نہایت اہم اور نازک موضوع کو ذوقی نے بڑی خوبصورتی سے نبھا کر اس ناول کو ادب کا حصہ بنا دیا ہے۔

'لے سانس بھی آہستہ' تکنیک کے لحاظ سے ایک اہم ناول ہے۔اس ناول کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک کہیں بھی بوجھل پن نظر نہیں آتا۔بلکہ یہ قاری سے ایک ہی نشست میں پڑھنے کا تقاضہ کرتا ہے۔اور پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔ذوقی کا یہ ناول حقیقت نگاری کا خوبصورت اور بہترین نمونہ ہے۔ان کا ناول لکھنے کا انداز الگ ہے۔اس بات کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ناول کے ابتدائی حصے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ناول کی شروعات میں ہی قاری کے اندر تجسس پیدا ہوتا ہے

کہ آخر ناول میں کیا ہے، اس کی کہانی کیسی اور کس کی ہے جیسے جیسے اس ناول کو قاری پڑھتا ہے ان کے اندر تجسس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

ذوقی کا کمال یہ ہے کہ ناول میں زندگی کے اتنے پہلو، غلامی کا عکس، سیاست کے رنگ، آزادی اور تقسیم، حسد، نفرت، غریبی، بے بسی، لاچاری، بنگلہ دیش کا قیام اور فرقہ وارانہ فسادات کے ساتھ ساتھ رام جنم بھومی رتھ یاتراؤں کا سچ وغیرہ کو شامل کر دیا ہے۔

اس ناول میں ذوقی نے بلند حویلی کا ذکر کیا ہے۔جس میں کئی دنیائیں آباد تھیں۔دراصل یہ کارداروں کا خاندان ہے جس میں وسیع الرحمٰن کا ردار، ان کی بیوی اور دو بیٹے مطیع الرحمٰن کا رداراور عبدالرحمٰن کا ردار کے علاوہ ان کی بیوی رقیہ اور بیٹا شان الرحمٰن کا ردار رہتے ہیں۔ذوقی نے اس خاندان کا تعارف اس طرح کرایا ہے کہ قاری کے اندر تجسس پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس خاندان کی مکمل کہانی کیا ہے، ان کا رہن سہن، ان کی بودوباش ان کا ملنا جلنا، ان کی نشست و برخاست وغیرہ جاننے کے لئے بے چین رہتا ہے۔:

> ’’بلند حویلی۔۔۔۔۔دادا مرحوم کے انتقال کے بعد بلند حویلی کی سلطنت ابّا کے ہاتھوں میں تھی۔میں چھوٹا تھا لیکن اب یہاں کی دنیا کو بخوبی پہچاننے لگا تھا۔دراصل یہاں کئی دنیائیں آباد تھیں۔ایک دنیا اماں کی تھی۔۔۔۔۔جہاں گھر، خانہ داری، محلے والوں سے لے کر بھوت پریت اور جناتوں کی ایک سے بڑھ کر ایک دنیا آباد تھی۔دوسری دنیا ابّا کی تھی۔ابّا نے خود کو مذہب کے دائرے میں باندھ لیا تھا۔ابّا اب سارا دن مذہبی کتابوں کے مطالعے میں غرق رہنے لگے تھے۔‘‘ ۴۶

لیکن پھر اچانک حویلی کا زوال شروع ہوتا ہے جو سب کی پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔اور حویلی کی عزت مٹی میں مل جاتی ہے۔حویلی میں چلنے والی کاروائی یعنی کھدائی کی خبر آگ کی طرح چاروں طرف پھیل جاتی ہے جس کی وجہ سے محلے میں حویلی کی بدنامی ہوتی ہے۔اور پھر سفیان ماموں، وسیع بھائی سے یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ:

''یہ بدلے ہوئے زمانے کا دستور ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے
اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔۔۔۔۔ بڑی سے بڑی حکومتیں ختم ہو جاتی
ہیں۔قدرت اپنا کھیل دکھاتی رہتی ہے۔وسیع بھائی۔۔۔۔کبھی
کسی نے سوچا تھا کہ مغلیہ شاہی خاندان کو بھی زوال آ جائے گا
اور اس خاندان کے ایک وارث بہادر شاہ ظفر کو نصیب کے سوا
آنسو بہانے پڑیں گے۔لیکن یہی تقدیر کا لکھا ہے وسیع بھائی اور
ایک دن اس آگ میں سب کو جلنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔'' ؎۴۷

اس ناول میں راوی واحد غائب ہے۔ انہوں نے بڑی خوبصورتی سے عبدل الرحمٰن کا ردار کے خاندان کی کہانی بیان کی ہے کہ کس طرح خاندان کے لوگ پہلے خوشی سے اس حویلی میں رہتے تھے اور گمشدہ خزانے کی تلاش کر رہے تھے جس کے بارے میں کسی کو پتہ تک نہیں تھا کہ اس حویلی میں کون سا خزانہ یا راز چھپا ہوا تھا۔لیکن پھر جب بلند حویلی پر زوال آتا ہے تو یہ سب کچھ ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ ذوقی نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بلند حویلی میں زوال آتا ہے، کس طرح لوگ ماضی سے لپٹے ہوئے رہتے ہیں، کیسے وہ لوگ گمشدہ خزانے کی تلاش کر رہے ہیں، کس طرح آسمان پر منڈلانے والے جنگی طیارے نظر آتے ہیں، کس طرح ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کا تذکرہ ہوتا ہے، کس طرح لوگوں کے آنکھوں میں سمائی ہوئی نفرت جنم لیتی ہے اور پھر ناول میں سفیان ماموں کا آنا، نادرہ کی شادی اور نگار کا جنم، مسلسل خوف، تباہیاں، جنگیں وغیرہ کے علاوہ ایک نئے انسان کی آمد قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اس ناول میں راوی واحد متکلم حاضر/ غائب ہے۔ وہ کبھی قاری کو ماضی میں لے جاتا ہے اور کبھی حال میں۔مصنف نے دراصل عبدالرحمٰن کاردار کو بہت ہی قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ وہ ان کی تمام حرکتوں سے واقف ہے۔:

''گرمی کے دنوں میں چھت پر پلنگڑیاں بچھ جاتیں۔پانی کا
چھڑکاؤ کیا جاتا۔۔۔۔۔رات ۹ بجتے بجتے کھانا ختم ہو جاتا۔
میں اماں کے ساتھ چھت پر آ جاتا۔پھر ابّا کی کہانیاں شروع ہو

جاتیں۔آسمان پرستاروں کی حسین چادر بچھی ہوتی ابا دیر تک ان
ستاروں سے تعارف کراتے رہتے۔۔۔۔۔ وہ قطب تارہ
ہے۔ وہ مشتری ہے ۔۔۔۔۔۔۔وہ ساتھ ستارے۔بنات
النعش ۔۔۔۔۔۔چاندنی راتوں میں ابا کی کہانیاں مجھے ایک نئی
دنیا میں پہنچا دیتیں۔ہاں، یہ سوچ کر ہول آتا کہ اس فانی دنیا
میں کوئی بھی ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آیا ہے ایک دن سب کو چلا
جانا ہے۔معصوم ذہن میں سوالوں کے دھماکے ہونے
لگتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' ۴۸

ذوقی نے اس ناول میں عبدل الرحمٰن کاردار کے کردار کے ذریعے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کا ہندوستان دکھایا ہے۔ یوں تو مصنف نے خود کو واحد غائب رکھا ہے لیکن جب اس نے کردار کا نقشہ کھینچا ہے تو وہ واحد متکلم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔اقتباس:

''جیسا کہ اب تک آپ کو پتہ چل گیا ہوگا، یہ کہانی میری ہے،
لیکن میری ہونے کے باوجود میری نہیں ہے۔۔۔۔ میں یعنی
عبدالرحمٰن کاردار ۔۔۔۔۔اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی کہانی
کسی کی اکیلی کہانی نہیں ہوتی ۔۔۔۔۔اور ہر کہانی کے ساتھ
ایک دونہیں ہزاروں واقعات ،کردار یا کہانیاں جڑ جاتی
ہیں۔۔۔۔۔'' ۴۹

ذوقی نے عبدالرحمٰن کاردار کے علاوہ نور محمد کا ذکر کیا ہے۔نور محمد جیسے کردار کو بلند شہر اور حویلی سے نکال کر گاؤں میں لے جاتا ہے۔ جب ایک تہذیب مرتی ہے تو دوسری تہذیب فوراً جنم لیتی ہے۔نور محمد نے بچپن میں ہی ایک ایسی دنیا دیکھی ہے جو خوبصورت بھی ہے اور بدصورت بھی۔ جہاں تہذیبوں کے رنگ ہیں، جہاں قدریں پامال ہوئیں اور ساتھ ہی ساتھ تہذیب کا نوحہ بھی سامنے آیا ہے۔مصنف نے اس کردار کو ناول کے آخر تک زندہ رکھا ہے۔

نور محمد کی زندگی کسی سخت امتحان سے کم نہیں، اور پھر اس امتحان میں کامیاب ہونا کمال کی بات ہے۔

یہ ذوقی کی تکنیک کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے نور محمد کو ہر حال میں حالات سے لڑنا سکھایا اور جینے کا سلیقہ بھی۔

مشرف عالم ذوقی نے آج کل کے عقیدت مند انسان کا ذکر اس ناول میں کیا ہے۔ سائنس نے چاہے کتنی ترقی کر لی ہو مگر آج کل کا انسان آج بھی اندھ وشواس (ضعیف الاعتقادی) کی گلیوں میں گم ہے۔ یہ اندھ وشواس اصل میں ایک بیماری ہے جو ایک بار اس بیماری میں مبتلا ہو گیا تو اس کے لئے باہر نکلنا مشکل ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس ناول میں نظر محمد اپنی تمام عمر اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کی کتنی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کی بیوی پر پڑنے والے دوروں نے نظر محمد کی کوشش کو کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ ناکام کر دیا۔ اور آخر کار وہ ساری جدوجہد کرنے کے باوجود بھی اپنی بیوی کو کھو دیتا ہے۔ ذوقی نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ملا مولوی اللہ کے نام سے چندہ جمع کرتے رہتے ہیں اور پھر اسی سے اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ اقتباس:

> ''اور کیا۔۔۔۔۔شاہ جنات ہے۔اس لئے مولوی صاحب
> کہتے ہیں ۔۔۔۔وقت لگے گا۔پچھلے دو مہینے سے ہر جمعہ ایک
> بکرے کی قربانی دی جارہی ہے۔۔۔۔۔۔ بکرا گھر آتا ہے
> ۔۔۔۔۔۔؟نہیں۔۔۔۔۔ابا بکرے کی قیمت مولوی صاحب
> کو دے دیتے ہیں۔ وہ قربانی کے بعد بکرے کا گوشت یتیم بچوں
> میں تقسیم کر دیتے ہیں، تقسیم کر دیتے ہیں یا خود کھاتے
> ہیں۔۔۔۔۔۔؟'' ۵۰

ذوقی نے اس ناول کے ذریعے ۱۹۴۷ء سے لے کر حال کی تاریخ کو لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ان کی تکنیک کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے تاریخ کا رشتہ عہد حاضر سے جوڑا ہے۔ وہ اپنی تکنیک سے قاری کو بوجھل ہونے نہیں دیتے بلکہ اپنے خوبصورت بیانیہ سے قاری کو اپنے ساتھ بہا لے کر جاتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کا کینوس بہت ہی وسیع ہے۔ ان کی تکنیک، موضوعات اور مسائل نہایت ہی پیچیدہ ہیں۔ ان کے پاس بے شمار مسائل ہے جسے انہوں نے فلسفہ بنا دیا ہے۔ ان کا ایک ناول ''آتش رفتہ کا سراغ'' ہے جو تکنیک کے لحاظ سے ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول میں ذوقی نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ارشد پاشا بار بار ماضی کی طرف جاتا ہے جہاں اسے ہندوستانی تہذیب اور ماضی کی

یادوں سے نکلنا مشکل ہوتا ہے اور اس کے اندر ڈر اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ یہ ناول دراصل قاری کے لئے پڑھنا آسان نہیں ہے کیونکہ قاری کے دل پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم ناول کے حصہ اول کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور قاری اس تذبذب میں پڑ جاتا ہے کہ آخر یہ کون سی خوف ناک رات تھی جس کا فیصلہ آنے والا تھا۔

اور پھر ناول میں ایک بے حد معصوم سا بچہ اسامہ پاشا کا چہرہ سامنے آتا ہے۔ ایک چہرہ اسامہ کا ہے اور دوسرا چہرہ اس کے والد ارشد پاشا کا جو اسامہ کے لباس اور طور طریقوں سے خوفزدہ ہونے لگتے ہیں۔ ارشد پاشا کا مسلمان ہونے کے باوجود زندگی جینے کا ایک الگ ہی انداز تھا۔ اس کے انداز میں مذہبی رنگ کبھی غالب نہیں تھا۔:

> ''پاشاؤں کی کوٹھی ۔۔۔۔۔۔۔ یاد کرو تو آنکھوں کے پردے
> پر ایک خستہ حال عمارت کے نقوش ابھرتے ہوئے مجھے اپنی
> قید میں لے لیتے ہیں۔ کچھ آوازیں ہیں جو اچانک، میرا راستہ
> روک لیتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' [۵۱]

لیکن آہستہ آہستہ پاشاؤں کی کوٹھی کو زوال آ گیا۔ گھر میں جتنے بزرگ تھے وہ منوں مٹی کے نیچے سو گئے، پاشاؤں کا خاندان بکھر گیا، انور پاشا ممبئی چلے گئے اور وہیں رہائش کر لی، راشدہ کی شادی ہو گئی اور وہ بنگلور چلی گئی اور ارشد پاشا خوشی سے دلی میں رہنے لگے، ماضی کی یہ ساری کہانی ارشد پاشا کی خود کلامی سے سامنے آتی ہے اور پھر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں جہاں وہ خود کو ایک ڈرا ہوا اور سہما ہوا انسان کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ارشد پاشا کا کردار شروع سے لے کر آخر تک بے حد کمزور ہے۔ وہ ماضی کی ان یادوں سے نکلنا چاہتا ہے لیکن یہ ڈر اور خوف اس کو نکلنے نہیں دیتا۔:

> ''پوری دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس کے پیچھے مسلمان ہی
> ہیں۔؟ وہ چیختا ہوا اب بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔' ہر
> مسلمان میں ایک Terrorist دیکھتے ہیں یہ
> لوگ۔۔۔۔۔۔ میری آواز بھی سرد تھی ۔۔۔۔۔' 'مسلمان

ایسی کاروائی کرتے ہی کیوں ہیں۔۔۔۔۔؟'' ۵۲؎

Terrorist لفظ ہی ناول کا مرکزی خیال ہے اوراس ناول کا ہیرو وقت ہے۔ذوقی نے اس ناول میں فلیش بیک تکنیک کے ذریعے تغلق پاشا کی کہانی بیان کی ہے جو ماضی کی یادوں میں گھرا ہوا انسان ہے۔اس نے پاشاؤں کے سنہرے ماضی کو ذہن میں رکھا ہوا ہے۔اس کا اپنا شہر کاشی تھا۔کاشی سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔وہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔اسی لئے وہ کاشی سے محبت کرتا تھا کیونکہ وہاں ہندو مسلم ساتھ میں رہتے تھے لیکن دھیرے دھیرے یہ چلن کم ہوتا گیا۔ذوقی نے تغلق پاشا کے جذبات کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ قاری اس کے ماضی سے کانپ جاتا ہے۔تغلق پاشا کو اپنے وطن سے محبت، اپنے گھر، خاندان کی عزت و عزمت بار بار سوچنے پر مجبور کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان رہتا ہے۔اس کو ہمیشہ پاشاؤں کی کوٹھی اور کوٹھی کی وہ رونق یاد آتی ہے جہاں ان کا بھائی تاجور پاشا رہتا تھا۔تغلق پاشا نے غلامی کا دور دیکھا تھا اور آزادی کا بھی پھر بھی وہ نہیں ٹوٹے۔لیکن جب بٹوارہ ہوا تو اس بٹوارے نے تغلق پاشا کو توڑ کر رکھ دیا۔کیونکہ ان کو لگتا تھا کہ اس بٹوارے سے دلوں کے بٹوارے بھی ہو گئے اور پھر جسم اور رشتوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔

ذوقی نے تغلق پاشا کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ صرف ان کی ہی کہانی نہیں ہے یہ کہانی آج کے دور میں ہر ایک انسان کی ہے جو اپنے ماضی کا رونا روتا ہے۔کیوں کہ موجودہ دور میں ہر انسان اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔اور ہر ایک کی یہی خواہش ہے کہ کاش وہ زمانہ پھر سے لوٹ آئے۔جس زمانے میں ہم اپنے بڑے بزرگوں کے ساتھ رہتے تھے۔

اس ناول میں ایک علامت 'جبر' ہے جس کو ذوقی نے اسلم کے ذریعے پیش کیا ہے۔اسلم گونگا ہونے کے ساتھ ساتھ بہرہ ہے۔اسی لئے وہ چپ چاپ ہر ظلم اور زیادتی کو برداشت کرتا ہے۔ظلم بھی تو ایک طرح سے گونگا ہی ہوتا ہے جس طرح اسلم ہے۔دونوں خاموشی سے سنتے اور سہتے ہیں۔

''آتش رفتہ کا سراغ'' پڑھ کر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کیسے مسلمان آج کل کے زمانے میں زندگی گذار رہے ہیں۔کیسے مسلمان ایسے سماج میں رہ سکتے ہیں جہاں انسپکٹر ورما اور دشنیت جیسے پولیس آفسر رہے ہیں۔آج مسلمانوں کا جینا مشکل ہو گیا ہے۔کیوں کہ ظلم و جبر اور تشدد کا انہیں نشانہ بنایا گیا ہے۔طاقتوں کے

ذریعے ان سے غلط بیانات لئے جاتے ہیں اور اگر وہ بیان نہ دے تو ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اتنے لاچار اور مجبور ہوتے ہیں کہ ان ظالموں کی مرضی کا ہی بیان دینا پڑتا ہے۔اور پھر ثبوت بنا کر ان کو دنیا کے سامنے دہشت گرد بنا کر پیش کرتے ہیں۔اس ناول میں مسلمانوں کو جبراً دہشت گرد بنانے سے لے کر پولیس کے ظلم و جبر، سیاسی ہار جیت کے ذریعے فرقہ وارانہ فسادات پیدا کرانے سے لے کر گنگا جمنی تہذیب کے بکھراؤ تک کو ذوقی نے پیش کر دیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا مطالعہ وسیع ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہر ناول کے لئے الگ الگ تکنیک سے استفادہ کرتے ہیں ۔ وہ انسان کی جیتی جاگتی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے ہر بار نئی تکنیک کو سامنے لاتے ہیں۔اس کا ذکر ہمیں ان کے ناول ''پو کے مان کی دنیا'' میں ملتا ہے۔اس ناول میں انہوں نے بیانیہ اور فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ذوقی کا یہ ناول اپنے عہد سے تقریباً دس برس آگے کا ناول دکھائی دیتا ہے۔اور قاری جب اس ناول کا مطالعہ کرتا ہے تو بالکل ان کے ذہن میں موجودہ دور کا سارا منظر سامنے آتا ہے۔قاری کو ایسا لگتا ہے جیسا یہ ناول ذوقی نے آج کے اس ظالمانہ دور میں ہی تخلیق کیا ہے۔کیونکہ انہوں نے جس طرح اس ناول میں آمرانہ نظام کا ذکر کیا ہے اس سے قاری اس تجسس میں پڑ جاتا ہے کہ جیسے پہلے آمرانہ نظام نے گجرات میں مسلمانوں کے اوپر ظلم و جبر کر کے ان کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے، ویسے ہی موجودہ دور میں آمرانہ نظام یہی سب کر رہا ہے۔اور قاری کے لئے حیرانی کی بات یہ ہے کہ آج کل کے معاشرے میں جو مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے اس کا ذکر ذوقی نے اپنے اس ناول میں آج سے کئی سال پہلے کر دیا ہے۔

ذوقی نے اس ناول میں روی کنچن جو ایک بارہ سال کا بچہ ہے اور وہ اپنی ہم عمر لڑکی کے ساتھ جنسی زیادتی کرتا ہے اور پھر اس معاملے میں ہر ایک اس کے ساتھ کھیل کھیلتا ہے چاہے وہ سماج کا کوئی فرد ہو، معاشرہ ہو یا پھر سیاست ہو۔اصل میں یہ ہماری بدلی بدلی مغربی تہذیب کا ہی اثر ہے جس کو ہم اپنا کر اپنی تہذیب سے ہی دور ہو گئے ہیں۔اس کردار کے ذریعے انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ آج کل کے بچے اپنے تہذیب سے بے نیاز ہیں۔اس بات سے ہم بخوبی واقف ہیں کہ آج کل کے بچے انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کے زمانے میں پیدا ہو رہے ہیں۔اور انٹرٹینمنٹ (Entertaiment) کے ذریعے میڈیا ان کے لئے ہر روز نئے نئے

تجربوں کا استقبال کرتی ہے۔تو پھر ماں باپ ایسے بچوں سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ ان سے ڈریں، ان کی عزت کریں یا ان کا احترام کریں۔آج کل کے اس گلوبل گاؤں میں ساری اقدار ختم ہوگئی ہیں اور آج کا بچہ ان تمام احساسات سے بے نیاز ہے۔

ذوقی نے روی کنچن کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنے ہی روی کنچن ہیں، جنہیں اپنے ماں باپ کی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔دراصل یہ نہ ہی روی کنچن کا قصور ہے نہ ماں باپ کا جنکی اس طرح کی اولادیں ہیں بلکہ یہ اس معاشرے کا قصور ہے جس نے اس معاشرے میں اس طرح کے نظام کو قائم کیا ہے۔

سنیل کمار رائے اخلاقیات کا دل دادہ ہے۔وہ ماضی کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی تہذیب کو پوری طرح اپنا چکا ہے لیکن ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی روایتوں اور تہذیبوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھ سکے۔جب ان کے پاس روی کنچن کا کیس آتا ہے۔تو ان کو یقین ہی نہیں آتا کہ ایک بارہ سال کا بچہ ایسی غلطی کر سکتا ہے۔اور وہ یہ کیس لڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ناول میں روی کنچن کی اس غلطی کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔اگر دیکھا جائے تو اس وقت کی رولنگ پارٹی بھاجپا تھی اور اپوزشن میں کانگریس تھی۔دونوں پارٹیوں نے اپنی اپنی ائیڈیالوجی کی جنگ شروع کر دی تھی مگر اس تمام جنگ میں ایک چھوٹے سے بچے کو نشانہ بنایا گیا ہے اور شاید اسی لئے جج اس طرح فیصلہ سنانے پر مجبور ہو گیا ہے کہ:

''روی کنچن بے قصور ہے۔اور اس پورے معاملے کا سروکار
نہیں۔ایک چھوٹے سے پو کے مان کی غلطی کو نظر انداز کرنے
میں ہی ہم سب کی بھلائی ہے۔۔۔۔۔لیکن اس کے باوجود کوئی
نہ کوئی مجرم ضرور ہے اور جو مجرم ہے، اُسے سخت سے سخت سزا تو
ملنی ہی چاہیئے۔اس لئے۔۔۔۔۔میں پورے ہوش وحواس میں
یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ تعزیرات ہند، دفعہ ۳۰۲ کے تحت۔۔۔۔۔
میں اس نئی ٹکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیز، کنزیومر ورلڈ اور گلوبلائزیشن
کو سزائے موت کا حکم دیتا ہوں۔۔۔۔۔'' ۵۳

ناول میں فلیش بیک تکنیک کا استعمال کب، کہاں اور کس جگہ پر کرنا چاہئے اور پھر اس کے ذریعے موجودہ دور کے واقعات کس طرح سے جوڑنا ہے یہ فن ذوقی کو بخوبی آتا ہے۔ وہ ماضی کے واقعات کو حال کے ساتھ جوڑ لیتے ہے۔

ذوقی کا ایک اور ناول ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' ہے جو تکنیک کے لحاظ سے کامیاب ناول ہے۔ ذوقی نے جہاں اس ناول میں موجودہ دور کو دکھانے کی کوشش کی ہے وہیں وہ احمد علی کے ماضی کی بھی عکاسی خوبصورت انداز سے کرتے ہیں۔ احمد علی اپنے بچپن کو یاد کرتے ہیں، جہاں وہ بہار کے ایک گاؤں مظفر پور میں اپنے ابا اور اپنی امی کے ساتھ رہتے تھے۔ اگرچہ اماں کی تصویر آنکھوں میں محفوظ نہیں تھی مگر ان کے ہونے کا احساس وہ ہمیشہ اپنے اندر زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ اور ہمیشہ ان کو یاد کرتے رہتے تھے، سوچتے تھے کہ آخر میری اماں مر کیوں گئیں۔ اس کا افسوس ان کو عمر بھر رہتا ہے۔ اقتباس:

''لوگ کیوں چلے جاتے ہیں۔ اماں کو جانا تھا، تو پھر امّاں نے
اسے پیدا ہی کیوں کیا۔۔۔۔۔ بچپن میں کتنی ہی بار اللہ میاں
کے لئے شک کے شعلے کوندے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اسے یاد
ہے۔۔۔۔۔۔۔ تب ابا اسے پیار کرتے تھے۔
۔۔۔۔۔۔۔ اسے سمجھاتے تھے۔ سب کا دن مقرر ہے۔ کون
کب جائے گا۔ کہنا مشکل۔'' ۵۴

فلیش بیک تکنیک کے ذریعے کہانی کو ماضی کی طرف لے جاتے ہیں اور کبھی کبھی حال میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ کہانی کے راوی پرویز سانیال کو جیسے بہت نزدیک سے دیکھا ہے وہ اس کی تمام حرکات وسکنات اور اس کے ماضی وحال سے واقف ہیں۔۔ پرویز سانیال جب پروفیسر کے ساتھ ان کے خانقاہ میں رہتا تھا تو اس کو صرف اس بات کا خیال آتا تھا کہ پروفیسر کی وجہ سے میری زندگی کے کئی قیمتی سال برباد ہو گئے ہیں۔:

''میں، پرویز سانیال ۔۔۔۔۔ یہ کہانی میری بھی ہے۔ لیکن
شاید میں نے غلط کہا ۔ میں اس کہانی کا ایک چھوٹا سا مہرہ
ہوں۔۔۔۔۔۔۔ ایک چھوٹا سا مہرہ ۔۔۔۔۔۔ لیکن ابھی بھی

مجھے لگتا ہے، میں پروفیسر کی خانقاہ کے اس اندھیرے کمرے میں
قید ہوں، جس نے مجھ سے میری زندگی کے کئی قیمتی سال چھین
لئے۔''   ۵۵؎

اس ناول میں ذوقی نے پرویز سانیال، ان کے والد احمد علی اور والدہ ادیتی سانیال کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ ذوقی نے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح یہ لوگ اپنے گھر میں خوشی سے زندگی گزارتے تھے، لیکن پھر اچانک جب پروفیسر ایس ان کی زندگی میں آتا ہے تو ان کی زندگی کا سارا چین اور سکون وہ اپنے ساتھ ہی چھین کے لے جاتا ہے۔ اور قاری اس تجسس میں پڑھتا ہے کہ آخر یہ پروفیسر ایس ہے کون؟

اس ناول میں ایک موضوع ''سونامی'' ہے۔ جس کو ذوقی نے علامت کے طور پر ناول میں استعمال کیا ہے اور اسی سونامی کے ذریعے ذوقی دنیا داری، مذہب، سماج اور سیاست سے وابستہ ہر چہرے کو بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ سونامی لہریں سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں اور پھر سونامی کے بعد ایک عام انسان سے لے کر حکومت تک ہزاروں لوگ مر جاتے ہیں، لاکھوں کروڑوں لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں جب پرویز سانیال پروفیسر ایس کو یہ کہتا ہے کہ میں ایک عام انسان ہوں اور آپ ایک عام انسان نہیں بلکہ بہت خاص ہیں تو پروفیسر کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ:

''موسیو، موت کے بعد بھی زندگی چلتی رہتی ہے ۔۔۔۔۔۔
سونامی سے جہاں نقصان ہوا ہے وہاں فائدے اور روزگار کے
نئے نئے دفتر کھل رہے ہیں۔ اب ایسے مجھے چونک کر مت
دیکھیں موسیو۔۔۔۔۔۔ سمندر میں ہزاروں طرح کے
روزگار چھپے ہیں۔۔۔۔۔   بایواسینوگرافی، فزیکل اسینو
گرافی، میرین کمیسٹری اور آگے بڑھئے موسیو
۔۔۔۔۔۔ سمندری غذا، سمندری علاج، سمندری کھیل، موتیوں
کی تجارت۔۔۔۔۔ سونامی لہریں موت دیتی ہیں تو آپ کو
زندگی بھی دیتی ہیں ۔۔۔۔۔۔ موت کے ہرڈر کے بعد زندگی
کے دس راستے کھل جاتے ہیں۔''   ۵۶؎

ذوقی نے دراصل اس ناول میں سونامی کے ذریعے ایک پوری دنیا کو قید کرنے کی کوشش کی ہے اور سونامی کی سطح پر یہ محسوس کیا ہے کہ قدرت کا بھیجا ہوا سیلاب سب کچھ بہا کر لے جا رہا ہے اور یہاں ہماری قدریں بہہ رہی ہیں ،تعلیم سے لے کر سیاست ، مذہب اور سماج تک ایک ایسی بے زارکن فضا پیدا ہو چکی ہے جس سے باہر نکلنا آسان نہیں ہے۔

ذوقی اپنے ناولوں میں سماج کے مختلف پہلوؤں کو تخلیقی جامہ پہنا کر عام انسان تک پہنچاتے ہیں۔ان کا ناول شہر چپ ہے جس میں انہوں نے بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ بیانیہ تکنیک پر ذوقی کو قدرت حاصل ہے۔انہوں نے ناول کے شروع میں ہی انیل کی دکھ بھری کہانی اس طرح بیان کی ہے کہ قاری کے اندر تجسس پیدا ہوتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ آخر انیل کس سوچ اور فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔:

> ''انیل کمرے میں چپ چاپ اداس بیٹھا ہوا تھا۔ جب تک بابو جی ریٹائر نہیں ہوئے تھے،سوچ اور فکر سے پالا ہی نہیں پڑا تھا۔ اور فکر بھی کیسی ۔۔۔۔۔۔ بابو جی نے کبھی سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا ہمیشہ خوش رہنے کی بات کی ہے۔ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ بیٹا خوش رہو۔ ہنسو اور مسکراؤ کہ یہی زندگی ہے۔ چار دن کی ضرور ہے،مگر ہنس مسکرا لوگے تو چار برس کی ہو جائے گی۔'' ۵۷

اس ناول میں ذوقی نے بیانیہ تکنیک کے ذریعے اپنے ملک اور قوم کا المیہ دکھانے کی کوشش کی ہے جس میں انہوں نے غریب طبقے کی لاچاری ، بےبسی اور بے روزگاری کی عکاسی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ انیل اور رگھو بیرا یسے نوجوان ہیں جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بے روزگار ہے اور وہ دونوں روزگار کے لئے ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔

ذوقی نے ان دونوں کرداروں کے ذریعے ہندوستان کے بے روزگار نوجوانوں کی عکاسی کی ہے جو حالات سے مجبور ہو کر غلط راستے پر چلنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ ذوقی نے جہاں غریب طبقے کی عکاسی کی ہے وہیں وہ ناول میں اعلیٰ طبقے کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انہوں نے اعلیٰ طبقے میں رام اوتار شاستری

کی کہانی بڑی ہی موثر انداز میں پیش کی ہے۔ان کی دو بیٹیاں انو رادھا اور مینا دونوں آزادانہ ماحول میں رہتی تھیں۔

اس ناول میں راوی واحد و غائب نظر آتا ہے۔اس ناول میں لپروسی کیمپ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں پروگریسیو (Progressive) نوجوان لڑکے اورلڑکیاں اس طرح کے مریضوں کے لئے دوا فراہم کر رہے ہیں ۔ چھوت جیسے خطرناک مرض کو جاننے کے باوجود ان میں دلچسپی لے رہے ہیں اور ان کا علاج کرا رہے ہیں۔

ذوقی نے اس ناول میں رگھو بیر اور انیل کے ذریعے ان کے ماضی کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔آٹھ سال بعد جب رگھو بیر انیل کو دیکھتا ہےتو وہ ان کو ماضی کی یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے: اقتباس

''تو میں کہہ رہا تھا کہ ان دنوں ہم دونوں بے کار تھے کندھے پر ٹھیلا، ٹانگے، ہوائی چپل گھسیٹنے صبح میں گھر چھوڑ دیتے اور شام ڈھلے بوجھل قدموں سے نامراد وآپس لوٹاتے۔ میرے گھر میں دو زندہ لاشیں پڑی تھیں۔ایک بیمار ماں دوسری حالات کے چوراہے پر کھڑی اپاہج بہن۔۔۔۔۔گھر میں ہر وقت ویرانی اور تاریکی کی حکومت رہتی۔ میں اس تاریکی سے خوف کھاتا تھا۔اندھیرے کا یہ جنگل مجھے برابر ڈستا رہتا تھا۔اور مجھے غلط کرنے کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔اور اندھیرے کے سوا مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔یعنی آپ کہہ سکتے ہیں میرے سامنے صرف اندھیرے کا پہلو (Dark-side) اور میں اسی ڈارک سائیڈ کو دیکھ رہا تھا۔'' ۵۸

مشرف عالم ذوقی تکنیک کی سطح پر اپنے کہانیوں میں ایک نئے پائدان پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ان کی ہر تخلیق حقیقت پر مبنی ہے۔اور اس حقیقت نگاری میں وہ زیریں لہروں کو اپنے ساتھ شامل کرتے ہوئے چلتے

ہیں۔اس کی مثال ہمیں ناول ''مسلمان'' میں ملتی ہے۔ یہ ناول ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی آپ بیتی ہے۔اس میں انہوں نے آزادی کے بعد مسلمانوں اور مشرکہ تہذیب کا نوحہ بیان کیا ہے۔اوراس کے علاوہ اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ جب ملک تقسیم ہوا ہے تو مسلمانوں اور ہندوؤں میں جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں اور پھر اس کی بنا پر ایسے فسادات ہوئے جس کی سزا بہت سارے بے گناہ اور بے قصور مردوں اور عورتوں کو ملی ،ان سب باتوں کا خاکہ ذوقی نے بیانیہ تکنیک کے ذریعے بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و جبر ،فرقہ وارانہ فسادا ور مسلمان ہونے کی وجہ سے روزگار نہ ملنے کی مشکلات ، بے روزگاری وغیرہ جیسے مسائل کو بیان کیا ہے۔

ناول ''مسلمان'' میں بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ فلیش بیک کی تکنیک کا سہارا لیا گیا ہے۔ یہ تکنیک ناول میں کارآمد ثابت ہوئی ہے کیونکہ اس ناول میں ابتدا سے ہی انجو کو ناول نگار نے خوفزدہ دکھایا ہے جس سے قاری کے اندر انجو کی خوف زدگی اس کے تجسس کو بڑھا دیتی ہے۔:

''ہر رات وہ اپنے جسم سے خوف کی ایسی ہی ایک ڈور کھینچنے کی کوشش میں بکھر جاتی ہے------پتہ نہیں-------بچپن سے لے کر اب تک-------جسم خوف کی کتنی ہی ڈوریں بندھی ہوتی ہیں------ وہ چاہتی تو ہے ہمت ور بننا------طاقتور اور مضبوط ------اتنی بڑی دنیا میں ------ مردوں کے ظلم وستم اور خوف کی کہانیاں بیان کرنے والی اس دنیا میں خوف ------سچ ------وہ بچپن سے ہی خوف کے انجکشن لیتی رہی، لیتی رہی----------'' ۵۹

راوی ہمیں فلیش بیک کے ذریعے انجو کے ماضی کی طرف لے جاتا ہے۔ہمیں بتاتا ہے کہ انجو سب کچھ بھولنا چاہتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ آخر اس سڑے گلے سچ کی ضرورت ہی کیا ہے جو مجھے سوائے آنسوؤں کے کچھ بھی نہ دے سکتا ہے۔اقتباس:

''انجو کے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے -----۔وہ یہ سب کیوں
یاد کر رہی ہے ------ ماضی سے -------- وہ بھی
کیڑے لگے ماضی سے دوبارہ اپنا رشتہ کیوں جوڑ رہی ہے
------ جہاں گھنگھروؤں کا جھنکار اور اس کے آنسوؤں کے
سوا کچھ بھی تو نہیں ہے --------'' ۶۰

ذوقی نے فلیش بیک تکنیک کے ذریعے ہمیں طوائفوں کا دور دکھایا ہے جیسے گوہر بائی نے اس کوٹھے کو اپنا مقدر بنا لیا تھا۔ جب گوہر کی ماں عزیزن کو ویرا کے کوٹھے پر پہنچتی ہے تو وہاں گوہر کا جنم ہوتا ہے، اور عزیزن گوہر کو شہناز بائی کے حوالے کر دیتی ہے، خود اس دنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ شہناز بائی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر پانے کی صورت میں ہمیشہ کے لئے کوٹھے کی زینت بن جاتی ہے۔ گوہر کو ہمیشہ اپنی ماں کی یاد آتی رہتی ہے۔:

''گوہر بائی کو اپنی امی کی یاد آئی ہے جو اسے پیدا کرتے ہی چل
بسی تھیں ------ شہناز بائی نے اسے سب کچھ بتایا تھا
------ پروردگار -------- ساری آزمائش مسلمانوں
کے لئے ------ اماں کو کیسی کیسی مصیبتیں جھیلنی
پڑیں ------ ایک کوٹھا ----- ایک بدنصیب کوٹھا
----- جو ہمیشہ کے لئے گوہر جان کا مقدر بن گیا۔'' ۶۱

ذوقی نے اس ناول میں ایک طوائف کے ذریعے ہندوستانی عورتوں کی بے بسی، لاچاری، بے روزگاری کے علاوہ ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھائے جانے کی کہانی پیش کی ہے۔

ذوقی کا ایک اور ناول 'بیان' ہے جو تکنیک کے لحاظ سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں ذوقی نے فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ناول کا پہلا باب ڈراونا خواب ہے جس میں بالکمند شرما جوش اور برکت حسین اپنے ماضی کو یاد کر کے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی سے کبھی ناامید ہوتے ہیں تو کبھی پر امید۔ برکت حسین جوش کو کہتا ہے کہ آج کل کے بچے صرف جنگ کے بارے میں سوچتے

ہیں۔ جہاں دیکھو وہاں وہ جنگ کے بارے میں تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔لیکن ایک ہمارا زمانہ تھا کتنا خوبصورت ہم جب جوان تھےتو جوانوں جیسے باتیں کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ جنگ کی باتیں ہوتو صرف جنگ کی ہی باتیں کرتے تھے۔لیکن اب دیکھو ہم بوڑھے ہو گئے ،سنجیدہ ہو گئے ، نہ کھانے کی فکر ہے اور نہ پینے کی۔ جوش کو لگتا ہے کہ وقت ہی خراب ہے،اس بات پر برکت حسین کہتا ہے۔:

''نہیں ، وقت کو گالی مت دو جوش بھائی ! ہم ہی خراب ہو گئے
ہیں۔ہم ہی ایک دوسرے کے عیب ڈھونڈتے ہیں۔سامنے سے
آؤ تو گلے ملتے ہیں اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے
ہیں۔ایک دوسرے کو چھرا بھونکتے ہیں۔۔۔۔۔۔بدل گیا ہے
جوش بھائی۔۔۔۔۔۔۔سب کچھ بدل گیا ہے۔۔۔۔۔۔بچے
بدل گئے ہیں، زمانہ بدل گیا ہے۔ ہماری تمہاری باتوں پر چلنے
والے اب کہاں رہ گئے ہیں۔حکم دے کر تو دیکھو، بچے سن لیں تو
سو احسان، سمجھو، نا سنیں تو خیر مناؤ کہ اتنا مان دے رہے ہیں تم کو
کہ قدم قدم پر ذلیل نہیں کر رہے ہیں اور اپنے گھر میں رکھ رہے
ہیں۔'' ؁۶۲

ذوقی نے اس ناول میں ہندوستانی معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ بالمکند شرما جوش ہمیشہ تہذیبی اقدار کے تبدیلی کا ذکر کرتے رہتے تھے،اوران کا تبصرہ بظاہر تو ایک چھوٹا سا طنز معلوم ہوتا تھا۔اس بات پر جب سنجیدگی سے غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں نے واقعی ماڈرن بننے کے لئے بہت کچھ کھو دیا ہے جس کا لوٹنا اب ممکن نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس احساس نے ہم لوگوں کا چین ،سکون ،آرام چھین لیا ہے اور ہمیں مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔اقتباس:

''اب وہ زمانہ کہاں۔۔۔۔۔نہ گھوڑے رہے نہ گھوڑے پالنے
والے۔۔۔۔۔یہ سب خاندانی لوگ ہیں۔۔۔۔۔۔لیکن اب
وہ خاندانی لوگ رہے کہاں۔۔۔۔۔سب زرداروں کی قبیل
کے ہیں تجارتی زبان سیکھ گئے۔ تجارتی زبان ۔۔۔۔کل

کا تاجر بھی آداب اور اخلاق کا سبق سیکھے ہوئے تھے۔ زمانہ کتنا
بدل گیا۔۔۔۔۔ بدلے ہوئے زمانے سے نالاں ہوتے ہیں
جوش صاحب۔۔۔۔۔۔۔'' ۶۳

ذوقی نے فلیش بیک تکنیک کے ذریعے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جہاں پہلے زمانے میں ہر انسان نے زندگی بسر کرنے کے لئے کچھ اصول واضع کر لئے تھے، اس کے لئے وہ اپنے رشتے کی مناسبت سے تہذیب کے دائرے میں رہتے تھے۔ مرد اور عورت کا فرق ہر مذہب اور ہر سماج میں تھا۔ گھر کا رہن سہن تقریباً تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ ملتا جلتا تھا، ہر گھر میں مردوں اور عورتوں کے لئے ایک الگ بیٹھک ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اگر آج کے دور کو دیکھے گے تو ہر طرف بیہودگی اور عریانیت نظر آتی ہے۔

اس ناول میں ذوقی نے فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے کیونکہ ذوقی نے ہمیں آج سے ساٹھ سال پہلے ہی ملک کے حالات کے بارے میں اس ناول کے ذریعے آگاہ کرایا۔ اس وقت ملک میں ہونے والے دنگے اسی طرح ہوتے رہے جس طرح آج ہمارے ملک میں ہو رہے ہیں۔ تب بھی ایسے ہی فرقہ وارانہ طاقتیں ابھرتی رہیں، کانگریس اور بھاجپا اپنا رنگ بدل کر عوام کو لبھاتی رہیں اور عوام ان کے بہکاوئے میں آتی رہی اور آج یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر یہ خوف بیٹھا ہے کہ اس ملک میں کوئی نہیں بچے گا نہ وہ ہندو، نہ وہ مسلمان جو سیکولر ذہن رکھتے ہیں۔

اس پورے ناول میں قاری کے نظروں کے سامنے سے ایسا اقتباس بھی پیش کیا ہے جسے پڑھ کر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کاش ایسا ہوتا کہ کہانی کے اختتام کا اعلان خود مصنف نے نہ کیا ہوتا۔ کیوں کہ قاری کا تجسس منا کے قتل کی وجہ سے اور بڑھ جاتا ہے۔:

'' منا کو جس آدمی نے مارا، کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس آدمی
کے بارے میں بھی آپ کو جانکاری دی جائے، مگر جناب وہ
آدمی ہے ہی ایسا، کہ میرا دل چاہ رہا ہے، مختصر میں اس کے
بارے میں بھی بتاتا چلوں۔'' ۶۴

ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جب قاری اس ناول کا مطالعہ کرنا شروع کرتا ہے تو اس کے

اندرا تنا تجسس بڑھتا ہے کہ اسے بغیر ختم کئے اسے چین نہیں آتا۔ پنڈت بالمکند شرما جوش بیان دینا چاہتے ہیں جو وہ زندگی بھر نہیں دے پائے۔ مرتے وقت کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ کچھ لکھا تھا جو گم ہو گیا۔ یہ ذوقی کی تکنیک کا ہی کمال ہے کہ ناول ختم ہونے کے بعد قاری کے اندر یہ تجسس برقرار رہتا ہے کہ آخر وہ بیان کیا تھا جو بالمکند شرما جوش نے لکھا تھا۔

''نالۂ شب گیر'' ذوقی کے اہم ناولوں میں سے ایک ہے۔ اس ناول میں ذوقی نے بیانیہ تکنیک کے ساتھ ساتھ فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے فلیش بیک کے ذریعے اس دور کی عکاسی کی ہے جب عورتوں کو دوسری جنس جان کر ان پر ظلم و جبر اور استحصال کر کے گھر کی چار دیواری میں قید کیا جاتا تھا۔ اس ناول میں ذوقی نے ترقی یافتہ عورت کی عکاسی کرتے ہوئے ظلم و جبر اور استحصال کے نئے نئے طریقوں کو پیش کر کے نئی عورت جو ڈیجٹل ٹکنالوجی کے دور میں آزاد دکھائی دے رہی ہے، پس پردہ آج مرد اساس معاشرے کے استحصال کا شکار ہو رہی ہے۔ اب عورت برانڈ بن چکی ہے۔ ایک ایسا برانڈ، جس کے نام پر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اپنے پروڈکٹ کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لئے اس کی مدد لیتی ہیں۔ آج اس مہذب دنیا اور گلوبل گاؤں میں عورت نے مرد کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم ہزاروں برس پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں عورت کا صرف ایک ہی چہرہ نظر آتا ہے وہی حقارت، نفرت اور استحصال۔ مرد نے کبھی اسے برابری کا درجہ نہیں دیا ہے۔ یہی سب کچھ اس ناول میں ذوقی نے بیانیہ کی انداز میں کہانی کے ذریعہ بیان کیا ہے۔

اس ناول میں مصنف واحد متکلم حاضر ہے، یہ کہانی اپنے زبانی سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذوقی اس ناول میں واحد متکلم کی حیثیت سے خود موجود ہیں۔:

''بطور مصنف میں اس کہانی کا گواہ رہا۔۔۔۔۔ بطور مصنف میں
نے اپنے آپ کو بھی اس کہانی میں شامل کیا۔۔۔۔۔'' ۶۵

''مرگ انبوہ'' دور حاضر کا ایک اہم ناول ہے۔ ذوقی نے اس ناول میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ ڈائیری کی تکنیک اور فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اس ناول میں راوی خود ایک مرکزی کردار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے ناول میں دوسرے باب کی شروعات ہی ڈائیری کے لکھنے سے کی

ہے۔ جہاں وہ اپنے بیٹے مرزا پاشا سے مخاطب ہوتے ہیں۔:

''پیارے بیٹے۔۔۔۔۔۔تو آخر میری ڈائیری پڑھنے کے لئے
تم نے خود کو تیار کر لیا۔۔۔۔۔۔تم سوچ بھی نہیں سکتے، اس
وقت مجھے کیسی خوشی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔تم مجھے دیکھ رہے ہو
۔۔۔۔۔یادوں میں ہی سہی۔۔۔۔۔تو میں زندہ ہوں پاشا
۔۔۔۔۔۔۔اور تمہارے سامنے ہوں جو اس دنیا سے چلے
جاتے ہیں، خدا معلوم وہ کن دنیاؤں میں ہوتے ہیں۔خلا میں؟
جنت میں۔۔۔۔۔؟ دوزخ میں۔۔۔۔؟ موت کے بعد کی
زندگی کے بارے میں بہت سی کتابیں پڑھی تھیں اور جیسا تم
جانتے ہو کہ لکھنا پڑھنا میرا شوق تھا اور اس شوق نے بھی تمہیں
مجھ سے دور کیا تھا۔۔۔۔۔۔'' ۲۶

اس ناول میں ذوقی نے بیانیہ تکنیک کے ذریعے جہانگیر مرزا کے خاندان کی کہانی کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔آہستہ آہستہ جہانگیر مرزا ماضی میں پہنچ جاتے ہیں پھر وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے رہتے ہیں کہ پرانی نسل کیا تھی اور نئی نسل کیا ہے۔ وہ شروع سے ہی اس کوشش میں تھے کہ مرزا پاشا ان پرانی اور روایتی قدروں کو سمجھے۔ جہانگیر مرزا ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مگر ناکام ہوتے ہیں کیونکہ مرزا پاشا موجودہ دور کی نئی جنریشن کا حصہ ہے اور یہ جنریشن سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتی ہے۔

ناول کی تکنیک میں کردار کشی، بیانیہ کے فن پر قدرت، منظر نگاری، طنز کی آمیزش کے ساتھ ساتھ ملال کی کیفیت کا آپس میں ایک رابطہ ہے۔تسلسل کو قائم رکھنا مشکل کام ہے لیکن یہ فن مشرف عالم ذوقی کو آتا ہے، جسے انہوں نے پوری توانائی کے ساتھ اپنے ناولوں میں استعمال کیا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اتنے طویل بیانیے میں کہیں اکتاہٹ یا بیزاری کا احساس نہیں ہوتا، اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ ان کے ناول اپنے مرکزی نقطے سے ایک لمحے کے لئے دور نہیں ہوتے، قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے اور ان کے تجسس کو مہمیز کرتی رہتی ہے۔

کسی بھی فن کی ساخت میں تکنیک ایک اہم عنصر ہے، کوئی فن پارہ کسی مخصوص تکنیک کے سہارے وجود میں آتا ہے، موضوع اور مواد کے لحاظ سے تکنیک بدلتا رہتا ہے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اب تک تکنیک کی سطح پر کافی تجربے ہوئے ہیں۔ فلیش بیک کی تکنیک، شعور کی رو کی تکنیک اور بیانیہ تکنیک میں لکھے ہوئے ناول موجود ہیں، لیکن بیشتر ناول نگاروں نے بیانیہ تکنیک میں ہی ناول لکھے ہیں جس میں کہیں کہیں ڈرامائی پیش کش اور دوسری تکنیک کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔

۵.۴۔زمان ومکان

زمان ومکان ناول کا ایک جز ہے۔ جب ناول نگار کسی خاص جگہ اور خاص زمانے کو پیش کرتا ہے تو اس کے مطابق کردار اور واقعات کو بھی پیش کرتا ہے کیونکہ ہر جگہ کی خصوصیات الگ ہوتی ہیں اور ہر زمانے کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔اس بات کو ہم دومشہور ناولوں کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔مثلاً امراؤ جان ادا اور گئودان۔ان ناولوں کے زمان ومکان اوران کا پس منظر ہی ہے جوان ناولوں کے پورے ماحول اور فضا کو بدل کر رکھ دیتا ہے، ناول میں زمان ومکان کی بھی اہمیت ہے کیونکہ اگر ناول نگار کے ذہن میں واقعہ یا کردار کے''واقع'' ہونے کی جگہ یا وقت کا صحیح علم نہ ہوتو ناول میں تاثر کی کمی ہو جائے گی۔ایسا نہ ہو کہ کردار کا تعلق شہر سے ہو یا کوئی واقعہ شہر سے متعلق ہو اور بیان میں گاؤں کی بات کی جارہی ہو۔ چنانچہ زمان ومکان کی پیشکش میں بھی ناول نگار کو کمال احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔زمان ومکان میں لباس ، رہائش ،منظر، پس منظر، آس پاس کا ماحول سبھی شامل ہیں۔

زمان ومکان کو بھی بازناقدوں نے ناول کے اجزاءترکیبی میں شامل کیا ہے۔ بقول اسلم آزاد:

> ''دنیا کے تمام واقعات اپنا زمانی اور مقامی پس منظر رکھتے ہیں۔انسانی معاشرے کی افراد کا بھی زمانی ومقامی پس منظر ہوتا ہے ناول کے واقعات اور کرداروں کی عملی سرگرمیوں سے اگر زمان ومکان کے عناصر حذف کر دیئے جائیں تو ان کے حسن اثر کی قوت رائل ہو جاتی ہے ہر واقعہ اپنے اپنے متعلقہ عہد ہی میں معنی خیز ہوتا ہے اور ہر کردار اپنے ہی دور میں اثر انگیز ہوتا ہے اُسی طرح ہر واقعہ کے رونما ہونے کی ایک جگہ ہوتی ہے اور کردار کے متحرک اور سرگرم عمل رہنے کی بھی خاص جگہیں ہوتی ہیں۔ ہر عہد کے اپنے خیالات اور ہر جگہ کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، ناول کا واقعہ انہی حالات اور تقاضوں کے پسِ منظر میں بامعنی بنتا ہے۔'' ۶۷

اس باب میں زمان و مکان کے حوالے سے مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا جائزہ لیا جائے گا۔ ان کے ناول ہمیں اس لحاظ سے کامیاب نظر آتے ہیں۔

ناول ''نیلام گھر''، مشرف عالم ذوقی نے آزادی کے بعد ۱۹۹۲ء میں لکھا ہے۔ اصل میں اس ناول کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات ہی ہے۔ ملک آزاد تو ہوا تھا لیکن آزادی نہیں ملی۔ اس ناول میں خاص طور پر کسی ایک جگہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کہانی کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ کہانی دہلی کی بھی ہو سکتی ہے، عظیم آباد کی ہو سکتی ہے، بنارس کی ہو سکتی ہے، جہاں آئے دن فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہیں۔ خوف، ظلم و ستم، نفرت، بداخلاقی کی، اس کا تعلق پورے ہندوستان سے ہے مگر اس میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو پاکستان میں پائی جاتی ہیں۔

فرقہ واریت فساد سے زیادہ بڑھ کر ہے۔ فساد میں بربادی کے بعد سب کچھ ٹھیک نظر آنے لگتا ہے لیکن فرقہ واریت کی آگ ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں رہتی ہیں۔ ہندوستان کے جو بنیادی مسائل ہیں جیسے بھوک، غربت، بے روزگاری، جنسی بے راہ روی، جہالت وغیرہ ان سب مسائل کی وجہ سے یہ فرقہ واریت اور بھیانک ہو گئی ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے اس ناول کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ کہانی کسی ایک مخصوص جگہ کی نہیں ہے لیکن ناول میں انہوں نے جہان پور کا ذکر کیا ہے کہ جب وہاں ہندو مسلم فساد ہو گیا تو انجم کہتے ہیں کہ ابّا جہان پور میں پھر سے ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ تو کریم بیگ چونک جاتے ہیں اور اس کے بعد اخبار پر سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ان کا دل و دماغ بھاری ہو جاتا ہے اور کہتے ہیں:

آزادی کے بعد ملک میں اگر واقعی کسی چیز نے سب سے زیادہ
ترقی کی ہے۔۔۔۔۔ تو وہ ہے فساد۔۔۔۔۔۔ لڑائی، جھگڑا
۔۔۔۔۔ دنگے۔۔۔۔۔۔ قتل۔۔۔۔۔۔'' ۶۸

ظفر بیگ اور رما کانت علامت ہیں اس بھائی چارے کی جہاں آزادی سے پہلے ہندو مسلمان خوشیوں بھری زندگی گزارتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے یہ سب کچھ بدل دیا۔ ظفر بیگ اپنے بیٹے کریم کو بولتے ہیں کہ:

''بیٹا! کاش میں مر گیا ہوتا۔۔۔۔۔ کیا یہی دن دیکھنا تھا

مجھے ۔۔۔۔۔ یہی سخن آشوب سننے کے لئے اس نے یہ زندگی دی
تھی ۔۔۔۔۔۔ یہ آزادی اکیلے نہیں ملی ۔ مختلف رنگوں اور مختلف
خون کے لوگوں کے باہمی اتفاق سے ملی تھی یہ ۔۔۔۔۔۔ سب کا
خون شامل ہے اس میں ۔۔۔۔۔۔ دو بھائی مل کر ایک گھر میں
رہیں گے ۔۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کریں
گے ۔۔۔۔۔ محبت اور دوستی کے ماحول میں ایک سال بھی
پورے نہیں گزرے کہ یہ کیا سننے میں آرہا ہے ۔۔۔۔۔ کہ دو
بھائی لڑ گئے ۔۔۔۔۔۔ یہ سخن آشوب سننے سے تو موت بہتر
ہے۔'' ۶۹

اس ناول میں مشرف عالم ذوقی نے اس ماحول کو دکھایا ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد کا ہے اور اس ماحول کو بھی دکھایا گیا ہے جو ۱۹۴۷ء سے قبل کا تھا، جب ملک میں فسادات بڑھ جاتے ہیں تو:

''پنڈت چاچا کی آنکھیں بھر آئیں ۔۔۔۔۔ جس نے آزادی
سے قبل کا وہ مثالی ملاپ دیکھا ہو۔ وہ بھائی بھائی کے جھگڑے
کیسے قبول کر سکتا ہے ۔۔۔۔۔ زمانہ بہت خراب آگیا ہے
۔۔۔۔۔۔'' ۷۰

گوکہ مشرف عالم ذوقی نے ۱۹۴۷ء کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کیا ہے لیکن ہمارے ملک میں کہیں نہ کہیں آج بھی ہندوستان میں اس کا بازار گرم ہے بہت کم ایسے مقامات ہونگے جہاں فسادات نہ ہوئے ہوں ۔ مثلاً مظفر نگر میں جو فسادات ہوئے ، جموں کشمیر میں ہوا، گجرات میں ہوا جہاں معصوم لوگوں کو قتل کیا گیا، لوگوں کے گھر جلا دیئے گئے ،عورتوں کا استحصال کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ جس ماحول کی عکاسی ذوقی نے اس ناول میں کی ہے وہ آج بھی ہمارے معاشرے میں ہورہا ہے ۔ جو برائیاں اس وقت کے معاشرے میں ہیں جو فرقہ وارانہ فسادات اس وقت تھے وہ آج بھی ہیں ۔

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں بنگلہ دیش کا ذکر کیا ہے کہ جب بنگلہ دیش پاکستان سے آزاد ہوا جس میں تین لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے ، اور پھر ان کو ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء میں آزادی ملی ۔ ملک کے

فسادات کو دیکھ کے کریم بیگ کو بنگلہ دیش کا منظر یاد آتا ہے اور اپنی بیوی رضیہ سے کہتے ہیں:

''بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد پورا ملک چشم آشوب میں گرفتار ہو
گیا تھا۔ ویسے ہی اس بدبو کو سمجھ لو۔۔۔۔۔ کچھ غلط ہو گیا ہے
۔۔۔۔۔۔ جو بدبو کی صورت میں آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا ہے
۔۔۔۔۔۔'' ۱؎

اس ناول میں کرداروں کی زبان سے ایسا لگتا ہے کہ یہ کہانی بہار یا اتر پردیش کی ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں بھوجپوری زبان بھی ہے۔ جیسے مسز بھٹناگر کہتی ہیں:

''مسز بھٹناگر نے سمجھداری کے انداز میں سر ہلایا
۔۔۔۔۔۔۔ مس نیلی کے قریب گئیں ۔۔۔۔۔۔ اور اپنے
خالص بھوجپوری لہجے میں ساتھیوں سے بولیں ۔۔۔۔۔۔ بھیّا
۔۔۔۔۔ جرا سانس تو لینے دو ۔۔۔۔۔ دیکھت نئ کھے
۔۔۔۔۔ بچر یا کیسن گرموا میں مرل جائے ہے۔ پنکھو بند ہے
ہٹو۔۔۔۔۔ ہٹو۔'' ۲؎

اس کے بعد ذوقی نے اس ناول میں انجم اور رامت کے دور کو دکھایا ہے۔ دونوں میں بہت گہری دوستی ہے۔ انہوں نے نوجوان نسل کے جذبات، سسٹم سے بیزارگی اور اس سسٹم کو بدلنے کے لئے ان نوجوانوں کو پیش کیا ہے کہ کیسے وہ اس سسٹم کو بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ دونوں عوام کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے کیسے نکڑ ناٹک اور پوسٹرس چپکاتے ہیں جو پولیس کو برداشت نہیں ہوتا۔ اس جرم میں ان کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے یہ جو نئی نسل ہے مل جل کر ملک اور قوم کو سدھارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نئی نسل امن اور سکون سے رہنا چاہتی ہے وہ نہیں چاہتی کہ ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ فساد ہو۔

مشرف عالم ذوقی نے ناول ''ذبح'' آزادی کے بعد لکھا ہے۔ یہ ناول ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا ہے اور یہ ناول ہندوستان میں اقلیتوں کے مسائل پر لکھے گئے بہترین ناولوں میں سے ہے۔ اس ناول میں مشرف عالم ذوقی نے اقلیتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ یہ ناول دلتوں یعنی سماج کے سب سے نچلے طبقے سے متعلق

ہے۔ یہ ناول انہوں نے اس وقت لکھا جب ان کو احساس ہوا کہ ہمارے معاشرے میں ہر کمزور انسان کو ''ذبح'' کیا جارہا ہے۔ایک طرف مسلمان ہیں جن کا سیاسی اور سماجی سطح پر استحصال ہورہا ہے اور دوسری طرف دلت طبقہ ہے جو آزادی کے اتنے برسوں بعد بھی پچھڑا ہوا ہے۔ جب ترقی ہوتی ہے تو کچھ چیزیں کمزور اور بے کار ہوکر ماضی کا حصہ بن جاتی ہیں۔عبدل سقہ جیسے لوگ مشک سے پانی بھر کر روزگار حاصل کرتے تھے ایسے لوگ بے روزگار ہو گئے۔سوال یہ ہے کہ ایسے لوگ کہاں جائیں گے۔ایسے لوگوں کا کیا ہوگا۔ناول کا مرکزی نقطہ یہی وہ مقام ہے جہاں مجھے جرمن شاعر کی نظم کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ مجھے لگا، سڑے گلے اس نظام میں ایسے لوگوں کا مسلسل استحصال ہورہا ہے اور کوئی بھی خواہش کے باوجود ان کی مدد اس لئے نہیں کرسکتا کہ گلوبل ہوتی ہوئی دنیا میں ہر چیز پرانی ہورہی ہے۔اس لئے ناول کے آخر میں عبدل سقہ کے بیٹے کو کہنا پڑتا ہے۔اب ہم تیار نہیں ہیں بار بار ذبح ہونے کے لئے۔ذوقی نے نچلے طبقے کے لوگوں کی خستہ حالی اور پریشانی کی عکاسی بہت ہی حقیقی انداز میں کی ہے۔

ناول کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اس ناول کا ایک کردار مصنف خود ہے کیونکہ جس طرح سے وہ عبدل کے زمانے کی کہانی کو بیان کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ کردار بچپن سے ہی ان کے ساتھ رہا ہے۔وہ خود لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے عبدل مشک والے کو شروع سے ہی جس طرح دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، وہ میرے لئے عجیب وغریب فنتاسی جیسا ہے۔'' ۳ے

اس ناول کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس ناول کا زمانہ آزادی کے بعد کا ہے، جہاں ترقی پذیر ہندوستان کے دیہی علاقوں میں بے روزگاری عام ہے اور سرکاری نوکریوں میں جانب داری کے سبب مسلمان پچھڑتے چلے گئے اور کبھی کبھی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کاش وہ پاکستان چلے گئے ہوتے تو شاید حالات بہتر ہوتے۔مسلمانوں کے ان احساسات کو ذوقی نے اپنے کرداروں کے ذریعے بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''بیان'' ۱۹۹۵ء میں اردو اور ہندی زبانوں میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کا واقعہ یعنی بابری مسجد کا انہدام ہے۔اس کے بعد ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ

فسادات اور سیاسی و سماجی طور پر رونما ہونے والی تبدیلیوں پر مبنی یہ ناول ہے۔ اس تبدیلی کے اثرات نے انسان کے اندازفکر، طرز عمل، احساسات، شعور اور تخیل سب کو تبدیل کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ پرانی تہذیبوں کی روایت تبدیل ہوگئی۔ پرانی قدریں ختم ہوگئی اور نئی قدروں نے جنم لیا۔ مذہب کی بنیاد پر لوگوں نے ہجرت کرنی شروع کر دی۔ ان عوامل نے سارے معاشرے کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ لوگ مذہب کو بنیاد بنا کر خون کی ہولی کھیلنے لگے، انسانوں کی ان مذموم حرکتوں نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے، انسان ہی انسان کے خون کا پیاسا بن گیا ہے، صدیوں پرانے لوگ یہاں ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے اور عدم تحفظ کی وجہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں دو خاندانوں کے ذریعے اس کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ یہ ناول شروع سے لے کر آخر تک ان دو خاندانوں پنڈت بالمکند شرما جوش اور چودھری برکت حسین کے خاندانی رسم و رواج کے اردگرد گھومتا ہے۔ بالمکند شرما جوش اور برکت حسین ان چند لوگوں میں سے ہیں جو گنگا جمنی تہذیب کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔ بالمکند شرما جوش اردو کے شاعر ہیں، وہ اردو کو ہی اپنی زبان مانتے ہیں اور وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ جوش صاحب کا بڑا لڑکا انیل، جو کانگریسی ہے اور چھوٹا بیٹا نریندر جو بھاجپائی ہے، انیل کی بیوی تلسی ہے اور نریندر کی بیوی اوما ہے، اوما کی ایک لڑکی مالو ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان سیاسی نظریے کی وجہ سے اختلاف تو تھا ہی لیکن جائیداد کے بٹوارے کو لے کر اختلاف اور گہرا ہو جاتا ہے۔

پرانے وقتوں میں لوگوں کو دولت کا لالچ اور ہوس نہیں تھی، تب رشتے ناطے کی قدر تھی، لوگوں کے پاس تہذیب اور تمیز تھی لیکن آج کے زمانے میں انسان یہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ کیونکہ بدلتے ہوئے ماحول نے انسان کو دولت کا پجاری بنا دیا ہے، آج کل کا انسان اس قدر مادہ پرست ہو گیا ہے کہ وہ اپنے معاشرے میں بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ ساتھ رشتوں کا لحاظ کرنا بھول گیا ہے، اس کے علاوہ نہ وہ تہذیب باقی رہی نہ وہ تمیز، کیوں کہ مغربی تہذیب نے انسانوں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

آج کل کے بدلتے ہوئے ماحول میں انسان آہستہ آہستہ اکیلا ہوتا جا رہا ہے، والدین کو صرف

خاندان کی عزت کے طور پر رکھا جاتا ہے اور مجبوری میں اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور اگر والدین کوئی صحیح بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو بچے ان کو یہ کہہ کر نظرانداز کرتے ہیں کہ یہ بڑھاپے کا اثر ہے یا یہ کہتے ہیں کہ یہ الزیمرس کے مریض ہیں، جس کی وجہ سے ان کا دل اندر ہی اندر خون کے آنسو روتا ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اب ہم بوڑھے ہو گئے، اب ہمارا زمانہ نہیں رہا، اب نہ ہم کسی کو سمجھا سکتے ہیں نہ کسی کو رائے دے سکتے ہیں۔ ہم صرف نئی نسل پر بوجھ ہیں جسے وہ مجبوری کے تحت ڈھو رہے ہیں۔ ذوقی نے یہاں اس بات کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے کہ والدین اور اولاد کے بیچ جو یہ دوریاں ہیں، اصل میں یہ نئی تہذیب کی ہی دین ہے۔ یہ دوریاں بٹوارے تک پہنچتی ہیں، جس کا اظہار بالمکند شرما جوش کے درد بھرے لہجے سے صاف نظر آتا ہے۔:

''اب تم جان گئے ہو گے۔ میرے دو ہی بچے ہیں لیکن ایک
مشرق ہے تو دوسرا مغرب۔ مین جانتا ہوں مشرق اور مغرب کو
ملانے کی کاروائی بے سود ہے میاں اس لئے اب تھک کر بیٹھ گیا
ہوں۔ ان کی باتیں سنتا ہوں، ان کی آپسی جھڑپ دیکھتا ہوں،
ان کے درمیان بڑھتی دوریاں دیکھتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے
اس گھر کا۔۔۔۔۔۔ پرکھوں کی میراث کا۔۔۔۔۔۔'' ۴۷

دراصل نئی نسل نے غلام ہندوستان کو نہیں دیکھا تھا نہ انگریزوں کی صعوبتوں کو دیکھا۔ انہیں پرانی تہذیب وتمدن سے کوئی سروکار نہیں تھا ان کے لئے یہ ساری کتابی باتیں ہیں۔ انہوں نے جس آزاد ہندوستان کو دیکھا وہ نفرت کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس لئے ہمیں نئی نسل کو قصوروار نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ ان کا کوئی قصور ہی نہیں ہے قصور ہے تو صرف ہمارے معاشرے کا ہے جہاں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں اور نئی نسل نے تو اسی فرقہ وارانہ فساد میں ہی آنکھیں کھولیں ہیں اور ایسے ماحول سے متاثر ہونا ان کے لئے جائز ہے۔

اس ناول میں کئی جگہوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً علی پور، کھیمپور، اکبر پورہ، کلیم پور، بہشتی پورہ، بھشتی ٹولہ، دالان والی مسجد، محلّہ قریش، شو پوری وغیرہ۔ آزادی کے بعد فرقہ واریت کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبوں میں

تبدیلی آ گئی ہے یہاں تک کہ مذہب کو سیاست کے ساتھ جوڑا گیا ہے اور اس کے جوڑنے سے آزادی کے بعد ملک میں جو فضا قائم ہوئی اس کا تصور کچھ ایسا ہی ہوسکتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں وہ دور بھی دکھایا ہے جب بابری مسجد پر ۱۹۹۲ء میں حملہ ہوا اور اس حملے میں تینوں گنبدوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ ناول میں اس کا ذکر فیض سقراطی اس طرح کرتے ہیں۔:

''جو ہونا تھا سو ہوگیا۔۔۔۔۔۔۔مسجد ٹوٹ گئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں مسجد مت کہو۔ ڈھانچہ کہو۔ میرا پہلا اعتراض تو اسی بات پر ہے۔ وہ مسجد تھی، آخری وقت ٹوٹنے سے قبل تک وہ مسجد تھی تو اسے مسجد ہی کہا جائے گا۔حکومت نے وہائٹ پیپر جاری کیا اور الزام سے بری ہوگئی اور وہ لوگ جو فخر سے کہتے ہیں کہ یہ میری فوج نے کیا۔ان پر قانون کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ وہ آزادانہ گھومتے رہتے ہیں۔'' ۵؎

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''شہر چپ ہے'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ ناول فلمی اور میلوڈراما کے طرز پر لکھا گیا ہے۔اس میں ہمارے ملک اور قوم کی المناک داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ ناول ذوقی کے کالج کے دنوں کی تخلیق ہے۔ یہ تخلیق ۱۹۸۰ء کے آس پاس کی ہے۔اس بات کا ذکر ذوقی نے ناول کے پیش لفظ میں یوں کیا ہے۔اقتباس:

'' شہر چپ ہے، ۱۹۸۰ء کے آس پاس کی تخلیق ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ یہ وہ دور تھا جب عالمی ادب کے گرانقدر شہہ پارے اپنی چکاچوندھ سے مجھے گرمارہے تھے اور سرپھری لہروں اور دھوپ کی تمازت کا مارا ایک نوجوان انہیں پڑھتا ہوا ناول کی تکنیک سیکھ رہا تھا۔'' ۶؎

یہ ناول ذوقی نے دوستوفسکی کے (Crime & Punishment) سے متاثر ہوکر لکھا ہے۔اس میں انہوں نے غریب طبقے کی عکاسی بڑی ہی خوبصورت انداز میں کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس

بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بیروزگار نوجوان، بے بس اور لاچار لوگ کس طرح جرم کرنے پر راضی ہوتے ہیں اور وہ اپنا پیٹ کس طرح پالنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ناول میں ذوقی نے انیل اور رگھو بیر کے دور کو دکھایا ہے۔ دونوں پڑھے لکھے ہیں لیکن بیروزگار، اور روزگار کے لئے وہ دونوں صبح سے شام تک بھٹکتے رہتے ہیں۔ لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا اسی لئے رگھو بیر انیل کو یہ بولنے پر مجبور ہوتا ہے کہ:

''اب میری بات غور سے سنو۔۔۔۔۔ میں نے شہر کے دور دراز علاقے میں تین چار روز کے لئے ایک مکان لے لیا ہے۔ کل شام دو تین گھنٹے کے لئے ایک گاڑی کرائے پر لے لی ہے۔ بس اب ہمت کی ضرورت ہے۔ ہم کسی بچے کو اغوا کریں گے اور ان کے ماں باپ سے روپیہ مانگیں گے۔۔۔۔۔۔ انیل بالکل سناٹے میں آ گیا، کیا بکتے ہو۔۔۔۔۔۔ رگھو بیر یہ جرم ہے۔'' ۷ے

اس ناول کی کہانی کسی ایک شہر کی نہیں ہے اور یہ شہر بہار میں بھی ہوسکتا ہے، دہلی بھی، یو پی بھی کیونکہ اس میں ہر شہر کی داستان نظر آتی ہے۔ ہندوستان صرف دلی، کلکتہ یا ممبئ تک ہی محدود نہیں ہے۔ اگر آپ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں جائیں گے تو وہاں آپ کو ہندوستان کا اصلی چہرہ نظر آئے گا۔ اس کا ذکر مکیش ناول میں اس طرح کرتے ہیں:

''ہندوستان صرف دلی، کلکتہ، ممبئ اور مدراس نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں جاؤ، جہاں گھٹن ہے، غریبی ہے اور بجلی نہیں ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کا صحیح چہرہ وہیں دکھائی دیتا ہے۔'' ۸ے

ناول'' مسلمان'' ۱۹۹۰ء میں پہلے ہندی میں شائع ہوا اور پھر یہ ناول اردو میں ۲۴ سال بعد یعنی ۲۰۱۴ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ اس ناول میں ذوقی نے ہندوستانی مسلمانوں کی درد بھری داستان

بیان کی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کو صرف ایک ہی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ افغانستان سے عراق، اور اسامہ سے صدام تک امریکہ صرف ایک ہی نام اور کہانی کو دہرا رہا تھا۔Terrorist یعنی مسلمانوں کو Terrorist کے نام سے ہی یاد کیا جاتا تھا۔ اسی کو مدنظر رکھ کر ذوقی نے ناول 'مسلمان' کو لکھا تاکہ مسلمانوں کو دہشت گرد کہنا ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ ۲۴ برس پہلے ذوقی اس احساس سے دوچار تھے۔ لیکن ۲۴ برس بعد ہندوستان کی صورت حال اور بھیانک ہوتی ہوئی نظر آتی ہے کیوں کہ دوسری قوموں نے ہر بار مسلمان اور اسلام کو کچھ ایسے خونی رنگوں میں پیش کیا ہو تو پڑھتے اور دیکھتے ہوئے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس تکلیف کا احساس تو الگ ہے مگر ہندوستان میں رہنے والے پچیس کروڑ مسلمانوں کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔:

''ارے، آپ مسلمان ہو؟''

''ہاں بھئی ہاں۔۔۔۔۔۔۔''

''تو۔۔۔۔۔۔مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں۔''

''یعنی مسلمانوں کو کیسا ہونا چاہئے؟''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔''

میں سمجھتا ہوں۔ میزائلیں، راکٹ لانچرس، اے۔ کے ۴۷ وغیرہ

ہر وقت ہاتھوں میں رکھ کر گھومنا چاہئے۔۔۔۔۔ وہ جا رہا ہے

مسلمان۔۔۔۔(آتنک وادی)۔۔۔۔۔ ہے نا؟'' ۹ے

ذوقی کا یہ ناول ایک جنگ ہے، جہاد ہے۔ کیونکہ آزادی کے بعد ہندوستان میں کچھ بھی ہوتا ہے تو مسلمان کو ہی کیوں شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جب کہ یہودیوں، انگریزوں، ہندوؤں کو دہشت پسند یا Terrorist کہتے وقت ہم ان کے مذہب کو دہشت پسندی سے نہیں جوڑتے۔ پھر ساری دنیا میں اسلامی آتنک واد، اسلامی دہشت پسندی یا (Islamic Terrorism) کا نعرہ کیوں دیا جا رہا ہے، اسی نظریئے کو بدلنے کے لئے ذوقی نے اس ناول کا سہارا لیا ہے۔

ذوقی نے ناول میں طوائفوں کا بھی دور دکھایا ہے، آزادی کے بعد دنگے اور فساد تو جیسے اس ملک کی

تقدیر بن گئے تھے۔شہر میں ہنگامہ پھر سے ہوتا ہے۔ یہ علاقہ رانی منڈی کا تھا اور یہ پورا علاقہ ہی رنڈیوں کا تھا، یہاں پر مسلم طوائفوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی۔ان میں زیادہ تر لڑکیاں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والی تھیں، ناول کے اس موڑ پر بائی اماں کو اپنے تاجر گاہک کی بات یاد آتی ہے۔اقتباس:

''دیکھ لینا یہاں بھی جم کر فساد ہوگا۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی
اچھی خاصی ہے۔مسلمان خوشحال ہیں، تجارت میں بھی آگے
ہیں۔آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد جیسی جماعتوں کی آنکھیں
تو بس ایسے ہی شہروں پر ٹکی رہتی ہیں۔دنگے کروا دو۔۔۔۔۔
مسلمانوں کو غریب اور بے روزگار بنا دو۔معاشی طور پر انہیں اتنا
کمزور کردو کہ وہ سر ہی نہ اٹھا سکیں۔''   ۸۰؎

اس ناول میں تو زیادہ عکس بہار کا ہی نظر آتا ہے کیونکہ ناول نگار کا تعلق تو بہار سے ہی ہے۔انہوں نے چونڑا البستی کا ذکر کیا ہے جو بہار کے بھوجپور کے نقشے میں ہے۔جب ۱۹۴۷ء کے آس پاس ملک میں ہندو مسلم فساد تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں تو ہر طرف تباہی کا طوفان مچنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ چونڑا البستی اس زد میں آجاتی ہے اور اس کے علاوہ لکھی پور کا ذکر اس ناول میں ملتا ہے۔:

''چونڑا البستی۔۔۔۔۔۔۔
بہار۔۔۔ بھوجپور کے نقشے میں آج بھی بستی موجود ہے۔
لیکن کل والی بات کہاں۔اب تو یہاں کی دنیا ہی مختلف
ہے۔۱۹۴۷ء کے آس پاس جب ہندو مسلم دنگے تیز ہوئے
اور چاروں طرف مار کاٹ مچ گئی تو تباہی کا یہ طوفان رفتہ
رفتہ چونڑا البستی بھی پہنچا۔۔۔آگے لکھی پور ہے، لکھی پور میں
مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے تو چونڑا البستی میں الہیروں کی۔
وہاں بس گنتی کے مسلمان ہیں۔۔۔۔۔یہی، لے دے کر دو
چار گھر، لکھی پور کے مسلمانوں نے مار کاٹ کی تو چونڑا البستی
میں بھی تناؤ کی فضا بن گئی۔۔۔۔۔''   ۸۱؎

ذوقی نے اس ناول میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے ساتھ ساتھ دہلی کی اجڑتی ہوئی تہذیب کو مولوی عنایت اللہ کے ذریعے دکھانے کی کوشش کی ہے۔:

''مولوی عنایت اللہ کے گھر کا باہری کمرہ اس وقت زیادہ تر داڑھی والے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوپہر کی تپش اپنے شباب پر تھی۔ یہ پرانی دلی کا علاقہ تھا۔ پرانی دلی، جدھر سے بھی گزرے، یہ خیال آتا تھا، کہ کیا یہ وہی دلی ہے، جسے مغل بادشاہوں نے سر آنکھوں پر بیٹھا رکھا تھا۔جس کے بارے میں کیسی کیسی داستانیں مشہور تھیں۔۔۔۔۔ پرانی دلّی، جس کے تصور سے ہی دلی کی پرانی رونق اور کہانیاں یاد آجاتیں۔۔۔۔ میاں، یہ وہ دلی نہیں ہے۔۔۔۔دلی تو لٹ گئی۔کب کی برباد ہوچکی ہے۔۔۔۔۔۔کیسی کیسی کہانیاں ۔۔۔تہذیب تو کبھی یہاں کھیلی تھی۔۔۔۔ پلی بڑھی تھی۔۔۔سجی ہوئی دکانیں، شاہی خاندانوں کی گزرتی سواریاں ۔۔۔۔کہیں کسی موٹر سے ابھرتی ہوئی تیز صدا۔۔۔۔۔'' ۸۲

ذوقی نے ناول ''مسلمان'' میں طوائف کو استعارہ کے طور پر استعمال کر کے قارئین کو چونکانے کی کوشش کی ہے، ایک طرف جہاں طوائفوں کو اچھوت سمجھا جاتا ہے اور ہر بار ان کی عزتوں کا سودا ہوتا رہتا ہے۔ بالکل ویسے ہی مسلمان اس ملک میں اچھوت بن کر رہ گئے ہیں اور بار بار مسلمانوں کی عزت کا سودا ہوتا رہتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول نئی نسل اور بدلتی ہوئی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں فلمیں، ٹی۔وی، کمپوٹر اور کارٹون جیسی چیزیں بچوں کی زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔ اور پھر ذوقی نے گلوبلائزیشن کے نام پر ایک ایسی تہذیب ہمارے سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو ایک انسان کو ہوس پرستی کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔

ذوقی نے اس ناول میں ہمیں ''پو کے مان'' کا تعارف کرایا ہے کہ کس طرح گلوبلائزیشن اور سائنس کے ذریعے ایک چھوٹے سے خطے کی چیزیں، خیالات اور احساسات ایک لہر کی طرح ساری دنیا کو اپنے گرفت میں لے لیتے ہیں، کس طرح ایک جاپانی کمپنی کا بنایا ہوا ''پو کے مان'' کا ماڈل ساری دنیا کے بچوں میں مشہور ہوتا ہے اور پھر ان کا جنون بنتا ہے۔ یہ بچے پو کے مان کے کارڈ کو حاصل کرنے کے لئے کس طرح حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان سب کے بارے میں سنیل کمار رائے نے ناول میں پو کے مان کا تعارف یوں کرایا ہے۔:

> ''سنا ہے جاپانی کمپنی نے ۱۵۰ طرح کے 'پو کے مان' کے ماڈل
> تیار کئے ہیں۔ ہر طرح کے پو کے مان، کارڈس، گیم، لوڈو، ٹریڈ
> اور چھوٹی چھوٹی شیشہ کی طرح سفید گولیوں میں قید پو کے مان
> ------ میرا نمبر ۱۵۱ ہے------- میں ایک سو
> اکیانواں پو کے مان ہوں----- جسے جاپانی کمپنی نے اب
> تک ڈیزائن نہیں کیا ہے-----'' ۸۳

اس ناول میں ذوقی نے قاری کو اس عہد سے اخبار کے ذریعے آگاہ کرایا ہے کہ جب ۲۰۰۲ء میں آمرانہ حکومت نے گجرات سانحہ میں مسلمانوں کی نسل کشی کی، نہ جانے ان دنگوں میں کتنے لوگ اس حادثے کے شکار ہوئے تھے۔ انہوں نے قاری کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ جب تک ہمارے معاشرے میں سنیل کمار رائے جیسے لوگ ہیں تب تک معاشرے میں بے گناہ لوگوں کو انصاف دلانے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ناول نگار نے سنیل کمار رائے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کی دنیا میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں جن کے پاس ایسے سنسکار ہوتے ہیں اور جو ایسے واقعات سے پریشان ہوتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو سنیل کمار رائے جیسے لوگوں کو ایسے معاملوں میں خوشی ملتی ہے جہاں سپریم کورٹ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے کہ بند کیس پھر دوبارہ سے کھل جاتے ہیں۔ ذوقی نے اس ناول میں نئی نسل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جہاں آج کل کے بچے انٹرنٹ اور کمپوٹر کے دور کی پیداوار ہیں اور وہاں وہ ان چیزوں کا غلط استعمال کر کے اپنی تہذیب سے بے نیاز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں ایک طرف بھیانک رئیلٹی (Reality) ہے تو دوسری طرف فنٹاسی (Fantasy)۔ اس بات کا ذکر سنیل کمار رائے یوں کرتے ہیں:

''مجھے لگتا ہے۔ چھوٹی عمر کے یہ بچے اچانک ایک دن فنٹاسی اور
رئیلٹی کے بیچ پھنس جائیں گے اور وہ حادثہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ
اس ۱۲ سال کے بچے نے کیا۔۔۔۔۔'' ۸۴

ناول نگار نے ایسے بچوں کی عکاسی روی کنچن کے ذریعے کی ہے۔ کیونکہ وہ ایک بھیانک رئیلٹی سے گزر چکا ہے۔ ذوقی کا ماننا ہے کہ یہ بچے کا قصور نہیں ہے بلکہ یہ آج کل کے ماں باپ کا قصور ہے جو اپنے بچوں کے لئے وقت نہیں نکال پاتے اور نہ ہی ان کی پرورش دھیان سے کرتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کی ناول ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' ۲۰۰۵ء کو شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ اس ناول میں ذوقی نے موجودہ عہد کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی اور فکری ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ یہ ناول ذوقی نے اس وقت لکھا ہے جب ملک میں ۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ء کو سونامی کی تباہی نے اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گئی۔

اس ناول میں ذوقی نے بہار کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ احمد علی جو بہار کے مظفر پور شہر میں پیدا ہوئے۔ شروع میں یہ بہت غریب تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب بہار کے زیادہ تر مزدور لوگ ہجرت کر کے بنگال کے گاؤں، قصبوں اور شہروں میں روزگار کی تلاش میں جاتے تھے۔ پھر ناول نگار نے سدیپ سانیال کے ذریعے نکسلائٹ مومنٹ کا دور دکھایا اور بتایا ہے کہ زمانے میں مغربی بنگال کی سرکار نکسلائٹ کے نام پر لگاتار وارنٹ، ایشو کر رہی تھی کیوں کہ سدیپ سانیال نکسلائٹ مومنٹ سے جڑے ہوئے تھے۔ اس مومنٹ میں انہوں نے غریب، مزدور اور مظلوم کے لئے آواز اٹھائی تھی۔

اس ناول میں ذوقی نے پروفیسر ایس کے ذریعے موجودہ دور کی عکاسی کی ہے۔ پروفیسر ایس پرویز کو اپنا کلون بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے دس سال لگائے مگر ناکام ہوئے۔ پروفیسر ایس ایک مکار، جھوٹے اور دھوکہ باز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ سچ سے بھاگتے تھے ان کو اپنے آپ پر غرور تھا۔ ذوقی نے اس کردار کے ذریعے آج کے معاشرے کی حقیقی زندگی کی تصویر کو پیش کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ ایسے شخص کہیں نہ کہیں آج ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جو ایک عورت کو صرف جنسی تعلقات کے لئے استعمال کرتے ہیں اور محبت کو بے کار رشتے مانتے ہیں۔ ایسے لوگ محبت اور محبت کرنے والوں سے نفرت کرتے

ہیں۔

اس ناول میں ذوقی نے ''سونامی'' کے ذریعے پوری دنیا کی سچائی دکھانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے مذہب، سماج، سیاست، یہاں تک کہ اردو کے ٹھیکیداروں کو بے نقاب کیا ہے۔جو زبان کے فروخت کا سودا کر کے انعام و اکرام حاصل کرتے ہیں۔انہوں نے عام انسان سے حکومت تک ہر چہرے کو بے نقاب کیا ہے۔پروفیسر ایس پہلی بار انھی سونامی لہروں کے درمیان بے نقاب ہوتا ہے۔اِسی لئے پروفیسر ایس کو کہنا پڑتا ہے۔:

> ''ایک مرد اور ایک عورت جیسے۔۔۔۔۔اس اطالوی فلم میں دکھایا گیا تھا۔۔۔۔ بس ایک مرد اور ایک عورت ۔۔۔۔۔ساری دنیا ختم ہو چکی ہے۔۔۔۔۔لیکن دنیا بننے کا عمل جاری ہے۔۔۔۔ کیونکہ ہم میں جینے کی طاقت موجود ہے۔۔۔۔مگر آہ، موسیو، ابھی کچھ دیر پہلے جو ہوا وہ آگے نہیں ہونا چاہئے۔۔۔۔۔'' ۸۵؎

انسان اپنی ترقی اور ایجادات کے لئے نئے نئے راستے تلاش کرتے پھرتے ہیں لیکن قدرت اس کو تباہ کرنے میں ایک سکنڈ بھی نہیں لگاتی۔انسان اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے روبوٹ تیار کر دیتا ہے اور ایک دن یہی ربوٹ پھر اس کے خلاف کھڑا ہوتا ہے۔وہ اپنے لئے بڑی بڑی مشینیں تیار کرتا ہے اور یقیناً ایک دن وہ پھر مارا جاتا ہے۔بالکل ویسے ہی جیسے ناول میں پروفیسر ایس کو لگتا ہے کہ سب کچھ میرے بس میں ہے۔ میں ہر کسی پر حکومت کر سکتا ہوں۔ پرویز کو لگتا ہے کہ ایک طرف قدرت کا بھیانک مذاق ہے اور دوسری طرف پروفیسر ایس جیسے لوگ ہیں جو لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ بھیانک مذاق کرتے ہیں۔:

> ''پروفیسر ایس، تمہارا کھیل ختم۔۔۔۔'' اتنے بڑے بازار میں، ہم سب بھی الگ الگ چھوٹے چھوٹے بازار بن گئے ہیں۔ہم سب ایک ہی ریموٹ سے چلنے والے بازار ہیں۔جن پر کنٹرول کسی اور کا ہے۔ہم وہی سوچتے ہیں جو ہمیں سوچنے کے لئے مجبور

کیا جاتا ہے۔۔۔۔ہم وہی کرتے ہیں جو ہمیں کرنے کے لئے

کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔اس سے زیادہ ہماری کوئی حیثیت نہیں

ہےاور آج اس بازار میں سب سے زیادہ بکنے والی کوئی چیز ہے تو

وہ ہے موت۔۔۔۔۔'' ۸۶

ناول ''آتش رفتہ کا سراغ'' ۲۰۱۳ء میں دہلی میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ذوقی نے آج کے مسلمانوں کے حالات اور بٹلہ ہاوس انکاوئنٹر کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول ۷۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ذوقی نے اس ناول کے ذریعے آزادی سے لےکر اب تک کا دور دکھایا ہے۔ اصل میں یہ ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی ہے جو آزادی سے لےکر اب تک مسلمانوں پر گزرا ہے۔

ذوقی نے مسلمانوں کے مسائل پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔انہوں نے بٹلہ ہاوس انکاوئنٹر کو مسلمانوں کی زندگی کے ساتھ جوڑا ہے جبکہ بٹلہ ہاوس انکاوئنٹر کو انہوں نے محض علامت کے طور پر استعمال کیا ہے گوکہ یہ بٹلہ ہاوس انکاوئنٹر کی ہی کہانی ہے مگر انہوں نے اس ناول میں آزادی کے بعد کے ہندوستانی مسلمانوں کا وہ چہرہ دکھایا ہے جہاں ہر چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سے بڑی کاروائی کے لئے ایک ساتھ ۲۵ کروڑ مسلمانوں کی آبادی نشانے پر آجاتی ہے، آخر ایسا کیوں ہے ہر بار مسلمان ہی کیوں نشانہ بنتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہر بار مسلمان کے لباسوں پر انگلیاں اٹھتی ہے۔ بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں، نہ جانے کتنے لوگ خاموشی سے غائب ہو جاتے ہیں، مسلمانوں کو کرائے کے گھر نہیں ملتے، کال سنٹر سے لے کر ہر جگہ ایک مسلمان کو شک کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا ہے۔

ذوقی اس ناول میں ارشد پاشا کے خاندان کے ذریعے مسلمانوں کی عکاسی کی ہے۔ ان کا ایک بیٹا اسامہ ہے جو سولہ سال کا ہے، اسامہ کے طور طریقوں سے ارشد پاشا خوفزدہ ہوتے ہیں۔:

''تب اسامہ کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی آنی شروع ہوئی

تھی۔۔۔۔اور حق بات یہ ہے کہ میں اس کے بدلے ہوئے طور

طریقے سے خوفزدہ رہنے لگا تھا۔۔۔۔سر پر سفید سی دو پلی ٹوپی

اور کرتا پائجامہ۔۔۔۔سولہ سال کے اسامہ میں آنے والی ان

تبدیلیوں سے میرا گھبرا جانا واجب تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں
کوئی پریشانی نہیں کہ مسلمان ہونے کے باوجود زندگی جینے کا میرا
پنا انداز تھا اور اس انداز میں مذہبی رنگ کبھی غالب نہیں
رہا۔۔۔'' ۸۷

آج کا مسلمان کتنا بے بس اور لاچار ہے۔ جیسے ارشد پاشا اپنے بیٹے کے نام سے کس طرح ڈرا ہوا تھا۔ کہ میرے بیٹے کا نام اسامہ کیوں ہے لیکن کیا کرتا یہ نام ان کے ابّا حضور نے تجویز کیا تھا کیوں کہ ان کو اس طرح کے اسلامی نام پسند تھے مگر اس میں ان کا کیا قصور تھا کیوں کہ تب ۱۱/ ۹ کا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا، اسامہ نام دہشت گردی کی علامت کے طور پر سامنے نہیں آیا تھا۔ جیسے جیسے اسامہ بڑا ہوتا گیا تو اس کو اپنے نام سے خوف آنے لگا تھا۔:

'' ابا، آپ کو کوئی اور نام نہیں ملا؟
'کیوں'؟
' بچے چڑاتے ہیں۔ پوچھتے ہیں تیری داڑی کہاں گئی'
۔۔۔۔۔۔ میں غصے میں کہتا۔۔۔۔۔۔' کیا ایک نام کے
سارے لوگ دہشت گرد ہوتے ہیں۔؟ ۸۸

ذوقی نے اس ناول میں اسامہ، علوی، راشد اور منیر کے ذریعے بٹلہ ہاوس انکاوئنٹر کو دکھایا۔ انکاوئنٹر ہوتا ہے اور اس انکاوئنٹر کا الزام راشد، اسامہ، علوی اور منیر پر لگایا جاتا ہے۔ منیر اور راشد کو اسی انکاوئنٹر میں مار دیا جاتا ہے اور اس انکاوئنٹر میں ورما کو گولی لگ جاتی ہے۔ لیکن اس میں اسامہ اور علوی پر الزام تھا۔:

''اس وقت جہاں پورا ملک اس انکاوئنٹر کو لے کر طرح طرح
کی باتیں کر رہا تھا، وہاں شاید یہ اصلیت ابھی بھی کم لوگوں کو
معلوم تھی کہ اس انکاوئنٹر سے کچھ روز قبل رات کو بٹلہ ہاوس کی
پلیا چوکی میں کون سا واقعہ پیش آیا تھا۔۔۔۔۔۔ اُسامہ کے
علاوہ پولیس تینوں بچوں کو اپنا شکار بنا چکی تھی ۔۔۔۔۔۔
علوی پولیس کی حراست میں تھا۔ منیر اور راشد انکاوئنٹر میں

مارے جا چکے تھے۔۔۔۔۔اور پولیس انکاؤنٹر کو سچ ثابت
کرنے کے لئے پُرانے گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کر
رہی تھی۔''   ۸۹

جب ۱۹۳۴ء میں بابری مسجد کی دیوار اور گنبد کا ایک حصہ شہید ہو گیا تو ملک میں ہندو مسلم فساد ہوا اور یہ نفرت کی لپٹیں آسمان چھونے لگی تھیں۔ جب ۱۹۸۶ء میں فیض آباد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مسجد کو ہندوؤں کے ذریعے پوجا کے لئے کھولنے کا حکم دیا۔ تو ملک میں اور زیادہ فساد ہونے لگا اور ایک بار پھر لوگوں نے رام جنم بھومی کی آزادی کی مانگ کی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جن فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کیا گیا ہے وہی سب کچھ ہمارے معاشرے میں آج بھی ہو رہا ہے جو برائیاں اور خرابیاں اس وقت کے معاشرے میں تھی وہ آج بھی ہمارے معاشرے میں کسی نہ کسی جگہ نظر آتی ہیں۔

ذوقی نے ناول میں مسلمانوں کو جبراً آتنک واد بنانے سے لے کر پولیس کی اصلیت، سیاسی ہار جیت کے لئے فرقہ وارانہ فساد کرانے سے لے کر گنگا جمنی تہذیب کے بکھراؤ، دو قوموں کے اعتماد اور بھروسے کی پامالی کو کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے۔ غرض اس میں ہمیں ۶۷ برسوں کا ہندوستان نظر آتا ہے، ان برسوں میں جو ہندوستان میں ہوا یا ہو رہا ہے اس کو ذوقی نے اس ناول کے ذریعے دکھایا ہے وہ اس بارے میں کہتے ہیں:

''اس ناول کو لکھ رہا تھا، ۶۷ برسوں کا ہندوستان سامنے تھا۔
ہندوستان سیاست سامنے تھی اور میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ۲۵
کروڑ آبادی ہونے کے باوجود مسلمان سہما ہوا اقلیت کی طرح
رہنے پر مجبور ہے۔ سیاسی پارٹیوں نے اسے محض ووٹ بینک بنا
دیا ہے۔ ان ۶۷ برسوں میں مسلمانوں کا صرف استعمال اور
استحصال کیا گیا ہے۔۔۔لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں نے گہرائی
سے ایک ایک پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا۔''   ۹۰

ناول ''نالۂ شب گیر'' ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا ہے اس ناول میں ذوقی نے اکیسویں صدی کا دور دکھایا ہے۔ یہ انہی دنوں کا تذکرہ ہے جب دلی میں گینگ ریپ ہوا تھا۔ جب ہندوستان کی سرزمین پر سیاست

نے نئی کروٹ لی تھی۔ دلی کا انڈیا گیٹ جہاں ہزاروں لاکھوں کی بھیڑ ہوتی ہے اس بھیڑ نے اس جگہ کو انقلابی چوک میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ انقلاب کی وہ آہٹ تھی جو شاید اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں گئی۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا کے کئی حصوں میں اس طرح کے مظاہرے عام تھے۔ یہاں سیاست کو یہ فکر تھی کہ اگر لوگوں کا غصہ جاگ گیا تو تخت و تاج کا کیا ہوگا۔ اس تباہی اور بربادی کے بعد دلی میں لوگ خاموش تماشائی بن گئے تھے، لیکن اس ایک حادثے نے نہ صرف دلی والوں کو بلکہ پورے ہندوستان کو جگا دیا تھا۔ اس کے بارے میں ذوقی نے ایک انٹرویو میں بتایا ہے۔:

''یہ معاملہ جیوتی گینگ ریپ کا معاملہ تھا۔ ایک معصوم سی لڑکی جیوتی جس کو میڈیا نے ہزاروں نام دیئے تھے۔ یہ ایک کالج کی لڑکی تھی جو صبح سویرے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک خالی بس میں بیٹھی اور بس میں سوار پانچ لوگوں نے بے رحمی کے ساتھ بوائے فرینڈ کی موجودگی میں اسے اپنی ہوس کا شکار بنالیا اور چلتی بس سے دونوں کو باہر پھینک دیا۔'' ۹۱

حالانکہ ایسے معاملات پہلے بھی سامنے آئے تھے مگر اس معاملے نے دلی کو احتجاج اور انقلاب کا شہر بنا دیا ہے۔ اکیسویں صدی کی نئی دنیا میں قدم رکھنے کے باوجود آج تک جبلت اور درندگی کے واقعات میں کوئی کمی نہیں آئی نہ قدیم عہد میں کچھ تبدیل ہوا اور نہ اس انفارمیشن ٹکنالوجی اور سائنسی انقلاب میں، آج بھی وہی مرد ہے، جو عورت کو محکوم بنانے میں اپنی برتری جتاتا ہے۔ جس کی ڈور پہلے سے ہی مرد کے پاس ہے اور اسے اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں جس کا تذکرہ ذوقی نے ناول میں صوفیا مشتاق احمد اور ناہید ناز کے ذریعے کیا ہے۔

''لے سانس بھی آہستہ'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول ذوقی کا ایک اہم ناول ہے۔ جس میں انہوں نے آزادی کے بعد کے حالات کو قلم بند کیا ہے اس ناول میں ذوقی نے بلند شہر کے اس محلے میں دو تین بڑی بڑی حویلیاں اور کوٹھیاں تھیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کوٹھیوں اور ان میں رہنے والے لوگوں کی تقدیریں بدل گئی ہیں۔ اقتباس:

''بلند شہر میں دو تین بڑی بڑی حویلیں یا کوٹھیاں تھیں۔ وقت کے
ساتھ ان کوٹھیوں اور کوٹھیوں میں رہنے والوں کی تقدیروں کو
گرہن لگ چکا تھا۔۔۔۔۔آزادی کے ساتھ ہی بلند شہر کا ماحول
بھی بدل گیا تھا۔فرنگی ریسیڈینس خالی کر دئے گئے تھے۔اوپیرا،
کلب ہاوس بند تھے۔۔۔۔۔'' ۹۲

اس ناول میں ذوقی نے جیسے خود کو ''میں'' کردار کے ذریعے چھپا کے رکھا ہے اور ناول میں کئی مقام پر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ذوقی کہیں ناول کے پردے میں اپنی بچپن کی کہانی بتا رہا ہے۔اقتباس:

''ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ میں بھی بارہ سال کا ہو گیا تھا۔
تب میں نے پہلی بار کچھ لکھنے کی جرائت کی تھی۔''
'میں اور میرا ملک سہانا دونوں بارہ سال کے ہیں
میں اور میرا ملک سہانا دونوں ابھی تک بچے ہیں
دونوں ہیں ایک کھیل میں گُم دونوں کو ڈر لگتا ہے۔۔۔۔۔
میں اور میرا ملک سہانا دونوں بارہ سال کے ہیں۔'' ۹۳

ذوقی نے اس ناول میں یہ بھی دکھایا ہے کہ آزادی کے بعد جب ملک میں فساد ہوتا ہے تو پھر آڈوانی جی کی رتھ یاترائیں نفرت بھرا ماحول ملک میں پیدا کر رہی تھیں۔تو اسی نفرت بھرے دور میں نگار کا جنم ہوتا ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ ایسے ماحول میں تو نگار جیسی لڑکی تو ایب نارمل ہی ہوگی نہ وہ تو روتی ہوئی پیدا ہوتی ہے اور مسلسل روئے جا رہی ہے۔اقتباس:

''یہاں اسی بیمار ملک میں ایک بچی پیدا ہوئی تھی۔ جو اپنے جنم
سے مسلسل روئے جا رہی تھی۔'' ۹۴

اس کے علاوہ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ کشمیر کی عکاسی کی گئی ہے۔

''عقاب کی آنکھیں'' ذوقی کے شروعاتی ناولوں میں شامل ہیں۔انہوں نے محض ۱۷ سال کی عمر میں ایک انسانی جسم کے تعلق سے ایک کم سن بچے کی داستان قلم بند کی ہے۔ذوقی نے اس ناول کی ابتدا میں ہی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ:

''۱۹۷۹ء ----۔ یہ وہی سال تھا جب میں زندگی کی سترہ
بہاروں اور سترہ خزاؤں کا حساب لگا رہا تھا۔ اور یہ وہی سال تھا
جب میں نے سقراط کی یاد تازہ کرتے ہوئے اس ناول کو پائے
تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔----۔ سقراط نے کہا تھا کہ رح ایک
سنگیت کے مانند ہے اور بیماریوں کی وجہ سے جسم کے اجزاء ڈھیلے
ہو جاتے ہیں ----۔ رح اپنے سنگیت سے جسم میں دوبارہ جان
ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں ------۔ یہ وہ دور تھا جب میں
کانند ڈائیل، اگاتھا کرسٹی، رائیڈر ہیگرڈ، ڈیوما کو پڑھ چکا تھا۔
مجھے صرف کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور اس کے علاوہ مجھے کوئی
شوق نہیں تھا۔'' ۹۵

اس ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۷۹ء میں یہ دنیا اس قدر پھیلی نہیں تھی۔ جس قدر آج ہے۔ آج کی دنیا سوشل نیٹ ورکنگ کے سہارے کل سے یعنی ۱۹۷۹ء سے کافی آگے نکل گئی ہے اور ۱۹۷۹ء تک کی دنیا ایک محدود دنیا تھی۔ ذوقی نے اسی محدود دنیا کو ایک کم سن بچے کے ذریعے ناول میں جگہ جگہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا ذکر ذوقی ایک انٹرویو میں یوں کرتے ہیں کہ:

''عقاب کی آنکھیں'' میں بھی ایک بچہ ہے۔ جو اپنی معصوم
آنکھوں سے دنیا کے جبر اور استحصال کا جائزہ لے رہا ہے۔ پہلے
ناول سے ہی میں نے ایسے بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی
تھی۔ جنہیں سماج تو بچہ سمجھتا ہے لیکن وہ اپنی عمر سے بہت آگے
نکل چکے ہوتے ہیں۔'' ۹۶

ذوقی نے اس ناول میں اس دور کو دکھایا ہے کہ جب بہار میں دنگے اور فساد ہو رہے تھے اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مذہب کے نام پر لڑ رہے تھے۔ انہوں نے کستوریا کا بھی ذکر کیا ہے جہاں گورے لوگ رہتے ہیں۔ ذوقی کا ماننا ہے کہ یہ کستوریا کے لوگ بہت ہی ظالم ہے جو بے گناہ لوگوں کو مارتے ہیں۔:

''یہ کستوریا والے کتنے ظالم ہیں۔ آدمیوں کو مار کر کیا ملتا ہے

انہیں ۔۔۔۔۔۔ کیسے لگاتے ہیں گھروں میں آگ ۔۔۔۔۔۔۔
کیسے شوٹ کرتے ہیں ۔لگتا ہے ان لوگوں کے پاس انسانیت نام
کی کوئی چیز نہیں رہ گئی۔'' ۹۷

جو کچھ بھی کستوریا میں ہورہا ہے وہی ساری دنیا میں یعنی رنگ، ذات اور نسل کی لڑائی ہورہی ہے یہاں تک کہ اپنے ملک میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہے ہیں یہ سب وہی لوگ لڑ رہے ہیں جنہیں خدا پر اعتقاد ہے۔ حالانکہ سب کا خدا تو ایک ہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ ہر رنگ، نسل، ذات، قوم والوں نے اپنا الگ الگ خدا بنا لیا ہے اور سب الگ الگ طرز سے خدا کو پوجتے ہیں اور مذہب کو فساد کے نام پر استعمال کرتے ہیں۔ ذوقی اس بات کا ذکر ناول میں اس طرح کرتے ہیں:

''میرے خیال میں دنیا اتنی ترقی کر رہی ہے کہ اب اس لڑائی اور
دنگے کی دنیا سے ہٹ کر کسی مذہب کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔
مذہب کیا ضروری ہے۔ دنیا میں بھیجا گیا ہے تو عیش کرو۔ ایک
ساتھ جیو ۔۔۔۔۔۔ نہ چھوت چھات نہ فرق ۔۔۔۔۔۔ گورے،
کالے ہر مذہب وملت کے لوگوں کے ایک طرح کے نام ۔۔۔۔
کھانے پینے، جینے میں ایک طرح کے انداز ۔۔۔۔۔ کبھی
مارکس (Marx) نے یہی کہا تھا۔ کیا ضروری ہے ان چھوٹے
بڑے گھروں کی۔ یہ سارے چھوٹے بڑے گھر توڑ دیئے جائیں۔
ان گھروں نے چھوٹے اور بڑے کا فرق پیدا کیا ہے۔'' ۹۸

لیکن پھر ذوقی نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ مذہب ایک انسان کی ضرورت اور بنیاد ہوتی ہے، جس کی بنا پر زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ ہم مذہب سے زندگی کو الگ نہیں کر سکتے۔ مذہب ایک ترتیب اور تسلسل کا نام ہے جو دنیا میں آنے کے بعد ہم سیکھتے ہیں اور پھر اسی انداز کے مطابق اپنی زندگی کو گزارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دنیا کا ہر مذہب کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کا برا نہیں چاہتا حالانکہ انسان نے اپنے مفاد اور برتری کو قائم رکھنے کے لئے ہر دوسرے انسان کو کچلنا اپنا حق سمجھتا ہے، اسی لئے ہم ترقی کو چھوڑ کر

مذہب کے نام پر اب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔

ذوقی نے یہ ناول ۱۹۸۰ء کے آس پاس لکھا ہے۔اس میں ایک میڈکل کالج کا ذکر کیا ہے جو بہار کے ایک گاؤں مظفر پور میں ہے۔اسپتال آنے کے بعد ایک انسان کو عجیب سا لگتا ہے کیوں کہ وہ باہر کی دنیا سے بالکل کٹ کر رہ جاتا ہے اور اسپتال میں نظر آنے والا ہر شخص بیمار سا لگتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسپتال کی دنیا ایک الگ دنیا ہے جہاں پورا وارڈ ایک خاندان اور ہر بیڈ پر بیٹھا ہوا آدمی اس خاندان کا ایک فرد ہے۔ ذوقی اس اسپتال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ناول میں میڈیکل کالج اسپتال کا ذکر ہے، یہ اسپتال مظفر پور بہار میں ہے اس میں جا بجا لوہے کی بدنما سلیچی کا ذکر آیا ہے، یہ میری دادا ی اماں استعمال کرتی تھیں۔ دادی اماں کو یہی سلیچی استعمال کرنا پڑتی تھی۔۔۔۔۔'' ۹۹

''مرگ انبوہ'' مشرف عالم ذوقی کے اہم ناولوں میں سے ایک ہے۔یہ ناول حال ہی میں (۲۰۱۹) منظر عام پر آیا ہے۔اس میں ذوقی نے موجودہ دور کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔انہوں نے اس ناول میں نئے ہندوستان کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ذوقی نے اس ناول میں جس قوم کی عکاسی کی ہے وہ نئے ہندوستان میں سیاسی، سماجی، ثقافتی، اخلاقی، مذہبی اور اقتصادی تبدیلی سے گزر رہی ہے اس کے علاوہ انہوں نے ناول میں گائے کے نام پر تشدد اور موت کی ہولناکیوں کا ذکر، شہروں کے نام بدلنے کا قصہ، گاندھی کے قاتل گوڈسے کے نام پر مندر آباد کرنے اور اجتمائی عصمت دری کرنے والوں کے حق میں جلوس نکالنے کا ذکر کیا ہے۔

اس ناول میں ذوقی نے جہانگیر مرزا اور مرزا پاشا کے ذریعے جنریشن گیپ کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے اور قاری کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ جہانگیر مرزا کی عمر سے مرزا پاشا کی جنریشن کتنی آگے نکل گئی۔ فنٹاسی حقیقت بن گئی اور زندگی کے معنی بدل گئے، جنریشن گیپ کی وجہ سے ماں باپ سے ذہنی فاصلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ایک ہی چھت تلے رہنے کے باوجود یہ لوگ الگ الگ کہکشاں کے مسافر ہیں۔ذوقی نے مرزا پاشا کے ذریعے سماج کے دونوں پہلو یعنی نیکی اور بدی کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔آج کل کی نسل ''ینگستان'' کی نسل ہے، جو موت کو ایک کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔یہ نسل فیس بک، ٹوئیٹر، گوگل، ٹیکنالوجی، مادیت پرستی،

انٹرنیٹ اور بلیو وہیل کے جبڑوں میں پھنسی ہوئی ہے جو اپنے ماضی، اپنی تہذیب اور اپنے خدا کو بھول گئی ہے اور ان سب کو یہ نوجوان نسل پرانے قصوں کے علاوہ کچھ اور نہیں سمجھتی۔ یہ نسل ایک ایسا برانڈ بنتی تہذیب یا دنیا کے دروازے پر کھڑی ہے جہاں نئی پرانی، انٹرنیشنل، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سکے چل رہے ہیں۔ یہاں نوجوانوں کے لئے الگ سے مال بنائے جا رہے ہیں، یہاں بچے ایک پروڈکٹ ہیں۔

۵.۵۔زبان و بیان

زبان و بیان کی اہمیت کسی بھی ناول میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ناول نگار زبان کا انتخاب اپنی کہانی کی مناسبت سے طے کرتا ہے۔ ناول کا پس منظر گاؤں ،شہر،جس طبقے ، معاشرے اور مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے متعلق ہر معلومات مصنف کو ہونا ضروری ہے تب ہی وہ زبان حقیقت سے قریب ہوگی۔ ناول نگار کو زبان اور اظہارِ بیان پر پوری طرح قدرت حاصل ہونی چاہئے۔

جہاں تک مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں زبان و بیان کا تعلق ہے،تو انہوں نے لفظوں کو برتنے سے زیادہ کہانی کو برتنے میں اپنی محنت صرف کی ہے اور اپنے بیانیہ لہجے کے اظہار کا ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ پڑھنے والا ان تمام کیفیات کی تہوں تک پہنچ جائے جن پر وہ خاص توجہ دینا چاہتے ہیں اور یہی کہانی نویسی کا خیال ہے۔اس باب میں ہم زبان و بیان کے حوالے سے ذوقی کے ناولوں کا جائزہ لیں گے۔

’’نیلام گھر‘‘ ناول کی زبان رواں دواں ، سادہ ، برجستہ اور برمحل ہے۔زبان و بیان کے ساتھ مخصوص معاشرے اور الفاظ کی جھلکیاں ناول میں موجود ہیں۔مثلاً بدبو،عذاب ،سفر، دہشت وغیرہ جس سے مزید ادبی چاشنی پیدا ہوگئی ہے۔

مشرف عالم ذوقی اس عہد کے معاشرے میں پائے جانے والے مختلف طبقے کی زبان سے پوری طرح واقف ہیں، انہیں زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔اس ناول میں ناول نگار نے استعاراتی زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔:

> ’بدمست ابابیلوں نے سارے آسمان کو ڈھک لیا اور جو پایا تو
> خواب منظر تھے۔مصنوعیت کی حسین جنت نگاہوں کو خیرہ کر رہی
> تھی پھر تسبیحیں میلی ہوتی چلی گئیں اور کارنس پر ٹنگی ٹنگی اپنا آپ
> کھوتی رہیں ،قرآن شریف طاق پر رکھ دیئے گئے۔ باقی بچے
> کلینڈر جو دیواروں پر اب بھی آویزاں تھے۔بس یہی کچھ تھا جو
> چیخ چیخ کر ان کا رشتہ مذہب سے جوڑ دیا تھا۔‘‘ ۱۰۰؂

مشرف عالم ذوقی کی ناول ''نیلام گھر'' میں ہندی اور بھوجپوری زبان کے الفاظ اور محاورے بھی ملتے ہیں جن کا برمحل اور بامقصد استعمال کیا گیا ہے۔

بھوجپوری زبان:۔

''مسز بھٹناگر نے سمجھداری انداز میں سر ہلایا۔۔۔مس نیلی
کے قریب گئیں۔۔۔۔۔اور اپنے خالص بھوجپوری لہجے میں
ساتھیوں سے بولیں۔۔۔۔۔بھیّا۔۔۔جرا سانس تو لینے
دو۔۔۔۔۔دیکھت نئ کھے۔۔۔۔۔بچر یا کیسن گرموا میں
مرل جائے ہے پنکھو بند ہے ۔۔۔۔ ہٹو ۔۔۔۔۔ ہٹو
۔۔۔۔۔'' [۱۰۱]

اس ناول میں قرآن پاک کی آیات کے حوالے اردو ترجمہ کی شکل میں مناسب مقامات پر دئے گئے ہیں اور ان سے بڑا کام لیا گیا ہے۔

۱۔حضرت نوحؑ کے زمانے میں ایسا ہی فتنہ اور فساد برپا ہوا۔

۲۔نوحؑ نے سمجھایا مگر لوگ مخالفت پر اتر آئے۔۔۔۔زہریلے بیج بوتے رہے۔فتنہ بیان کرتے رہے کہ یہ وہی تھے۔

۳۔ وہی جو عوام پر حکومت کرنے والے تھے جو خودسر تھے جنہیں اپنی حاکمانہ سیاست کے ختم ہو جانے کا خدشہ تھا۔۔۔۔۔۔تو زوروں کی بدبو پھیلی اور ان کی چیخیں آسمانی پرندوں میں سما گئیں۔

۴۔کہ اے نوحؑ !اگر تم واقعی سچے ہو تو ہم پر عذاب لاؤ۔۔۔۔۔۔جس سے تم ڈرایا کرتے ہو۔۔۔۔۔

۵۔اور پھر حضرت ابراہیمؑ ،شعیبؑ ،موسیٰ ،اور آن حضرت تک غرض کہ ایک لمبی کہانی ہے۔۔۔۔۔نمرود کی سلطنت تباہ و برباد ہوئی ،لوط کی قوم پر پتھر کی آندھی نازل ہوئی وغیرہ۔

جہاں تک اس ناول میں کردار نگاری کی زبان کا تعلق ہے تو اس میں کردار کی زبان بہت ہی سیدھی سادی اور عام فہم ہے اور قاری کو پڑھنے سے کوئی اکتاہٹ نہیں ہوتی اور نہ قاری کو بار بار لغت کا سہارا لینا پڑتا ہے اس ناول کی زبان آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔

ناول ''ذبح'' میں مشرف عالم ذوقی نے بہت ہی سیدھی سادی زبان کا استعمال کیا ہے جس کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، اس میں روزمرہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے یوں تو ہمیں دیہاتی زبان پریم چند کے یہاں ملتی ہے، مگر اس کی مثالیں مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں بھی مل جاتی ہیں۔ ذوقی نے بڑے ہی بہترین انداز میں نچلے طبقے کے لوگوں کی زبان کو پیش کیا بالکل ویسے ہی جیسے نچلے طبقے کے لوگوں کی زبان ہوتی ہے، اس میں انگریزی الفاظ بھی خال خال ہیں۔ اس عام فہم اور آسان زبان کو عبدل کے ذریعے پیش کیا ہے۔:

''سن رہے ہو، دلی چلتے ہیں، دلی میں اب بھی سقوں کا پیشہ مرا نہیں، کوئی کہہ رہا تھا جامع مسجد، مینا بازار، چاندنی چوک، نظام الدین اولیاء کے مزار پر، مشک لئے سقے گھومتے رہتے ہیں، داتا کی چوکھٹ دھلوا لا ثواب ملے گا۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں داتا کی چوکھٹ۔۔۔۔عقیدت مند، دوسرے ملکوں سے آئے سیاح، غیر ملکوں سے آنے والے اچھے خاصے دام دے جاتے ہیں، سن رہے ہو، ادھر ایک مشک خالی ہوا ادھر عقیدت مند گاہک پھر تیار ہم مشک والے دوسرے دھندوں میں جائیں تو لوگ ٹکنے نہیں دیتے، چلو دلی چلتے ہیں، مگر آواز لڑکھڑا گئی، دلی تو دور ہے بہت دور۔۔۔۔۔'' ۱۰۲

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں جس اقلیتی اور غریب طبقے کی عکاسی کی ہے، ان کرداروں کی زبان کے حوالے سے وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ جہاں انہوں نے مشتری کے ذریعے ایک ان پڑھ عورت کی زبان کو پیش کیا ہے:

''پلنگڑی پر لیٹی ہوئی مشتری کا ٹیپ چالو ہوتا ہے۔
'اشرفوا رے اشرفوا، سالا لفنگا۔'' ۱۰۳

مشرف عالم ذوقی نے جہاں غریب طبقے کے کرداروں کی زبان کو فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے وہیں انہوں نے اعلیٰ طبقے (یعنی رشید چودھری) کی زبان کی بھی عکاسی کی ہے رشید چودھری کا خاندان پڑھا لکھا تھا۔

اس وجہ سے ان کی زبان قدرے بہتر ہے۔

''میں اس چودھری خاندان کے وارثوں میں سے ہوں، جہاں
عبدل نے غلامی کے دن گزارے ہیں۔ جب سے آنکھیں کھلی
ہیں تب سے اس ڈیل ڈول والے عبدل مشک والے کو دیکھ رہا
ہوں۔ بچپن میں میری آنکھوں کے لئے یہ منظر تھوڑا عجیب سے
ہوتا۔ پہلوان جیسا ایک آدمی کمرے سے چمڑے کا مشک
باندھے، مشک کے منہ کو ہاتھوں سے پکڑے پانی اچھالتا چلا آرہا
ہے۔۔۔۔۔گھڑے بھرے جا رہے ہیں ۔۔۔۔کبھی ٹب بھر رہا
ہے۔۔۔۔۔چمڑے کا مشک مجھے بکرے کے جسم کی طرح لگتا ہے،
جس سے عبدل نے اپنے جسم میں باندھ رکھا ہو۔'' ۱۰۴

مشرف عالم ذوقی نے کہیں کہیں انگریزی لفظوں کا استعمال کیا ہے۔۔مثلاً ایک جگہ لکھا ہے۔

''اصلی مسلمان یہاں کوئی نہیں ہے؟''
یہاں سب Converted ہیں۔کنورٹیڈ۔'' ۱۰۵

اسی طرح دوسری جگہ لکھا ہے کہ

''دوسری بڑی اکثریت۔(Second Majority)'' ۱۰۶

ناول ''بیان'' میں بھی سادگی، سلاست اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ذوقی نے اس ناول میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔ انہیں دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ ناول کی کہانی چونکہ دوقوموں یعنی ہندو مسلم کرداروں کے اردگرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس لئے ناول میں دونوں زبانوں کے بولنے والے ملیں گے، بھاجپائیوں کے جلوس، میٹنگوں میں ہونے والی گفتگو میں ہندی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔

ناول میں نریندر ہندی زبان کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اقتباس:

''نریندر بولا پارٹی نیتاؤں نے یدی ہماری الوچنا کی ہے تو کون
سا غلط کیا ہے۔۔۔۔۔ہم اپنے چھیتر میں پارٹی مضبوط بھی کرنا

چاہتے ہیں اوراب تک ہماری کوئی بھی راجنیتک چال سپھل نہیں

رہی۔''   ۱۰۷

ناول کی زبان صاف اور رواں ہے، اس میں صنائع کا استعمال کیا گیا ہے۔جس کی وجہ سے ناول میں ڈرامائی حسن پیدا ہوگیا ہے۔اس ناول کی زبان کو پرکشش بنانے کے لئے ناول نگار نے تمثیلوں اور استعاروں کا استعمال کیا ہے۔جو ناول کوایک حسن بخشتا ہے۔:

''تہذیب کسی بندوق کی گولی کی طرح پیدا ہوتے ہی جسم میں

داغ دی جاتی تھی ۔''

''لوگوں کے چہروں پر حیرت اگتی تھی، ہر دن کے اخبار میں

حیرت اُگتی تھی''   ۱۰۸

ذوقی نے ناول میں اردو زبان کی عکاسی چودھری برکت حسین کے ذریعے کی جس کو لگتا ہے اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔:

''بالمکند شرما جوش میاں ۔۔۔۔۔تم سچ کہتے ہو۔۔۔۔ہم اردو

بولتے ہیں۔اس لئے ہم اس ملک کے تیسرے درجے کے شہری

ہیں انہیں حق حاصل ہے کہ ہمیں خوف زدہ کرکے ہمارے گھر کی

تلاشی لے سکتے ہیں۔قانون قاعدے اب ہمارے لئے نہیں

رہے جوش میاں ۔۔۔۔لگتا ہے ۔۔۔۔۔ دھیرے دھیرے

مسلمانوں کے لئے ملک کی تہذیب اور سکیولر تہذیب کے طور

طریقے سب اُٹھتے جارہے ہیں۔۔۔۔۔۔''   ۱۰۹

اس ناول میں کہیں کہیں انگریزی لفظوں کا بھی استعمال کیا ہے۔مثلاً

''نریندر کی آواز اور سخت ہوگئی ۔۔۔۔۔ وہ جانے کو مڑا

۔۔۔۔۔۔جب کہ سچائی یہ ہے کہ آپ کو بھی غور کرنا چاہئے۔یہ

طے ہے کہ اب ہماری پارٹی آئے گی اور آپ کے لئے بھی

ضروری ہے کہ آپ اس کے لئے کچھ Softcorner پیدا کر

دے۔۔۔۔ اگر چاہتے ہیں کہ مسلمان یہاں امن سے رہے

۔۔۔۔۔‘‘ [۱۱۰]

ناول ’’شہر چپ ہے‘‘ زبان و بیان کے لحاظ سے ایک اہم ناول ہے اس ناول کی زبان سیدھی سادی ہے۔ ناول کا ہر کردار سیدھی سادی اور روزمرہ کی زبان استعمال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ناول کی زبان قاری کے لئے عام فہم ہے۔

ذوقی نے اس ناول میں رگھو بیر کی عکاسی اس طرح کی ہے وہ غریب طبقے سے وابستہ تھا۔ ماں کے انتقال کے بعد وہ کہتا ہے:

’’اب اس گھر سے ۔۔۔۔۔شہر سے ۔۔۔۔۔ میری طبیعت
اچاٹ ہوگئی ہیں، میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ میں یہ گھر چھوڑ دوں گا
۔۔۔۔۔ یہ شہر چھوڑ ڈوں گا۔۔۔۔۔ اس تنہا کمرے کے دو بستر
مجھے جینے نہیں دیں گے۔۔۔۔۔‘‘ [۱۱۱]

عام فہم زبان کو خوبصورت انداز میں رگھو بیر کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اقتباس:

’’جان سے پیارے دوست انیل!
یاد ہوگا تم سے بچھڑے وقت میں نے کہا تھا ایک بار زندگی میں کم
از کم ملاقات ضرور ہوگی۔ مگر ملاقات اس قدر جلد ہوگی مجھے اس
کی اُمید نہ تھی۔ مگر میں اس خوبصورت موقع کی تلاش میں تھا جب
خود کو اچانک تمہارے سامنے لاکر سرپرائز دیتا۔ شاید اب وہ
موقع مل گیا ہے۔ تمہارے ہی شہر میں (جو کبھی اپنا بھی تھا) میں
ایک ضروری کانفرنس اٹینڈ کرنے آرہا ہوں۔ جہاں مجھے اپنی
تازہ کتاب کے بارے میں تقریر کرنی ہے۔ اس پروگرام کے
سب سے اہم مہمان تم ہوگے۔ میں تمہارے اندر آج سے آٹھ
سال پہلے والے انیل کا عکس تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ اس درمیان
اگر تمہاری شادی ہوگئی ہو، بچے ہوگئے ہوں ۔۔۔۔۔ تو انہیں

بھی لانا۔۔۔۔۔تاکہ گزرے ہوئے آٹھ سالوں کے فیصلے کو کم

کیا جاسکے۔آؤ گے نا۔۔۔۔۔'' ۱۲؎

''شہر چپ ہے'' میں زبان کی بے تکلفی، طرز ادا کی بے ساختگی کی وجہ سے واقعات کو پیش کرنے کا انداز بے حد موثر ہے۔مشرف عالم ذوقی کو کہانی کہنے کے فن میں مہارت حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں ہر واقعہ دوسرے واقعے کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

اس ناول کی زبان میں شیرینی ہے اور حالات کی تلخی بھی، ذوقی اس ناول میں کرداروں کے ذریعے ہمارے معاشرے یا سماج کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ناول ''مسلمان'' کی زبان سادہ اور پر اثر ہے۔عام فہم زبان ہونے کے باوجود واقعات اپنا اثر نہیں کھوتے ہیں۔اس میں ذوقی نے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم، فرقہ وارانہ فساد کو کرداروں کے ذریعے دکھایا ہے۔اقتباس:

''فرقہ وارانہ آندھیوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔مندر

مسجد کے ہنگامے نے وطن پرستی کے پاک جذبے کا غلا گھونٹ دیا

تھا۔ اب انسان کہاں باقی ہے۔ باقی تھے۔ ہندو یا

مسلمان۔۔۔۔۔یا فرقہ واریت کا ترشول۔۔۔۔۔نفرت کی

تیز آندھی اُٹھی تھی اور۔۔۔۔۔۔۔یہ آندھی رہ رہ کر تیز ہو جاتی

اور پورا ملک گرد و غبار میں ڈوب جاتا'' ۱۳؎

زبان صاف ہونے کے ساتھ ساتھ ناول میں عام بول چال کی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔جب ملک میں یہ اعلان ہوتا ہے کہ کسی پر زور زبردستی نہیں ہے جو بھی اپنی مرضی سے پاکستان جانا چاہتے ہیں وہ جا سکتے ہیں۔اس اعلان کو ناول نگار نے اس طرح پیش کیا ہے:

''اس اعلان کا پاکستان جانے والے مسلمانوں نے خیر مقدم کیا

۔۔۔۔۔یا ان مسلمانوں نے، جو اپنے سامنے اپنے گھر بار اور

اسباب کی تباہی دیکھ چکے تھے جن کا دل ہندوستان سے بھر گیا تھا

اوراب وہ پاکستان میں اپنی نئی دنیا بسا کر نئی زندگی شروع کرنے

کا خواب دیکھ رہے تھے۔'' ۱۱۴

ناول میں گوہر بائی ایک اہم کردار ہے جو ایک طوائف ہے اور ناول میں ایک جگہ الطاف حسین کو کہتی ہے:

''تم۔۔۔۔۔نے کیا دیا ہے الطاف حسین۔۔۔۔۔مجھے؟ ملک

اور قوم کی بات کرتے ہو تم۔۔۔۔۔کیا دیا ہے تم نے اس ملک کو

۔۔۔۔۔۔قوم کو ۔۔۔۔۔ اور دے ہی کیا سکتے ہو تم

۔۔۔۔۔۔۔تم مسلمان۔۔۔۔۔؟'' ۱۱۵

نواب الطاف حسین جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناول میں اس طبقے کی نمائندگی کیلئے مندرجہ ذیل زبان کا سہارا لیا گیا ہے:

''یہ عزت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے گوہر جان۔۔۔۔۔عزت

کا خیال نہ ہوتا تو کب کا تمہیں تسلیم کر چکا ہوتا اور تمہیں یہ دن

دیکھنے نہ پڑتے۔'' ۱۱۶

ان کرداروں کے علاوہ ناول میں ایک اور کردار بائی اماں کا ہے۔ ان کا کردار ناول میں عقیدت مند عورت کے ساتھ ساتھ مذہب پرست نظر آتا ہے۔ نیوسٹی ایریا میں جب حالات خراب ہوتے ہیں تو وہ خوف زدہ آنکھوں سے افروز کی اور دیکھتی ہے اور پھر لڑکھڑاتی آواز میں بولتی ہے۔

''دیکھتی کیا ہو۔۔۔۔۔۔۔قرآن پاک نکالو۔۔۔۔۔۔سورہ

یاسین کی تلاوت کرو۔ اللہ پاک ہر بری بلا سے محفوظ رکھے

۔۔۔۔۔۔آمین۔'' ۱۱۷

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' ایک انوکھا ناول ہے۔ جیسی تیزی ان کے فن اور مزاج میں ہے ویسی ہی تیزی ان کی زبان و بیان میں ہے۔ عام بول چال کی زبان کو انہوں نے بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے استعمال کیا ہے۔

ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔مشرف عالم ذوقی اپنی زبان و بیان اور اسلوب کی وجہ سے اردو ناول نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔زبان و بیان پر ان کی پکڑ مضبوط ہے۔اسی لئے انہوں نے اتنے نازک موضوع کو اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس ناول کا ایک کردار منتری جی ہے۔حالانکہ منتری جی کی زبان پڑھے لکھے آدمی کی طرح ہونی چاہئے۔لیکن ناول میں جیسے ان کا کردار ایک ان پڑھ کی طرح ہے۔وہ جب سنیل کمار رائے سے ملتے ہیں تو اپنی زبان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

''منتری جی ہنسے۔۔۔۔میں نے ڈانٹ لگائی سالے کو۔جہاں
سمجھنا چاہئے وہاں للو بن جاتا ہے۔للو۔آپ سمجھ رہے ہیں
نا۔۔۔ایکدم للو۔لیکن آپ سمجھا رہے تھے۔۔۔'' ۱۱۸

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں برمحل انگریزی لفظوں کا استعمال کیا ہے۔کیونکہ ناول میں جگہ جگہ انگریزی الفاظ ملتے ہیں۔مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جس کے پاس بس پرانی باتیں تھیں۔۔۔۔۔۔۔پرانی
باتیں،جس کے ساتھ وہ اپنے نئے زمانے کو Adjust نہیں کر
پاتے تھے۔'' ۱۱۹

اسی طرح دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

''ایک طرف تشدد کے واقعات کو Justify کرنے کی کوشش
کی جارہی ہے۔'' ۱۲۰

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

''اوہ۔۔۔۔انٹرسٹنگ ''نیتن چیخا۔ I am
proud of you Dad اتنا کام تو وہ جج
بھی نہیں کرتے ہوں گے جو کسی بھی ملزم کو پھانسی یا عمر قید کی سزہ
سناتے ہیں۔'' ۱۲۱

’’پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی‘‘ مشرف عالم ذوقی کا ایک اہم ناول ہے۔ یہ ناول زبان و بیان کے لحاظ سے اہم ہے۔ ذوقی کی تحریروں میں متاثر کرنے کا جادو ایسا ہے کہ قاری پڑھتے وقت انھیں کی بنائی ہوئی دنیا میں جینے لگتا ہے۔ اچھا ادب تخلیق کرنے کے لئے لفظوں کے ذخیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ذوقی کے یہاں موجود ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں خوبصورت جملے اور نئے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے لب ولہجہ کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے جملے اور ہندوستانی زبان کا استعمال کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے باقی ناولوں کی طرح اس ناول میں زبان کی سادگی، صفائی، شگفتگی، بے ساختگی، شائستگی، تازگی، شیفتگی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ روانی بھی نظر آتی ہے۔ ان کے ناولوں میں پیچیدگی اور مشکل پسندی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ انہوں نے علامتوں اور استعاروں کا استعمال بھی کیا ہے۔

اس میں بھی ان کے دوسرے ناولوں کی طرح کہیں کہیں انگریزی الفاظ بھی نظر آجاتے ہیں مثلاً

’’عرصہ ہو آرتھر کلارک کی ایک کہانی پڑھی تھی دفارگوٹن

اینمی (The Forgotten Enemy)

۔۔۔۔۔انسان برف کے زمانے میں داخل ہوگیا ہے۔‘‘ ۱۲۲

مشرف عالم ذوقی کو زبان و بیان پر بھر پور قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی داخلی اور خارجی کیفیتوں کا اظہار موثر زبان میں کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ٹھیک اسی طبقے سے ان کی زبان بھی مماثلت رکھتی ہے۔ مثلاً اگر کردار متوسط طبقے سے ہیں تو ان کی زبان اسی انداز کی ہے اور اگر کردار اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو ان کے لئے زبان بھی اعلیٰ استعمال کی گئی ہے۔ یعنی جس معاشرے میں مشرف عالم ذوقی اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہیں بالکل اسی معاشرے کی زبان ان کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

ذوقی کا ناول ’’آتش رفتہ کا سراغ‘‘ زبان و بیان کے لحاظ سے کافی اہم ہے۔ ان کی زبان اس ناول کی روح ہے۔ انہوں نے اس ناول میں سادہ اور سلیس کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زبان کا استعمال کیا ہے۔

اس ناول میں جہاں اردو زبان کا استعمال کیا گیا ہے وہیں ہندی زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔

''۱۹۲۵ء میں سنگھ کی بنیاد ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ہیڈ گیوار نے کہا تھا

۔۔۔۔۔ ہندو سماج کو ایکتا اور سنگٹھن سوتر میں باندھنا ہی راشٹر

یہ کاریہ ہے۔ کیونکہ کیول ہندوتو ہی ہندوستان کی آتما ہے۔ ستیہ

ہے۔۔۔۔۔ اور ہندوتو کے اتھان کے لئے کیا جانے والا کوئی

بھی کاریہ راشٹریہ کاریہ ہے۔۔۔۔۔۔ اور اس طرح ہم تم سب

اس راشٹریہ کاریہ میں سہیوگ دے رہے ہیں۔ بس آنکھیں کھلی

رکھو۔ لوگوں کی نظر میں مت آؤ۔۔۔۔۔ خاموشی سے راشٹریہ کو

آگے بڑھاؤ۔'' ۱۲۳

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں کہیں کہیں انگریزی لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً ناول میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''پوری دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس کے پیچھے مسلمان ہی

ہیں۔ وہ چیختا ہوا اب بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ ہر

مسلمان میں ایک Terrorist دیکھتے ہیں یہ لوگ۔'' ۱۲۴

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

''تھاپڑ نے فون بند کر دیا۔ غصہ سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ یہ

سارے Paid چینل ہیں۔ Paid نیوز کے سہارے اپنے چینل

کے لئے کروڑوں، اربوں کا کاروبار کرنے والے۔'' ۱۲۵

اور ایک مثال دیکھیں:

''سارے فساد کی جڑ یہی مذہب ہے۔۔۔۔۔ وہ سچ مچ

Confused ہے اور الجھا ہوا۔۔۔۔۔'' ۱۲۶

مشرف عالم ذوقی نے اپنے ناولوں میں کرداروں کی شخصیت کے عین مطابق مکالمے تحریر کئے ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار زیادہ تر ہندو اور مسلم مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے لئے انہوں نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں کا استعمال کیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا انداز بیان کافی دلچسپ اور دلکش ہے۔

وہ قاری کو زبان کی بھول بھلیوں میں نہیں بھٹکاتے بلکہ ناول کے اختتام تک سیدھے سیدھے سفر کرواتے ہیں۔
ان کے ناولوں میں تخلیقی زبان کے استعمال سے واقعات میں ربط وتسلسل پیدا ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے ناول بغیر کسی الجھن کے مکمل ہوجاتے ہیں۔ان کا اسلوب منفرد ہے۔ان کے ناولوں میں زبان و بیان کے ذریعہ داستانوی رنگ ابھرتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' زبان و بیان کے لحاظ سے اہم ہے۔اس ناول کی زبان سادہ اور پرکشش ہونے کے ساتھ اس میں ایک ایسا طنز ہے جو ہمارے ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور مکالمے حالات کی ستم ظریفیوں کو بے نقاب کردیتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں علامتوں کے ساتھ ساتھ کنایہ اور تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔:

''میں ایک بار پھر ماضی کے دریچوں سے آتی ہوئی ہوا کے
تھپیڑوں کو آواز دے رہا تھا۔۔۔۔۔ اور وہی یادوں کی
خوفناک ٹرین، تیز آواز کے ساتھ ماضی کی پٹری پر رینگ رہی
تھی۔کچھ دھماکے سنائی دے رہے تھے۔۔۔۔۔'' ۱۲۷

مشرف عالم ذوقی کو علاقائی بولیوں پر قدرت حاصل ہے۔انہوں نے اس ناول میں کرداروں کے ذریعے علاقائی زبان اور علاقائی گیتوں اور کہاوتوں کو بھی اپنے زبان و بیان کا حصہ بنایا ہے۔مثلاً

''مئین بدلا لینے کے فراق میں ہیں،
'کل سارا دن مئین گھپ چپ میٹنگ کرتے رہے۔۔۔'
'حملہ کرنے کا پروگرام ہے۔۔۔۔'
'رات کے وقت سونا نہیں ہوگا۔۔۔۔'
'مئین اسلحے جمع کر رہے ہیں'
'اب سالوکو پاکستان کھونا پڑنا ہی ہوگا۔۔۔۔'' ۱۲۸

ذوقی نے اس ناول کی زبان کو خوبصورت اور دلکش بنانے کے لئے محاوروں کا استعمال کیا ہے۔ان کے محاورے بولیوں میں اس طرح مل جاتے ہیں کہ زبان کا حسن اور بڑھ جاتا ہے۔محاروں کے علاوہ اس میں

ہندی کے عام بول چال کے الفاظ ملتے ہیں۔ مثلاً: انت، اندھ وشواس، بھوت پریت اور آنکھ مٹکا وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ناول کی زبان میں مل کر اس کی خوبصورتی کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ اس ناول میں انگریزی جملوں کا جا بجا استعمال بھی کیا ہے:۔

''جہاں بے حد ہوش مندی کے ساتھ اسے بتایا جاتا ہے کہ

Man is a social

animal انسان ایک سماجی جانور ہے۔'' ۱۲۹

ناول ''عقاب کی آنکھیں'' کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ انہوں نے اس ناول میں عام بول چال اور روزمرہ کی زبان کا استعمال کیا ہے۔ ذوقی نے اس میں زبان کا انتخاب اپنی کہانی کی مناسبت سے طے کیا ہے۔ ناول کا پس منظر جس گاؤں، شہر، جس طبقے، معاشرے اور مذہب سے تعلق رکھتا ہے، ان کی زبان کو اسی طریقے سے پیش کیا ہے۔ مصنف کی معلومات ان تمام چیزوں سے ہونی چاہئے تبھی وہ زبان حقیقت سے قریب ہوگی اور ناول نگار کو زبان اور اظہار بیان پر پوری طرح قدرت بھی ہونی چاہئے۔

ذوقی کو انگریزی زبان سے خاص لگاؤ اور مناسبت ہے۔

ماسٹر جی کہتے ہیں پانی میں لاتعداد پلو (کیڑے) ہیں

------ جنہیں Bacteria کہتے

ہیں۔'' ۱۳۰

ذوقی کے ناولوں میں ہمیں زبان و بیان کے علاوہ منظر نگاری کے کامیاب نمونے ملتے ہیں انہوں نے جس کسی بھی منظر کی تصویر کشی ناول میں کی ہے تو وہ سارا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے اپنی اصل شکل میں آ جاتا ہے اور قاری کو ایسا لگتا ہے کہ وہ خود اس منظر پر موجود ہیں۔ اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ذوقی کی زبان و بیان کا اثر ہے جس کے ذریعے وہ کسی بھی منظر کی ایسے دلکش پیرائے میں تصویر کشی کرتے ہیں کہ وہ ہمارا دامن دل کھینچتی ہے۔ ان کے ابتدائی ناولوں میں بھی اس طرح کے مناظر بآسانی مل جاتے ہیں۔

اس ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور اس کا انداز بیان عمدہ اور موثر ہے جس سے ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قاری ناول میں شروع سے آخر تک بندھا رہتا ہے جو کہ ایک کامیاب ناول کی نشانی ہے۔

''نالۂ شب گیر'' زبان و بیان کے لحاظ سے اہم ہے۔اس ناول کی زبان سیدھی سادی، صاف اور سلیس ہے۔ ذوقی نے اس میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہےاور قاری کوکسی بھی جگہ اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی اور نہ ہی گراں گذرتا ہے۔ اس ناول کا آغاز بڑے ہی عام فہم اور سہل انداز میں ہوتا ہے اور واقعات کاتسلسل قاری کواپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ قاری کے ذہن تک باآسانی رسائی پانے میں کامیاب ہیں۔اس ناول میں پیچیدگی اور مشکل پسندی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی ہے۔ ذوقی کو زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہےانہوں نے اس ناول میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔ وہ ناول میں اپنے کرداروں کی داخلی اور خارجی کیفیتوں کا اظہار موثر زبان میں کرتے ہیں۔

''مرگ انبوہ'' اس ناول میں ادبی زبان کا خاص خیال رکھا ہے۔ یہ نئی نسل کی زبان ہے جسے سوشل نیٹورکنگ تک رسائی حاصل ہے۔ زبان و بیان میں مصنف کے تجربات، مشاہدات، جذبات اور کیفیتوں کا عکس نمایاں طور پر قاری کے سامنے آتا ہے۔ ذوقی نے یہ ناول ایک واضح مقصد کے تحت لکھا ہے۔ ان کے جذبے اور مشاہدے اس ناول کی زبان و بیان سے مل کر ایک نیا تاثر پیدا کرتے ہیں۔انہوں نے اس ناول میں استعاروں اور علامتوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے متعدد الفاظ کا استعمال کیا ہے مثلاً ناول میں ایک جگہ جب جہانگیر پاشا مرزا پاشا سے کہتے ہیں:

''تم میرے لئے ایک Complicated Child
تھے۔ساتھ ہی ساتھ introvert بھی تھے۔''   ۱۳۱

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''میرے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔لیکن ویریور ایٹی
چیوڈ (wear your attitude) والا لہجہ
دادا کو ہضم نہیں ہوتا تھااور پوتے کے we are
like this only یعنی ہم تو ایسے ہی ہیں جیسے
ریمارک پران کا تنک چڑھاپن اور بھی بڑھ جاتا تھا۔''   ۱۳۲

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کی زبان و بیان سادہ، صاف، سلیس اور عام فہم ہے انہوں نے اپنی

ناولوں میں کرداروں کے سماجی، سیاسی اور مذہبی سیاق میں زبان کا استعمال کیا ہے۔ وہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اپنی زبان و بیان کا انتخاب کرتے ہیں اور کرداروں کی نفسیات میں گہرائی تک اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ نہایت ہی صاف، سادہ، سلیس اور رواں دکھائی دیتا ہے۔

ذوقی کے تقریباً تمام ناولوں میں سیدھی سادی زندگی کی کہانیاں سیدھے سادے انداز بیان میں بیان کی گئی ہیں۔ ان واقعات کی ترتیب و تنظیم کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان کے تقریباً تمام پلاٹ سیدھے سادے اور منظّم و مربوط ہیں۔ ان میں کہیں بھی ہمیں جھول کا احساس تک نہیں ہوتا اور کہانی شروع سے آخر تک ایک بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے قاری کے دل و دماغ پر دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ انھوں نے تشبیہات، استعارات، ترکیبات، علامت کے علاوہ محاورات کا موقع و محل کی مناسبت سے اپنے انداز بیان میں استعمال کر کے اسے خوبصورت اور دلکش بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کے زبان و بیان میں مزید تازگی، شگفتگی، چاشنی، اثر انگیزی، بے ساختگی وغیرہ پیدا ہوگئی ہے۔

۵.۶۔عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ

ناول میں زندگی کی عکاسی ہوتی ہے لیکن اس سلسلے میں ہر ناول نگار کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ناول میں ایک ناول نگار اپنی کہانی کو کئی طرح سے بیان کرتا ہے۔کبھی کبھی ناول نگار خود کہانی کو بیان کرتا ہے اور کبھی کبھی وہ کسی کردار کے ذریعے اپنی کہانی سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر ادیب کا اپنا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔مشرف عالم ذوقی کا بھی اپنا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔اس باب میں ہم دیکھیں گے کہ ذوقی اپنے ناولوں میں ''عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ'' استوار کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں:

ا۔''آتش رفتہ کا سراغ''

ناول کا عنوان بہت سوچ سمجھ کر رکھا گیا ہے۔کیونکہ ذوقی نے ناول کا عنوان اقبال کی غزل کے ایک شعر سے لیا ہے۔

''میں کہ،مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو''

(علامہ اقبال)

یہ ناول اس عالمی سیاست کے نام ہے جہاں پر مسلمان خوف کی زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔اسے ایک استعارہ مانا جاسکتا ہے۔کیونکہ اس ناول میں ہندوستانی مسلمانوں کے استحصال کی درد بھری کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔جس میں ہندوستانی مسلمان لاچار اور بے بس نظر آتے ہیں۔

''آتش رفتہ کا سراغ'' کی کہانی آزادی کے بعد کے ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی ہے۔دراصل ذوقی نے اس میں وہ آگ دکھائی ہے جو بجھ چکی ہے۔وہ ماضی جو گم ہو چکا ہے،اصل میں یہ ناول اسی ماضی کی تلاش کا حصہ ہے۔

مثال:

''جس آندھی اور طوفان کی طرح وہ آیا تھا،اسی آندھی اور
طوفان کی طرح وہ چلا بھی گیا۔لیکن کمرے میں ایک ایسا سناٹا

چھوڑ گیا ،جس میں آتش فشاں کے بارود موجود تھیں

-------'' ۱۳۳؎

سراغ:

اس ناول میں جگہ جگہ مسلمانوں کے استحصال اور ظلم و جبر کی کہانی ملتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بٹلہ ہاوس انکاوئنٹر کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جس کو سہارا بنا کر ذوقی نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی عکاسی بہترین انداز میں کی ہے۔ ناول میں جب اسامہ غائب ہوتا ہے تو ان کی والدہ رباب پریشان ہوتی ہے تو ارشد پاشا ان سے کہتا ہے:

''سراغ ملتے ہی اسامہ کی مشکلیں بڑھ جائیں گی۔''

درج بالا باتوں کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول کے عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتے کی استواری اپنی مضبوطی کے ساتھ موجود ہے۔

''پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی'' ایک خوبصورت ناول ہے۔ اس میں ذوقی نے موجودہ دور میں پھیلی بدعنوانیوں کی عکاسی کی ہے۔ خواہ وہ سیاسی ہو، سماجی ہو، مذہبی ہو، ادبی ہو یا فکری ناانصافی ہو۔ اس ناول کا اصل ہیرو ''وقت'' ہے جو بھیانک سونامی یا طوفان کی طرح ہماری قدروں کو نہیں بلکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے علاوہ ہماری ایمانداری کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہا ہے۔ اور پھر اپنے سماج کو ایک مکار فریبی، دغاباز وغیرہ بنا رہا ہے جس کی وجہ سے سماج میں بسنے والے کچھ باضمیر اور باشعور لوگ اپنے انسان ہونے پر شرم محسوس کرتے ہیں۔ ذوقی نے ناول میں سونامی کا سہارا لے کر بدلتے وقت کا خوفناک چہرہ بیان کیا ہے۔ اقتباس:

''تم ہو۔

تم ہو اس لئے تمہیں حکومت کرنا ہے

اور جو حکومت کرتے ہیں وہ رشتہ ناطوں کی طرف نہیں دیکھتے

قصہ ختم۔۔۔ وہ ہے اور اس کو حکومت بھی کرنا ہے اور اس

لئے راستے میں کوئی بھی نہیں آئے گا۔خواہ وہ پروفسر

ہویا۔۔۔۔۔۔'' ۱۳۴

اس کے علاوہ ذوقی نے خود ایک انٹرویو میں ان سب باتوں کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

''میں دیکھ رہا تھا کہ ہمارا سسٹم کرپٹ ہو چکا ہے۔نئی ٹیکنالوجی عام آدمیوں کو کمزور اور بیکار کرتی جارہی ہے ایک معمول روبوٹ عام انسان پر بھاری پڑتا ہے۔انٹرنیٹ،سائبر کرائم سے لے کر جینوم اور کلوننگ پر وسیس تک آنکھ کھول کر دیکھئے ۔۔انسان اپنی ایجادوں کی روشنی میں اگر فاتح ہے تو وہیں وہ ہارا ہوا بھی ہے۔وہ اپنے جیسے کلون بناتا ہے اور آئن اسٹائن سے لے کر اب تک کے سائنسدان اس پر بھی مغزماری کرتے ہیں کہ خدا کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا خدا کے کاموں میں دخل نہیں دیا جاسکتا اس لئے کلوننگ پروسیس کو ابھی تک انٹرنیشنل قانون نے عام انسانوں کے لئے Aprove نہیں کیا ہے۔'' ۱۳۵

جب انسان پر ظلم اور زیادتی حد سے بڑھ جاتی ہے تو انسان کچھ دیر کے لئے یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کیوں نہ ظلم کرنے والے کو قتل کر دیا جائے لیکن پھر جلد ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ قتل واجب اصل میں ایک نقصان ہی ہے۔

''ایک قتل واجب کے لئے''

''یقین جانو اس قتل واجب سے کسی کو نقصان نہیں ہے۔اور کسی کا کیا نقصان ہوسکتا ہے۔جبکہ سب کچھ ایک بڑے نقصان کو کم کرنے کے لئے ۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔''،قتل واجب ، بڑا نقصان ۔ یقیناً تم مذاق کر رہے ہو۔۔کوئی قتل واجب کیسے ہوسکتا ہے۔اور کسی بڑے نقصان سے بچانے کے

لئے۔۔۔۔'' ۱۳۶؎

اس ناول کا پہلا باب ''سونامی سے پہلے'' ہے جس میں ذوقی نے ایک طرف احمد علی کی زندگی کا وہ حصہ دکھایا ہے جو انہوں نے اپنی جدوجہد کے دوران کلکتہ کی نکسل تحریک کے سائے میں گذاری ہے۔ دوسرا حصہ پروفیسر صدرالدین قریشی کا ہے جس کی شخصیت ایک نرم گفتار، بے حد پرکشش جیسی ہے۔

پرفیسر ایس کی آمد: سونامی کی لہریں ۱۹۹۲ تا ۲۰۰۵۔۔

اس ناول کا ایک باب اسی نام سے لکھا ہے۔ اس باب میں ذوقی نے پروفیسر ایس کی زندگی سے پردہ اٹھایا ہے۔ پروفیسر ایس ایک ایسے شخص ہیں جو اپنی تحریروں سے جادو جگاتے ہیں، لوگوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں، ذہین لوگوں کا استحصال کرتے ہیں اور جنسی طور پر بے حد سفاک شخص کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جب پروفیسر ایس شاہ پور چھولہ داری آتے ہیں تو ان کی پراسرار شخصیت کو لے کر لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں:

''پروفیسر ایس کے شاہ پور چھولہ داری آنے کی خبر شہر میں عام ہو چکی تھی۔ بوڑھے کے کلب سے لے کر عام آدمی تک یہ خبر چنگاری کی طرح گشت کر چکی تھی۔ پروفیسر ایس کی پراسرار شخصیت کو لے کر گفتگو کے نئے نئے دروازبھی کھلنے لگے تھے۔'' ۱۳۷؎

سونامی لہریں:

''تو موسیو۔۔۔۔ہم سونامی لہروں کی باتیں کر رہے تھے۔''

''سونامی لہریں تاریخ لکھ گئی ہیں۔۔۔۔ یہ ایک حقیقت ہے۔'' ۱۳۸؎

اس ناول کے آخر میں جب سیما پرویز کا ہاتھ خوف سے تھام لیتی ہے تو پرویز اس سے کہتا ہے۔

''میں سونامی لہروں کی آہٹ سن رہا ہوں۔۔۔۔سونامی لہریں پھر آئیں گی۔۔۔اور ممکن ہے کہ آ بھی چکی ہوں۔۔۔۔'' ۱۳۹؎

اس ناول میں ذوقی نے زندگی اور موت کے کشمکش کو قدم قدم پر دکھایا ہے۔اس لئے یہ سونامی لہریں ناول کا سب سے اہم یا ضروری حصہ ہیں۔ پروفیسر ایس پہلی بار انہی سونامی لہروں کے درمیان بے نقاب ہوتا ہے۔حکومت کرنے کے دو اہم مانو لاگ سے اس کا سابقہ یہیں پڑتا ہے۔ پرویز سانیال اسی سونامی سے اپنے اندر ایک مضبوطی پیدا کرتا ہے اور الٹرا ہومین کا کانسپٹ بھی یہیں ٹوٹتا ہے۔اگر ہم ناول میں عنوان اور نقطۂ نظر کے حوالے سے بات کریں گے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے اس ناول میں عنوان اور نقطۂ نظر کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا ہے۔

''لے سانس بھی آہستہ'': اس ناول کا عنوان ذوقی نے میر تقی میر کے شعر:

''لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا''

سے لیا گیا ہے۔انہوں نے جس معنویت کے ساتھ اس ناول کا تانا بانا تیار کیا ہے ایسا لگتا ہے کہ میر کے اس شعر سے بہتر کوئی عنوان اس ناول کے لئے ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ میر نے جب یہ شعر لکھا ہوگا تو انہوں نے تب یہ نہیں سوچا ہوگا کہ ان کے اس شعر کی تعریف کوئی اس طرح کر سکتا ہے جس طرح ذوقی نے اس ناول میں کی ہے۔اس عنوان کے بارے میں ذوقی خود کہتے ہیں کہ:

> ''میں نے اس ناول کو معنویت عطا کرنے کے لیے میر تقی میؔر کے مشہور شعر کا سہارا لیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ میر جس دنیا کو بچانے کی فکر میں آہستہ آہستہ سانس لینے کی بات کہہ رہے تھے صدیوں کے طلسم میں یہ سانس ہی گم ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔میرے ذہن میں بہت دن سے اس موضوع کو لیکر بیقرار کر دینے والی کیفیت تھی کہ اگر بات ہندوستان کی کریں۔۔۔۔۔۱۰۰ سال کی تاریخ پر نظر رکھیں تو تہذیبوں کے تصادم کے اتنے سارے پہلو سامنے آئیں گے،جن پر لکھنا ایک خوبصورت قدم ثابت ہوگا۔پھر مجھے احساس ہوا کہ اسے لکھنے کی ضرورت

ہے۔'' ۱۴۰؎

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ میر نے اپنی ماقبل ختم ہوتی تہذیب کا سراغ لگا لیا تھا لیکن جب ہم آج کے ماحول میں دیکھتے ہیں تو اس شعر کا مفہوم اور معنی آج کل کے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں، اس وقت حالات کچھ ایسے ہی تھے کہ میر کو یہ شعر لکھنا پڑا۔اس ناول کا عنوان ہی 'لے سانس بھی آہستہ' ہے اور پوری کہانی اسی کے ارد گرد گھومتی ہے۔اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کے عنوان اور نقطۂ نظر میں براہ راست رشتہ موجود ہے۔

''ذبح''، ذوقی نے اس ناول کا نام''جرمن شاعر ایریش فریڈ'' کی ایک نظم سے لیا ہے۔اس نظم میں ایریش فریڈ کہتے ہیں۔اگر سست لوگوں کو ذبح کیا جائے گا تو دنیا چست ہو جائے گی۔اگر بدصورتوں کو ذبح کیا جائے گا تو تو دنیا عقل مند ہو جائے گی، اگر بیماروں کو ذبح کیا جائے گا تو دنیا تندرست ہو جائے گی، اگر افسردہ دلوں کو ذبح کیا جائے گا تو دنیا خوش وخرم ہو جائے گا۔اگر شاعر نے طنز کیا ہے تو یہ صحیح ہے ورنہ یہ انداز انسانیت کے خلاف ہے کیونکہ سست اور چست، بدصورت اور خوبصورت، عاقل اور بے وقوف وغیرہ یہ سب لازم وملزوم ہیں اور عین فطرت، فطرت نے انسانوں کو مختلف رنگ و روپ، مختلف صلاحیتوں اور مختلف عادتوں کا حامل بنایا ہے اور بحیثیت انسان سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں لیکن انسان ہی انسان کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور کمزور کا حق طاقتور لے جاتا ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی تخلیق کار یا ناول نگار کسی کہانی یا ناول کی تخلیق کر رہا ہوتا ہے تو اس موضوع سے وابستہ کوئی قول یا کوئی شعر اچانک اس کے ذہن میں آجاتا ہے۔ذوقی اس ناول کے عنوان اور نقطۂ نظر کے بارے میں خود بتاتے ہیں کہ''ذبح'' کی تخلیق کے دوران بار بار اس جرمن شاعر کی نظم میرے ذہن میں گونجتی رہتی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ system ہر ایک کمزور انسان کو ذبح کر رہا ہے۔ایک طرف مسلمان ہیں جن کا سیاسی اور سماجی سطح پر استحصال ہو رہا ہے اور دوسری طرف دلت طبقہ ہے۔اس کی جنگ لڑنے والا کوئی نہیں ہے۔اردو میں اس وقت تک دلتوں کے مسائل کو لے کر کوئی ناول منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ایک زمانہ تھا جب جاگیردارانہ نظام میں عبدل سقہ جیسے لوگ پرورش پاتے تھے۔ بلکہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ نسل در نسل ایسے لوگ یا خاندان اپنی خدمات انجام دیتے آئے تھے۔ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد

ایسے لوگ حاشیے پر چلے گئے۔اسی سلسلے کی ایک دوسری کڑی ہے کہ جب ترقی ہوتی ہے کچھ چیزیں کمزور اور بے کار ہو کر ماضی کا حصہ بن جاتی ہے۔اس لئے ناول کے آخر میں عبدل سقہ کے بیٹے کو کہنا پڑتا ہے۔

''اب ہم تیار نہیں ہیں

اس طرح بار بار ذبح ہونے کے لئے۔'' ۱۴۱

اس ناول کا موضوع ہی ذبح ہے اور پوری کہانی اسی کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔اس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس ناول کے عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ قائم ہے۔

''نیلام گھر''، یہ ناول عنوان اور نقطۂ نظر کے حوالے سے ایک کامیاب ناول نظر آتا ہے۔یہ ناول ذوقی کی شروعاتی ناولوں میں سے ہے تب ان کی عمر قریباً ۲۰ سال کی تھی، جب انہوں نے اس دنیا کو سیاسی اور سماجی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی۔لیکن یہ دنیا تب انہیں ایک نیلام گھر کی طرح نظر آئی۔اس بارے میں ذوقی کہتے ہیں:

''میری عمر اس وقت ۲۰ سال کی ہوگی۔میں نے سیاسی اور سماجی سطح پر جب اس دنیا کو دیکھنے کا ارادہ کیا تو یہ دنیا مجھے نیلام گھر کی طرح نظر آئی۔ایک ایسا نیلام گھر جہاں سب کچھ فروخت ہو رہا ہے۔علم سے سیاست، مذہب اور سماج تک۔جیسے ہر شے نیلام ہو رہی ہے۔انسانی قدریں ختم ہو چکی ہے۔میں نے انجم کے کردار میں ایک ایسے بزرگ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس کی جسکی آنکھوں کے سامنے سب کچھ نیلام ہو رہا ہے۔بدلتے ہوئے وقت سے رشتے بے معنی ہو چکے ہیں۔قدریں ختم ہو چکی ہیں۔مذہب صرف خوف کی علامت کے طور پر رہ گیا ہے اور یہ فاتح انسان اپنی بربادیوں کا جشن منا رہا ہے۔۔۔۔میں نے اس ناول میں آزادی کیا ۳۲۔۳۳ برس کے بعد کے ہندوستان کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔'' ۱۴۲

اس ناول کو پڑھ کر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ عنوان اور نقطۂ نظر کا رشتہ برقرار ہے۔

ناول ''بیان'' بابری مسجد کے المیہ پر مبنی ایک ایسا ناول ہے جس میں ہم اس وقت کے ہندوستان کی جھلکیاں موجود ہیں۔ ناول میں تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کا بھی بیان ہے۔

''کیا اب بس یہی بچ گیا ہے؟ یہی ہونے کو؟ دنگے اور فساد کی
ایک نئی کہانی دہرائی جائے گی۔۔۔۔۔۔ایک نئی
کہانی۔۔۔۔۔شیعہ سنی فساد۔۔۔۔۔۔ذات پات کے نام پر
ہونے والے دنگے، ہندو مسلم دنگے۔۔۔۔۔سب پرانے پڑ
گئے۔۔۔۔۔اب تلوار کی زد پر تم ہو۔۔۔۔۔۔'' ۱۴۳

ذوقی نے اس ناول میں بالکمند شرما جوش کے ذریعے عالمی بھائی چارے کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ناول میں بالکمند شرما جوش پوری زندگی کوئی بیان دینا چاہتے تھے جو وہ پوری زندگی نہیں دے پائے۔

''ارے قلم لاؤ میاں
مجھے بیان دینا ہے

جہاں تک اس ناول میں عنوان اور نقطۂ نظر کی بات ہے تو ہم ان ابواب کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے اس ناول میں عنوان اور نقطۂ نظر کا رشتہ برقرار رکھا ہے۔

''مسلمان'' عنوان اور نقطۂ نظر کے حوالے سے ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول میں ذوقی نے ہندوستانی مسلمانوں کی عکاسی کی ہے۔ جس میں انہوں نے بے روزگاری، جاہلیت، وطن پرستی اور فسادات کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ذوقی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''چھوٹی سی عمر۔۔۔رومانی تجربوں سے گذرنے کے
بجائے، دیکھ رہی تھی۔۔۔دہشت۔۔۔دیکھ رہی تھی فساد
۔۔۔۔۔۔دیکھ رہی تھی دھواں ۔۔۔خون اگلتے مناظر
۔۔۔۔تب خبروں میں، اخباروں میں لگاتار پاکستان،

ہندوستان پر بمباری کرتا تھا۔۔۔اور ہم خبر کے ساتھ ہم خود

کوالزام کے کٹہرے میں پاتے تھے۔''   ۱۴۴

ذوقی اس ناول میں آج کے دور اور مسلمانوں کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انہوں نے اس ناول میں طوائفوں کے جذبات کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز میں کی ہے۔علاوہ ازیں ہندوستان میں بے روزگار اور فرقہ پرستی سے بے زار نوجوانوں کی بھی عکاسی خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔

''آپ اکیلی ہیں۔نوکری بھی کرنا چاہتی ہیں۔۔ذرا کچھ
دن۔۔۔کچھ دن ایک تجربہ کرکے دیکھتے ہیں۔۔۔کیا ضروری
ہے کہ ہر جگہ مسلمان نام کو امپوز (impose) کیا
جائے۔کیوں کیا فرق پڑتا ہے؟
''مطلب''؟ وہ چونکی
''مطلب مسلمان ہو، یہ تم بتاؤ ہی نہیں۔۔۔''
''کیا؟''
''اس سے تم زیادہ محفوظ ہو گی۔ یہ میرا تجربہ بتاتا ہے۔''

۱۴۵

اس ناول کا عنوان ہی مسلمان ہے اور پوری کہانی اسی کے اردگرد گھومتی ہے اور اس ناول کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے اس ناول کے عنوان اور نقطۂ نظر میں ایک ضروری رشتہ قائم رکھا ہے۔

شہر چپ ہے:

یہ مشرف عالم ذوقی کے کالج کے دنوں کی تخلیق ہے۔

اس ناول میں ذوقی نے غریبی اور بے روزگاری کے ساتھ ساتھ فسادات، دنگے اور قتل و غارت کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

''شہر چپ ہے۔۔۔شہر کے مقامی کالج کے ایک طالب علم کا قتل
ہوگیا تھا۔اس واقعہ نے شہر میں اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا

تھا۔صبح میں شہر کے تمام کالج کے لڑکوں نے مل کر میلوں لمبا جلوس
نکالا۔اور شام تک کے لئے شہر کی ساری دکانیں بند کر دی گئی
تھیں۔بندوق دھاری پولیس والے جابجا نکڑ پر کھڑے
تھے۔خوف میں ڈوبی آنکھیں شہر کے سُونے پن کو تک رہی
تھیں۔۔۔'' ۱۴۶

اس ناول میں ذوقی نے ہمارے سماج کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہیں۔اس ناول میں انہوں نے موضوع کی مناسبت سے عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ قائم رکھا ہے۔

''پوکے مان کی دنیا'' اس ناول کی کہانی روی کنچن کے اردگرد گھومتی ہے۔روی کنچن ایک ۱۲ سال کا بچہ ہے جسے پوکے مان کارڈز، پوسٹر اور ٹیٹو جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ان کو پوکے مان کے بارے میں کافی معلومات تھی اور شاید اتنی زیادہ جتنی اپنی کتابوں کے بارے میں بھی نہ تھی۔ناول کا عنوان اس پوری کہانی کے اِردگرد گھومتا ہے۔اس بارے میں ذوقی لکھتے ہیں کہ:

پوکے مان ٹریز:

''ادھرادھر آگے پیچھے/ دائیں بائیں چاروں جانب ہے پوکے
مان/ پوکے مان اچھے برے، جانوروں کی شکلوں والے تیز ذہن،
چالاک اور شاطران میں پوکے ٹریز بھی ہیں
جن کی شکلیں انسانوں جیسی ہیں
اور وہ گھومتے ہیں/ چلتے ہیں/ پوکے مان کے اردگرد کھیلتے رہتے ہیں
نئے نئے کھیل/ ہوتے رہتے ہیں نئے نئے تماشے۔'' ۱۴۷

اس عنوان کے بارے میں ذوقی نے ناول کے شروع میں لکھا ہے کہ:

'' میں شکرگزار ہوں، جناب وسیم القادری (مدیر روزن) کا
۔۔۔۔۔کہ شاید وہ نہ ہوتے ،تو میں یہ ناول لکھنے کے بارے
میں سوچتا بھی نہیں۔۲۰۰۴ جنوری کی ایک شب وہ میرے گھر
آئے اور میرے بیٹے کو ایک خوبصورت تحفہ دیا۔۔۔یہ تحفہ

تھا۔۔۔۔۔پو کے مان کارڈس۔۔۔۔۔وہ ایک لمحہ، جب میں
نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ایک عجیب وغریب چمک محسوس کی
اور یہ وہی لمحہ تھا، جب میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے اس موضوع
پر ایک ناول لکھنا ہے۔''   ۱۴۸

اگراس ناول کا کوئی اورعنوان ہوتا تو شاید یہ اپنا معنی ومفہوم واضح نہ کر پاتا مگر پو کے مان کی دنیا ایک مناسب عنوان ہے۔اس ناول کے عنوان اور نقطۂ نظر میں اگر ہم رشتے کی بات کریں تو ان ساری باتوں کوملحوظ نظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے اس ناول کے عنوان اور نقطۂ نظر میں براہ راست رشتہ برقرار رکھا ہے۔

ناول ''عقاب کی آنکھیں'' کا کردار ایک چھوٹا سا بچہ ہے جو فطرت اور انسانی جسم سے نفرت کرتا ہے۔اقتباس:

''یہ جسم کس قدر گندہ ہے۔۔۔۔۔دو ہاتھ، دو پاؤں اور پاؤں
کے درمیان۔۔۔۔۔خدا نے یہ کیسا جسم بنایا ہے ایک دم گندہ
اور گھناؤنا۔۔۔۔۔''   ۱۴۹

ناول ''عقاب کی آنکھیں'' میں عنوان سے ہی ناول کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔قاری کو ناول پڑھنے کے دوران ہی عنوان اور نقطۂ نظر کا رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ناول عنوان کے اِرد گرد گھومتا ہے۔ناول کا مرکزی کردار 'الف' ہے اور پوری کہانی پر یہ کردار چھایا ہوا ہے۔:

''تب پہلی بار اس کی آنکھوں میں عقاب منڈلایا تھا۔عقاب اڑ
رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔عقاب اُڑتے اُڑتے کہیں دور نکل گیا
۔۔۔۔۔۔۔''   ۱۵۰

اس ناول میں عنوان سے ناول کے ابتدائی حصہ میں نقطۂ نظر کی وضاحت نہیں ہوتی لیکن جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے عنوان اور نقطۂ نظر کے آپسی رشتے کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔اقتباس:

''باہر عقاب کے پھڑ پھڑانے کی آواز آتی ہے۔۔۔۔۔عقاب

۔۔۔۔۔۔۔میں اس پرندے کو بار بار کیوں دیکھتا ہوں۔ یہ
پرندہ میری آنکھوں میں بار بار کیوں لہراتا ہے۔۔۔۔۔۔۔
عقاب اپنی مخصوص آواز میں چیخ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں
بھیانک ہو گئی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ اور اب ۔۔۔۔۔۔۔ وہ
اُڑنے کے لئے پرتول رہا ہے۔۔۔۔۔۔'' ۱۵۱؎

اس ناول کی ساری کہانی 'الف' کے اردگرد گھومتی ہے۔عنوان ناول کے موضوع اور مواد کے مرکزی خیال سے متعلق نظر آتا ہے گویا تکنیکی اعتبار سے عنوان اور نقطۂ نظر میں باقاعدہ رشتہ ہے۔

''نالۂ شب گیر'' یہ عنوان پورے ناول پر چھایا ہوا ہے،عنوان اور نقطۂ نظر سے جو رشتہ قائم ہے اس کی بھرپور عکاسی کہانی کے شروعاتی حصے میں ہی ملتی ہے۔:

''عورت ۔۔۔۔۔ پانی میں جھانکتی ہوئی خوف کی پرچھائیوں
کے درمیان سہمی ہوئی کھڑی تھی اور اس کی تقدیر اسی نالۂ شب گیر
سے جوڑ دی گئی تھی۔'' ۱۵۲؎

اس ناول کی ساری کہانی ناہید ناز اور صوفیہ مشتاق احمد کے اردگرد گھومتی ہے اور ناہید ناز ایک بہادر لڑکی ہے جو مردوں سے انتقام لینا چاہتی ہے اور عورتوں کے سارے کام وہ کام مردوں سے کرانا چاہتی ہے۔ اس طرح سے ہم کہتے ہیں کہ عنوان اور نقطۂ نظر میں گہرا رشتہ قائم ہے کیونکہ ناول عنوان کو واضح کرتا ہے۔

ناول ''مرگ انبوہ'' میں عنوان سے ناول کے ابتدائی حصے میں نقطۂ نظر کی وضاحت نہیں ہوتی لیکن جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے عنوان اور نقطۂ نظر کے آپسی رشتے کی پرتیں کھل جاتی ہے۔مثلاً

''مرگ انبوہ تاریخ کی کتابوں سے ایسے کئی سیاہ ورق اور
تصویریں اس وقت نظروں کے سامنے تھیں ۔۔۔۔۔ پاشا مرزا
اور سارہ کا چہرہ میری نگاہوں میں روشن تھا۔۔۔۔۔۔'' ۱۵۳؎

ناول کے عنوان اور نقطۂ نظر میں گہرا رشتہ قائم ہوتا ہے کیونکہ ناول عنوان کو واضح کرتا ہے۔ناول میں ابتداء سے آخر تک جہانگیر مرزا پاشا کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد اردو فکشن لکھنے والوں میں مشرف عالم ذوقی کا نام کئی اعتبار سے نمایاں ہے، انہوں نے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ تجربے کئے۔ اردو فکشن کو نیا اسلوب دیا۔ ناول کے مروجہ فریم کو توڑا اور ناول کے فن میں وسعت پیدا کی۔ انہوں نے ہر ناول میں زبان و بیان کے الگ الگ تجربے کئے ہیں۔ ذوقی ہمارے عہد کے وہ ممتاز ناول نگار ہیں جن کا ذہن ہمیشہ نئی باتیں سوچتا رہتا ہے۔ ان کی ہر تخلیق ایک تجربہ ہے۔ انہوں نے جتنے ناول لکھے وہ سب اپنی جگہ پر نئے نئے تجربے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر تجربہ کامیاب ہو جائے۔ ذوقی کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ہر تجربہ داخلی سفر سے شروع ہو کر خارجی سفر کی طرف مراجعت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی اپنے فن پاروں میں جبر کو زیر کرنے کی کہانی سناتے ہیں۔ چونکہ آج معاشرے میں ہر شخص کسی نہ کسی جبر کا شکار ہے اور وہ اس جبر کو زیر کرنا چاہتا ہے اس لئے مشرف عالم ذوقی کی تخلیقات دل کو چھوتی ہیں اور اسے ایک نیا حوصلہ بخشتی ہیں۔ ان کے ناول بلا شبہ ناول کی تکنیک کے جدید اصولوں پر کھرے اترتے ہیں۔

حواشی

۱۔ڈاکٹراحسن فاروقی،ڈاکٹرسیدنورالحسن ہاشمی،ناول کیا ہے،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۳

۲۔مشرف عالم ذوقی، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۱

۳۔مشرف عالم ذوقی،آتشِ رفتہ کا سراغ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۵

۴۔مشرف عالم ذوقی،آتشِ رفتہ کا سراغ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۹۔۲۸

۵۔مشرف عالم ذوقی،لے سانس بھی آہستہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۸۸

۶۔مشرف عالم ذوقی،لے سانس بھی آہستہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۰۶

۷۔مشرف عالم ذوقی،لے سانس بھی آہستہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۷۴

۸۔مشرف عالم ذوقی،بیان،عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۱۱

۹۔مشرف عالم ذوقی،مرگ انبوہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۸

۱۰۔ای۔ایم۔فارسٹر،Aspect of the Novel،داستان،ڈرامہ،ناول اورافسانہ ص۔۲۲۲

۱۱۔سمیہ بشیر،ذوقی کی ادبی کائنات،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۴۵

۱۲۔مشرف عالم ذوقی، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۲۳

۱۳۔مشرف عالم ذوقی، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۹۲

۱۴۔مشرف عالم ذوقی،ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۰۲

۱۵۔مشرف عالم ذوقی،ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۴۴۔۴۳

۱۶۔۔مشرف عالم ذوقی،سلسلہ روز شب،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ص۔۱۷۴

۱۷۔مشرف عالم ذوقی،بیان،عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۲۰۳

۱۸۔مشرف عالم ذوقی،بیان،عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۱۲۹

۱۹۔مشرف عالم ذوقی،بیان،عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۱۴۸

۲۰۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۲۵۔۲۶

۲۱۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۷۸

۲۲۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۹۴

۲۳۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۹۸

۲۴۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۱

۲۵۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۱

۲۶۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۸۴

۲۷۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۶۲

۲۸۔۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۴۳

۲۹۔۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۴۴

۳۰۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۸۶

۳۱۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۵

۳۲۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۷۵۔۴۷۵

۳۳۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۶۲

۳۴۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۴۷

۳۵۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۶۴

۳۶۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۶۴

۳۷۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۳۸

۳۸۔تسنیم فاطمہ، ذوقی: تخلیق اور مکالمہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۳۸

۳۹۔مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۶۲

۴۰۔سُمیہ بشیر، ذوقی کی ادبی کائنات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۴۴

۴۱۔ڈاکٹر احسن فاروقی، ناول کیا ہے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۲

۴۲۔مشرف عالم ذوقی، عقاب کی آنکھیں، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۶

۴۳۔مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۷۲

۴۴۔مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۰۰

۴۵۔مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۷۳

۴۶۔مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۲۹

۴۷۔مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۸۰

۴۸۔مشرف عالم ذوقی، آتش رفتہ کا سراغ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۶

۴۹۔مشرف عالم ذوقی، آتش رفتہ کا سراغ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۱

۵۰۔مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۳۰

۵۱۔مشرف عالم ذوقی، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۱

۵۲۔مشرف عالم ذوقی، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۵

۵۳۔مشرف عالم ذوقی، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۶۲

۵۴۔مشرف عالم ذوقی، شہر چپ ہے، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۹

۵۵۔مشرف عالم ذوقی، شہر چپ ہے، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۷۹

۵۶۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۳۲
۵۷۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۴۸
۵۸۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۶۶
۵۹۔مشرف عالم ذوقی ، بیان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۱۱
۶۰۔مشرف عالم ذوقی ، بیان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۲۴
۶۱۔مشرف عالم ذوقی ، بیان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۲۷۴
۶۲۔مشرف عالم ذوقی ، نالۂ شب گیر،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۲۶
۶۳۔مشرف عالم ذوقی ،مرگ انبو،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی	ص۔۷۷
۶۴۔اسلم آزاد، اردو ناول آزادی کے بعد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی	ص۔۱۸
۶۵۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۱۱
۶۶۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۲۲
۶۷۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۲۵
۶۸۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۸۸
۶۹۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۲۷
۷۰۔مشرف عالم ذوقی ، ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۹۱
۷۱۔مشرف عالم ذوقی ، بیان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۱۴۷
۷۲۔مشرف عالم ذوقی ، بیان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۱۵۷
۷۳۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۷
۷۴۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۲۵
۷۵۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے،تخلیق کار پبلشر دہلی	ص۔۱۵۵
۷۶۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ	ص۔۱۰

۷۷۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۶۴

۷۸۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۴۱

۷۹۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۱۰۵

۸۰۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۶

۸۱۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۴

۸۲۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۷۸

۸۳۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۸۰

۸۴۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۷۷

۸۵۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۶

۸۶۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۴

۸۷۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۹۸

۸۸۔الماس فاطمہ، گفتگو بند نہ ہو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۶۰

۸۹۔الماس فاطمہ، گفتگو بند نہ ہو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۶۷

۹۰۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۸

۹۱۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۵۶۔۵۵

۹۲۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۱۸

۹۳۔مشرف عالم ذوقی ،عقاب کی آنکھیں، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۵۲۶

۹۴۔سمیہ بشیر، ذوقی کی ادبی کائنات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۴۴

۹۵۔مشرف عالم ذوقی ،عقاب کی آنکھیں، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۴۷

۹۶۔مشرف عالم ذوقی ،عقاب کی آنکھیں،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۴۸

۹۷۔مشرف عالم ذوقی ،عقاب کی آنکھیں،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۸

۹۸۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۲۱

۹۹۔مشرف عالم ذوقی ، نیلام گھر،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۷۲

۱۰۰۔مشرف عالم ذوقی ، ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۳۶

۱۰۱۔مشرف عالم ذوقی ، ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۸

۱۰۲۔مشرف عالم ذوقی ، ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۲۴

۱۰۳۔مشرف عالم ذوقی ، ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۹۲

۱۰۴۔مشرف عالم ذوقی ، ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۳۰

۱۰۵۔مشرف عالم ذوقی ، ذبح،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۴۳

۱۰۶۔مشرف عالم ذوقی ، بیان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۲۵۴

۱۰۷۔مشرف عالم ذوقی ، بیان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۱۲۵

۱۰۸۔مشرف عالم ذوقی ، بیان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۱۰۳

۱۰۹۔مشرف عالم ذوقی ، بیان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۲۲۸

۱۱۰۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۸۱

۱۱۱۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۹۳

۱۱۲۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۷۱

۱۱۳۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۳۴

۱۱۴۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۴۴

۱۱۵۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۴۷

۱۱۶۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۷۳

۱۱۷۔مشرف عالم ذوقی ،مسلمان،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۷۷

۱۱۸۔مشرف عالم ذوقی ، پو کے مان کی دنیا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۴۴

۱۱۹۔مشرف عالم ذوقی ، پو کے مان کی دنیا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۳

۱۲۰۔مشرف عالم ذوقی ، پو کے مان کی دنیا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۵

۱۲۱۔مشرف عالم ذوقی ، پو کے مان کی دنیا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۸

۱۲۲۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۴۹

۱۲۳۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۹۳

۱۲۴۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳۱

۱۲۵۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۵۰

۱۲۶۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۵۰۱

۱۲۷۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۲۵

۱۲۸۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۳۸

۱۲۹۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۴

۱۳۰۔مشرف عالم ذوقی ، لے سانس بھی آہستہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۹

۱۳۱۔مشرف عالم ذوقی ،مرگ انبو،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۷۷

۱۳۲۔مشرف عالم ذوقی ،مرگ انبو،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۸۹

۱۳۳۔مشرف عالم ذوقی ،آتش رفتہ کا سراغ ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۵۱

۱۳۴۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۴۷۷

۱۳۵۔تسنیم فاطمہ، ذوقی :تخلیق اور مکالمہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۸۸

۱۳۶۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۸

۱۳۷۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۸۱

۱۳۸۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۵۱۵

۱۳۹۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۵۱۵

۱۴۰۔مشرف عالم ذوقی ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۵۱۹

۱۴۱۔تسنیم فاطمہ، ذوقی :تخلیق اور مکالمہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۴۲

۱۴۲۔مشرف عالم ذوقی ، ذبح ،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۵۰

۱۴۳۔سمیہ بشیر، ذوقی کی ادبی کائنات ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۱۴۵

۱۴۴۔مشرف عالم ذوقی ، بیان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۳۷

۱۴۵۔مشرف عالم ذوقی ، بیان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۲۱

۱۴۶۔مشرف عالم ذوقی ، بیان ، عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹیڈ ص۔۱۲

۱۴۷۔مشرف عالم ذوقی ،شہر چپ ہے، تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۲۴

۱۴۸۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۸۳

۱۴۹۔مشرف عالم ذوقی ، پوکے مان کی دنیا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۳

۱۵۰۔مشرف عالم ذوقی ،عقاب کی آنکھیں ،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۲۸

۱۵۱۔مشرف عالم ذوقی ،عقاب کی آنکھیں ،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۳۴

۱۵۲۔مشرف عالم ذوقی ،عقاب کی آنکھیں ،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۴۳

۱۵۳۔مشرف عالم ذوقی ، نالۂ شب گیر،تخلیق کار پبلشر دہلی ص۔۱۱

۱۵۴۔مشرف عالم ذوقی ،مرگ انبو،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ص۔۲۳۱

مفروضہ

☆ مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں تکنیک کا تنوع پایا جاتا ہے:۔

یہ مفروضہ صحیح ثابت ہوا ہے ذوقی نے اپنے ناولوں میں مختلف تکنیکوں کا سہارا لیا ہے۔ جب ہم نے ان کے ناولوں کا جائزہ لیا ہے تو وہ ہمیں اس تجربے میں کامیاب نظر آئے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں بیانیہ، فلیش بیک کے ساتھ ساتھ شعور کی رو اور ڈائری کی تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔

☆ مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں کرداروں کا تعلق اصل زندگی سے بہت گہرا ہوتا ہے۔

دوسرا مفروضہ بھی صحیح ثابت ہوا ہے۔ان کی کردار نگاری کا مفصل جائزہ لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں کردار نگاری کی جانب خصوصی توجہ دی ہے۔ان کے ناولوں کے کردار حقیقی معلوم ہوتے ہیں جو زندگی سے مکالمہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذوقی کے تمام ناولوں میں سماج اور معاشرے کا مکمل عکس نمایاں ہے جس میں ہمیں سماج کے ہر فرد کا چہرہ صاف نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کا انتخاب بہت ہی مناسب اور متوازن انداز میں کیا ہے۔ان کے کرداروں میں ہمیں مختلف سماجی، سیاسی، تہذیبی اور مذہبی گروہ بندی نظر آتی ہے۔ان کا ہر کردار اپنی خصوصیات لے کر ناول میں شامل ہوتا ہے۔اور یہ الگ الگ زندگی کے پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جس کی وجہ سے یہ ناولوں کی فضا پر پوری طرح چھا جاتے ہیں۔

☆ مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں زبان سادہ اور عام فہم ہوتی ہے اور کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال برجستہ کرتے ہیں۔

یہ مفروضہ بھی صحیح ثابت ہوا ہے۔مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کی زبان، سادہ، صاف، سلیس اور عام فہم ہے۔ انہوں نے اپنی ناولوں میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ نہایت ہی صاف، سادہ، سلیس اور رواں دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں کہیں کہیں انگریزی لفظوں کا بھی استعمال کیا ہے۔وہ اپنے ناولوں میں کرداروں کے سماجی، سیاسی اور مذہبی سیاق کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اپنی زبان و بیان کا انتخاب کرتے ہیں اور کرداروں کی نفسیات میں بھی گہرائی تک اترنے کی

کوشش کرتے ہیں۔انہوں نے کہیں کہیں اپنے ناولوں میں صحافتی انداز اپنایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی صحافت کے ساتھ وابستہ رہے۔اسی لئے قاری کو کبھی کبھی ان کے ناولوں میں صحافت کا رنگ نظر آتا ہے۔

☆ مشرف عالم ذوقی نے اپنے معاصر زندگی کے سلگتے ہوئے موضوعات جیسے رشوت خوری، بے روز گاری،غربت ،جنسی بے راہ روی، مذہبی تعصب فرقہ واریت،علاقائیت جیسے موضوعات کوحقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے:۔

یہ مفروضہ بھی صحیح ثابت ہوا۔مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے،انہوں نے ناولوں میں اپنی بصیرت سے انسانی زندگی کے نشیب وفراز کو ایک الگ انداز میں ابھارا ہے۔ان کی نظر بہت ہی گہری ہے کیوں کہ انہوں نے انسانی زندگی اور سماج سے جڑے مختلف پہلوؤں پر اپنا قلم اٹھایا ہے۔ان کے ناولوں کے موضوعات زندگی کی طرح وسیع ہیں۔انہوں نے عصر حاضر میں پیش آنے والے بیشتر مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔مثلا رشوت خوری، بے روز گاری،غربت،جنسی بے راہ روی، مذہبی تعصب،فرقہ وارانہ فسادات، علاقائیت، دہشت گردی، سماجی مسائل، بدعنوانی، پولیس کاظلم و جبر وغیرہ۔

☆ خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی رویوں Discrimination اور استحصال جیسی تلخ حقیقت کو اپنے ناولوں میں فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے:۔

یہ مفروضہ بھی صحیح ثابت ہوا ہے۔ذوقی نے اپنے ناولوں میں سماج کی ان تلخ حقیقتوں کی عکاسی کی ہے۔دور جہالت اور آج کے زمانے کی عورت یکساں ہے کیوں کہ اس زمانے میں بھی اس کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا اور آج کے اس دور جدید میں بھی اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔آخر اس طبقے کے ساتھ اس طرح کی ناانصافی کیوں ہوتی ہے۔دراصل آج کل کا انسان مادہ پرست بن گیا ہے جو اس طبقے کو صرف اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور ان کو استحصال کا نشانہ بناتا رہتا ہے۔

☆ مشرف عالم ذوقی کے ناول ان کی حقیقت نگاری کی بدولت اپنے عہد کی سماجی، سیاسی،تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے آئینہ دار بن گئے ہیں،جس میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے:۔

یہ مفروضہ بھی صحیح ثابت ہوا ہے۔ذوقی کے ناولوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے سیاسی،سماجی،معاشی،اقتصادی،نفسیاتی،مذہبی،اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں کے موضوعات روزمرہ زندگی سے ہی اخذ کئے ہیں۔انہوں نے انسان سے جڑے ہر چھوٹے بڑے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے بیشتر ناول ہمارے دور کے اہم سماجی اور سیاسی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔

حاصل مطالعہ

ناول اطالوی زبان کے لفظ ''ناویلا'' (Novella) سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں 'نیا'۔ یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ ناول ایک نئی چیز تھی۔ ناول کا لفظ اردو ادب میں انگریزی ادب کے راستے سے آیا ہے۔ یہ نثر کی ایک قسم ہے جس کا اطلاق ایسے قصوں پر ہوتا ہے جن میں واضح اور منظّم پلاٹ ہو اور خیالی کہانیوں کے بجائے حقیقی زندگی کے مسائل و واقعات بیان کئے جائیں۔ اٹلی (Italy) والے ناول کو 'ناولا' کے نام سے یاد کرتے تھے وہ روزمرہ کے واقعات اور حادثات کو تسلسل اور ربط کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کی بنیاد کہانیوں اور داستانوں پر رکھی جاتی تھی۔ پرانے زمانے میں داستان گو درباروں میں ملازم ہوا کرتے تھے اور یہ لوگ محفلوں اور مجلسوں میں داستانیں سنایا کرتے تھے اسی نہج پر کہانیوں اور داستانوں کی روایت چلتی رہی اور آہستہ آہستہ ان کہانیوں اور داستانوں کا شمار ادب میں ہونے لگا۔

ناول میں صرف زندگی کا نقشہ ہی نہیں ملتا بلکہ زندگی کی نئے سرے سے تخلیق ملتی ہے یہ زندگی کی تخلیق اس طور پر کرتا ہے کہ جو چیز زندگی میں موجود نہیں ہوتی وہ بھی ناول میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہے جو ناول کے ذریعہ زندگی کو ایک خاص معنی اور اہمیت دے دیتی ہیں۔ زندگی کی حقیقت ایک سمندر کی سی ہے جو ہر قسم کے تضادات، اختلافات اور تنوع سے بھری پڑی ہے مگر اس میں ترتیب یا تسلسل کا ہونا ضروری ہے۔

جس طرح زندگی مختلف رنگوں سے عبارت ہے اور اس کے بہت سارے پہلو ہیں اسی طرح اس کو پیش کرنے کے انداز بھی مختلف ہیں۔ ناول زندگی کی تصویر ہے اس میں زندگی کے مختلف واقعات اور حادثات کو پیش کرنے کے لئے مختلف طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ جیسے مواد، موضوع، تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے مختلف قسمیں ہیں جس طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھینچی جا سکتی اسی طرح ناول کے اقسام کے بیچ کوئی فاصلہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر ہم ناول کے اقسام کی بات کریں تو اس کی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اصلاحی ناول ہے، اس میں ابتدائی دور کے ناول شمار کئے جاتے ہیں۔ دوسری قسم تاریخی ناول ہے اور تیسری قسم رومانی ناول ہے۔ اس کے علاوہ ناول کے اور بھی اقسام ہیں جو کچھ اس طرح سے ہیں، واقعاتی ناول، کرداری ناول، حادثاتی ناول، کردار معاشرتی ناول، نفسیاتی ناول، سماجی ناول، جاسوسی ناول، تہذیبی ناول، حقیقت و

مثالیت پسند ناول،سوانح ناول وغیرہ۔

ناول دراصل انگریزی کے توسط سے اردو میں آیا ہے گویا اس کا آغاز سب سے پہلے مغرب میں ہوا ہے۔انگریزی زبان کا پہلا ناول ''پامیلا'' ہے جو اٹھارہویں صدی میں سیمول رچڑسن Samuel (Richardson) نے لکھا۔اگر ہم اردو کی بات کریں تو اس زمانے میں ہمارے یہاں داستانوں کا رواج تھا۔انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑنے کے بعد ہمارے یہاں داستانیں ہی آگے بڑھ رہی تھی لیکن آہستہ آہستہ ان داستانوں کا رواج کم ہوتا گیا اور داستان کی جگہ ناول نے لے لی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب دنیا بدل گئی تو اردو ادب میں حقیقت نگاری کا آغاز ہوا اور اسی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلی آئی چونکہ زندگی بدل گئی تو ادب میں بھی تبدیلی آئی اور اس تبدیلی کا حوصلہ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی سماج کے لئے وہ حالات و واقعات پیدا ہوگئے تھے جو ناول کے لئے ضروری ہیں۔اور اردو میں ناول کا آغاز ان ہی حالات و واقعات کی بنا پر ہوا جن حالات و واقعات کی وجہ سے انگلستان میں ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں یہ سارے حالات پیدا ہوگئے تھے اسی لئے اردو ادب میں ناول نگاری وجود میں آئی۔اس تبدیلی نے معاشرے کے حساس ادیب اور شعراء سب کو اصلاح قوم کی طرف مائل کیا۔

اگر ناول کی تعریف اور خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو اردو کے پہلے ناول نگار مولوی نذیر احمد ہیں۔''مراۃ العروس'' مولوی نذیر احمد کا پہلا ناول ہے اور ساتھ ہی اردو ادب کا بھی۔مولوی نذیر احمد کے بعد اردو ناول نگاری میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا نام آتا ہے۔انہوں نے اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے ''فسانہ آزاد'' کا سلسلہ شروع کیا جو ''اودھ اخبار'' میں قسط وار شائع ہوتا تھا۔سرشار کے بعد ایک اور ناول نگار عبدالحلیم شرر (۱۹۲۶-۱۸۶۰) ہیں۔ان کا شہکار ناول '' فردوس بریں'' ہے جو ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔اس دور میں خواتین ناول نگار بھی مولوی نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں سے متاثر ہوئیں اور انہوں نے بھی اصلاحی ناول لکھنے شروع کیے۔خواتین ناول نگار میں سب سے پہلا نام ''رشیدالنساء بیگم'' کا ہے۔ان کے بعد محمودی بیگم،عباسی بیگم،طیبہ بیگم،صغرا ہمایوں،تراب علی سدید،محمودہ بیگم،نذر سجاد حیدر، فاطمہ بیگم منشی فاضل ان

خواتین ناول نگار کے علاوہ اور بھی ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہے۔مثلاً حمیدہ سلطان دہلوی، ثروت آرا بیگم، ظفر جہاں بیگم، اختری بیگم، جمیلہ بیگم (فیروزہ) اور صدیقہ بیگم وغیرہ۔اسی دور کے مرد ناول نگار جنھوں نے مولوی نذیر احمد کی روایت کو آگے بڑھایا۔ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر کے علاوہ سجاد حسین، علامہ راشدالخیری، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری کے نام کافی اہمیت کا حامل ہیں۔بیسویں صدی کے آغاز میں نذیر احمد، سرشار اور شرر کے علاوہ مرزا عباس حسین ہوش، محمد علی طبیب، مرزا محمد سعید، قاری سرفراز حسین اور راشدالخیری وغیرہ شامل ہیں۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پھر رومانیت کا آغاز ہوا۔یورپ میں رومانی تحریک عقلیت کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی اور اردو میں سرسید تحریک کی افادیت پسندی، خشک مزاجی اور عقلیت پرستی کے جوابی رجحان کی شکل میں نمودار ہوئی۔اس دور کے لکھنے والوں میں نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، ل۔ اکبرالہٰ آبادی، مولانا آزاد اور سجاد انصاری کے علاوہ حجاب امتیاز علی تاج وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں ترقی یافتہ دور شروع ہوا۔اس دور کے ناول نگاروں میں منشی پریم چند کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ان کے ناولوں میں بازارحسن، بیوہ، نرملا، چوگان ہستی، گوشہ عافیت، میدان عمل اور گئو دان وغیرہ اہم ہیں۔

جب ہم بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا جائزہ لیتے ہیں تو پہلی عالمی جنگ سے متاثر لوگوں میں بے اطمینانی، ذہنی انتشار اور غیر یقینی صورتحال نظر آتی ہے۔اسی دور میں مکتوبی اور ڈائیری نما ناول نگاری بھی شروع ہوئی۔اردو ادب میں پہلا مکتوبی ناول قاضی عبدالغفار کا ''لیلیٰ کے خطوط'' ہے جو ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا۔قاضی عبد الغفار کے ہم عصر ناول نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی تاج، مجنوں گورکھپوری، عظیم بیگ چغتائی، فیاض علی، ل۔احمد، محمد مہدی تسکین، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، سدرشن، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی ناول نگاروں کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان ناول نگاروں کے ناولوں کی بنیادیں اصلاحی پہلو پر مبنی نظر آتی ہیں۔ترقی پسند کے ابتدائی دور میں ادب میں بہت

ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ترقی پسند ادیبوں نے انسان دوستی کوفروغ دینے کی کوشش کی جس کی داغ بیل پریم چند نے اپنے آخری دور کے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے ڈالی تھی۔

ترقی پسند تحریک نے محنت کشوں کے مسائل کو ادب میں شامل کیا اور زندگی سے ادب کا رشتہ مستحکم کیا۔اس تحریک سے وابستہ ادیب اور اس کے علاوہ دوسرے ادیبوں پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ابراہیم جلیس، سعادت حسن منٹو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ابتداء سے لے کر ترقی پسند تحریک کے دور تک کئی قسم کے ناول لکھے گئے۔مثلاً کسی نے جاسوسی ناول لکھنے شروع کیے، کسی نے تاریخی، کسی نے واقعاتی، تو کسی نے مہماتی وغیرہ۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ تقریباً دس سال تک تھا۔تقسیم ہند کے بعد لکھے گئے ناول میں سب سے پہلا نام رامانند ساگر کا ہے۔انہوں نے ناول ''اور انسان مرگیا'' لکھا اس کے علاوہ اسی موضوع پر دوسرے ناول نگار مثلاً ایم۔اسلم نے ''رقص ابلیس'' لکھا اور رشید اختر نے ''۱۵/ اگست'' میں ان ہی حالات کو پیش کیا ہے اور ان کے علاوہ قیس رامپوری، رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی وغیرہ کے ناولوں کا موضوع بھی تقسیم ہند ہی ہے۔

ان سارے ناول نگاروں کے بعد تقسیم ہند کے موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے اہم ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، احسن فاروقی کا نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد بھی اس صنف کو بڑی تیزی سے فروغ ملا اس دور میں بہت سارے ناول نگار سامنے آئے۔جنہوں نے اس صنف کو جلا بخشی اور اس روایت کو آگے بڑھایا۔اس دور میں جو ناول لکھے گئے ہیں وہ شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی''، ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی''، جمیلہ ہاشمی کا ''تلاش بہاراں''، عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں''، خدیجہ مستور کا ''آنگن''، رضیہ فصیح احمد کا ''آبلہ پا''، قاضی عبدالستار کا ''شب گذیدہ'' اور ''داراشکوہ''، راجندر سنگھ بیدی کا ''ایک چادر میلی سی''، بلونت سنگھ کا ''رات چور اور چاند'' اور ''معمولی لڑکی''، انتظار حسین کا ''چاند گہن'' اور ''تذکرہ''، آمنہ ابوالحسن کا ''سیاہ۔سرخ۔سفید''، انور عظیم کا ''پرچھاؤں کی وادی''، ش۔مظفر پوری کا ''ہزار راتیں''، علیم مسرور کا ''بہت دیر کردی''، حیات اللہ انصاری کا ''لہو کے پھول'' اور جیلانی بانو کا ''ایوان غزل'' خاص طور سے قابل

ذکر ہیں۔

ان ناول نگاروں کے علاوہ اور بھی نام ہیں جنہوں نے ناول لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھایا۔ مثلاً صالحہ عابد حسین کا ''عذرا'' اور ''الجھی ڈور''، رضیہ سجاد ظہیر کا ''اللہ میگھ بادل دے''، واجدہ تبسم کا ''پھول کھلنے دو'' اور شمس الرحمان فاروقی کا ''کئی چاند تھے سرآسماں'' وغیرہ۔

دورِ حاضر میں بھی برصغیر کے کئی ناول نگار منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس دور میں ناول نگاروں نے جو ناول لکھے ہیں۔ ان میں پیغام آفاقی کا ''مکان''، بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ''، غضنفر کا ''پانی، کینچلی وغیرہ، عبدالصمد کا ''دو گز زمین'' اور ''مہاتما''، الیاس احمد گدی کا ''فائر ایریا''، اقبال مجید کا ''نمک''، مشرف عالم ذوقی کا ''بیان'' اور ''نیلام گھر''، فہیم اعظمی کا ''جنم کنڈلی''، حسین الحق کا ''فرات'' اور ''بولو مت چپ رہو''، شموئل احمد کا ''ندی''، قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا''، جوگندر پال کا ''نادید''، شفق کا ''کانچ کا بازیگر''، مستنصر حسین تارڑ کا ''بہاؤ''، عاصم بٹ کا ''دائرہ''، خالدہ حسین کا ''کاغذی گھاٹ''، محمد حمید شاہد کا ''مٹی آدم کھاتی ہے''، آمنہ مفتی کا ''جرات رندانہ''، اطہر بیگ کا ''غلام باغ''، مصطفی کریم کا ''راستہ بند ہے''، شمیم منظر کا ''زوال سے پہلے''، نسیم انجم کا ''نرک''، محمد امین کا ''بارخدا''، کراچی والے، محمد الیاس کا ''برف''، زاہدہ کا ''نہ جنون رہا نہ پری رہی''، ساجدہ زیدی کا ''مٹی کے حرم''، علی امام نقوی کا ''تین بتی''، رضیہ بٹ کا ''اماں''، انیس ناگی کا ''دیوار کے پیچھے''، ترنم ریاض کا ''مورتی''، خالدہ سہیل کا ''ٹوٹا ہوا آدمی''، سید شبیر حسین کا ''جھوک سیال''، طارق محمود کا ''اللہ میگھ دے''، ناہید سلطان مرزا کا ''دشت خواب کے مسافر''، شاہد اختر کا ''شہر میں سمندر''، طاہر مسعود کا ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے''، احمد صغیر کا ''دروازہ بند ہے''، علی امجد کا ''کالی ماٹی''، اقبال انصاری کا ''پارس''، رحمٰن عباس کا ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی''، صادقہ انور سحر کا ''کہانی کوئی سناؤ متاشا''، اشرف شاد کا ''بے وطن''، سلیمہ شہزاد کا ''دست آدم''، عرفان احمد خان کا ''غازہ خون''، سہیل آغا کا ''کہانی عہد زوال کی'' اور محمد علیم کا ''میرے ناولوں کی گمشدہ آواز'' وغیرہ خاص طور سے شامل ہیں۔

ان کے علاوہ ظفر پیامی کا ''فرار''، انور عظیم کا ''جھلستے جنگل''، انور خان کا ''پھول جیسے لوگ''، سلیم شہزاد کا ''دشت آدم''، صلاح الدین پرویز کا ''نمرتا''، تنسیم فاطمہ کا ''ایک اور کوسی''، سید محمد اشرف کا

''نمبر دار کا نیلا''، آچاریہ شوکت خلیل کا ''اگر تم لوٹ آتے''، نند کشور وکرم کا ''یادوں کے کھنڈر''، ثروت خان کا ''اندھیرا پگ''، عشرت ظفر کا ''آخری درویش''، حبیب حق کا ''جسے میر کہتے ہو صاحبو''، ڈاکٹر محمد حسن کا سوانحی ناول ''غم دل وحشت دل''، کوثر مظہری کا ''آنکھ جو کچھ سوچتی ہے''، خالد جاوید کا ''موت کی کتاب ''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان سے پاکستان تک اردو ادب میں کچھ نئے اور اچھے ناول نگار سامنے آئے۔جن میں تسنیم فاطمہ، احمد صغیر، صادقہ نواب سحر، وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ پاکستان سے حامد سراج، حمید شاہد، مبین مرزا، اے خیام اور آصف فرخی جیسے لوگ فکشن کی دنیا میں آگئے ۔اس دور کے ناولوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اردو ناول کا مستقبل روشن ہے۔ جوں جوں لکھنے والوں کی صلاحیت اور سنجیدگی میں شدت بڑھتی جائے گی اردو ناول کا مستقبل روشن ہوتا جائے گا۔اس دور کے ناولوں سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ادیبوں نے اپنے اپنے انداز میں ناول کے فن کو برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو عوام کو پسند آئے۔اور یہ سفر آج بھی جاری ہے جس سے ناول کے دامن کو وسعت عطا ہوتی ہے۔غرض اردو نثر، خاص طور سے اردو ناول جس تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اردو میں آنے والا دور ناول کا ہی دور ہوگا۔

مشرف عالم ذوقی کا نام عصر حاضر کے فکشن نگاروں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ان کی تحریروں میں ایک عام انسان کی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ایک ایسی دنیا جسے وہ خوابوں کی دنیا میں دیکھتے ہیں۔مشرف عالم ذوقی کی پیدائش ۲۲ مارچ ۱۹۶۲ء میں بہار کے شہر محلّہ مہادیو آرہ میں ایک علمی و ادبی خاندان میں ہوئی۔بچپن سے ہی ان کو لکھنے اور پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

مشرف عالم ذوقی نے جین اسکول سے میٹرک کیا۔اس کے بعد انہوں نے آرہ کے ''مہاراجہ کالج'' سے گریجویشن ۱۹۸۲ء میں مکمل کی۔اس کے بعد انہوں نے تاریخ میں ایم۔اے(MA) کیا۔مشرف عالم ذوقی ۱۹۸۵ء میں اپنا شہر آرہ کو چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔دہلی آنے کے بعد مشرف عالم ذوقی روزگار کے لئے چند ایک اخبارات سے منسلک ہوئے۔ وہ ۱۹۸۵ء میں دہلی آئے اور ۱۹۸۷ء تک الیکٹرانک میڈیا کے

دروازے ان کے لئے کھل چکے تھے۔ ذوقی ایک جرنلسٹ (Journalist) ہیں۔ جرنلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پروڈیوسر اور ڈائیریکٹر بھی ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں جب ان کی وابستگی دوردرشن سے ہوئی تو انہوں نے دوسال تک دہلی کے کئی پروڈکشن ہاؤس Production House کے لئے فلم اسکرپٹ لکھی اور ۱۹۸۹ء میں دوردرشن کے پروڈیوسر (Producer) بن گئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ انہوں نے پروگرام بنائے، اسکرپٹ لکھی اور اس کے ساتھ ادبی دنیا کا سفر بھی جاری رکھا۔

مشرف عالم ذوقی فری لانسر لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر کافی طویل ہے۔ ذوقی کا ماننا ہے کہ وہ قلم کی مزدوری کرتے ہیں وہ اسی طرح لکھتے ہیں جس طرح مزدور مزدوری کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ذوقی جب دہلی آئے تو اپنے ساتھ صرف قلم لے کر آئے تھے۔ لیکن انہوں نے قلم کی مزدوری کر کے آج اپنے لئے ایک مقام بنالیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے ٹیلی فلمز بنائی ہیں۔ مثلاً پربت، دکھاوا، انجام، رکا ہوا درد، سورج کا سفر، رنجیش، بندش، آنگن کی دھوپ، ایک نئی صبح وغیرہ۔

ذوقی ایک زودنویس قلم کار ہیں۔ انہوں نے ادب کے ہر اصناف پر طبع آزمائی کی۔ انہوں نے اگر چہ مضامین، تنقید یا شاعری پر اپنا زور قلم آزمایا ہے لیکن ان کا اصل میدان فکشن ہے۔ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں پہلی کہانی بچوں کے لئے لکھی اور تیرہ سال کی عمر میں پہلا افسانہ ''رشتوں کی صلیب'' لکھا۔ سب سے پہلا افسانہ ''جلتے بجھتے دیپ'' تھا جو انہوں نے ریڈیو کے لئے لکھا تھا لیکن پہلا افسانہ جو اشاعت کی منزلوں سے گزرا، وہ 'رشتوں کی صلیب' ہے۔

مشرف عالم ذوقی کو اردو افسانے میں کافی شہرت ملی ہے۔ انہیں ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو فکشن میں بلند مقام حاصل ہے۔ اردو افسانے کی دنیا میں ذوقی کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اب تک ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ مثلاً ''بھوکا ایتھوپیا''، ''منڈی''، ''صدی کو الوداع کہتے ہوئے''، ''غلام بخش''، ''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے''، ''نفرت کے دنوں میں'' وغیرہ۔

مشرف عالم ذوقی نے ادبی زندگی کی شروعات شاعری سے کی ہے، انہیں بچپن سے ہی شعر پڑھنا اور

گنگنانا پسند تھا۔ وہ اکثر میرؔ، غالبؔ، اقبال اور ذوق کے شعر گنگنایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں انہیں شاعری سے بے حد محبت اور لگاؤ تھا۔ خاص کر ذوق سے، اور پھر ذوقی کے اسی لگاؤ نے مشرف عالم کو ذوقی بنا دیا۔ ذوقی کا گھر ایک کوٹھی کی طرح تھا جس میں اکثر و بیشتر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ یہ گھر کا ہی ماحول تھا جس نے ذوقی کو شاعری کی طرف راغب کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ذوقی کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق ہوگیا۔ مشرف عالم ذوقی نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں کافی عمدہ نظمیں لکھیں مگر ان دنوں نثری نظموں کا اتنا زیادہ چرچا نہیں تھا، اس لئے ذوقی نے زیادہ تر پابند اور آزاد نظمیں لکھیں۔ ذوقی نے یوں تو بہت سی نظمیں تخلیق کی ہیں لیکن ان کی جو نظم شہرت کا باعث بنی وہ ''لپروسی کیمپ'' ہے۔ ''لپروسی کیمپ'' ان کی ایک طویل نثری نظم ہے۔ ذوقی نے جب نثری نظم لکھنے کا آغاز کیا تو اس وقت ان کو ایسا لگا کہ مجھے اپنے جذبات اور احساسات کو کہانیوں میں اتارنا دشوار ہوگا، اسی لئے انہوں نے اپنے جذبات اور احساسات کو ابھارنے کے لئے نثری نظم کا انتخاب کیا۔ ان کو اس بات کا بھی احساس ہوا تھا کہ نثری نظم کے توسط سے ہی اپنی بات قاری تک پہنچانے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ ذوقی کا ماننا ہے کہ فکری سطح پر، بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن کا اظہار غزلوں میں نہیں ہوسکتا اور اس کے علاوہ کسی کسی کیفیت کو نظم یا آزاد نظم میں سمونا مشکل ہے لیکن پھر ایک ادیب ایسے حالات میں نثری نظم کا آغاز کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اگرچہ ان کی توجہ کا مرکز زیادہ تر فکشن رہا ہے لیکن انہوں نے شاعری کے علاوہ تنقید نگاری کے میدان میں بھی اپنے مقدور کے مطابق کام کیا۔ تنقید میں اب تک ان کی کئی کتابیں سامنے آئی ہیں۔ مثلاً بلونت سنگھ کی کہانیاں، اپنا آنگن، سلسلہ روز و شب، اردو ادب، مکالمہ کے سات رنگ، اردو ساہتیہ سمواد کے، ۱۹۸۰ء کے بعد اردو افسانہ، باادب باملاحظہ ہوشیار اور آب روان کبیر وغیرہ۔ آب روان کبیر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں تقریباً ۲۹ مضامین شامل ہیں۔

تنقید کے میدان میں ایک قلم کار کو وسیع القلب اور وسیع النظر ہونا چاہیے۔ تب ہی وہ عدل وانصاف کر سکے یہ تمام اوصاف ذوقی میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ذوقی ایک حساس ذہن اور دوربین نگاہ رکھتے ہیں۔ ان میں اپنے عہد سے آگے دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ انہوں نے محسوس کیا ہے کہ نہ یہ معاشرہ اسی طرح رہ پائے گا اور

نہ ادب ۔اس لئے انہوں نے اس کے لئے ایسی مستحکم بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان تبدیلیوں کا ساتھ دے سکے۔

انہوں نے اپنی تنقیدی کتابوں میں ادبی مسائل پر بحث کی ہے۔ان کے تنقیدی مضامین میں نئے ادبی شعور اور سماجی تقاضوں کے ساتھ ساتھ نئی سائنسی ٹیکنالوجی کا احترام بھی ملتا ہے۔ان کی نظر میں تنقید کا مقصد تشریح نہیں۔ بلکہ زندگی کے گہرے سے شعور اور ادبی قدروں کی تلاش ہے۔

ذوقی کے ناول آج کی سماجی وسیاسی زندگی کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ ومشاہدہ پیش کرتے ہیں۔مشرف عالم ذوقی نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی لیکن ان کی شناخت ناولوں کے حوالے سے ہے۔ذوقی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی خود کو ازم یا نظریئے کے قید میں نہیں رکھا۔ وہ آزادانہ طور پر اپنے لئے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ان کے ناولوں میں عام طور پر دو روش صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ایک روشن مستقبل کے تعلق سے سامنے آتی ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذوقی اردو زبان وادب کے ایسے ناول نگار ہیں، جو مستقبل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بدلتی ہوئی دنیا اور سائنس وٹکنالوجی پر بھی ذوقی کی گہری نظر ہے۔مستقبل کے علاوہ ان کے ناولوں میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ حاوی ہے تو وہ سیاسی وسماجی موضوعات ہیں۔

جب ہم مشرف عالم ذوقی کی ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ذوقی کو موضوعاتی ناول لکھنے میں خاصی مہارت حاصل ہے۔ وہ بے باکی اور بے خوفی سے دیش ،سماج ، معاشرے ، تہذیب وتمدن اور انسانیت کے بنتے بگڑتے نقوش کو نہ صرف اپنی تیز آنکھوں سے دیکھتے ہیں بلکہ اس کرب کو دل میں اتار لیتے ہیں اور پھر ان کا قلم اپنے موضوع کے ساتھ بھر پور انصاف کرتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی صرف سماج کو اپنا موضوع نہیں بناتے بلکہ وہ قلم سے نشتر کا کام لیتے ہیں۔ وہ معاشرے کے اچھے برے تمام پہلوؤں کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔اکیسویں صدی کا سماج بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ہم ایک مہذب دنیا میں قدم رکھ چکے ہیں مگر اس دنیا میں جنگوں کا خوف بھی ہمیں متاثر کرتا ہے۔ بربادی وہلاکت کی کہانیوں سے بھی ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ جنگ ،نسل کشی ،جسم فروشی ، میزائلوں کا رقص ، درندگی اور ان کے درمیان دنیا کے امن چین اور تحفظ کے بارے میں غور کرنا ، ذوقی

کی ادبی کائنات کی خاصیت ہے۔ وہ سماج سے زیادہ سماج کے مستقبل کو لے کر خوفزدہ رہتے ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ سماجی موضوعات کے لحاظ سے ذوقی کے ناولوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے بیشتر ناولوں میں مستقبل کے اشارے بھی ملتے ہیں۔

سیاسی موضوعات پر بھی مشرف عالم ذوقی کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ ذوقی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سیاسی شعور کے بغیر کوئی بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں کا تعلق سیاست سے بھی رہا ہے۔ بیان، آتش رفتہ کا سراغ، پوکے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سنامی ایسے ناول ہیں جن میں شعوری اور لاشعوری طور پر سیاست کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ذوقی کے ناولوں میں غلامی اور تقسیم کی گونج شدت سے سنائی دیتی ہے۔ ذوقی کا ایک ناول لے سانس بھی آہستہ ہے۔ اس ناول میں غلامی اور غلامی کے بعد کے حالات کا جائزہ سیاسی روشنی میں لیا گیا ہے۔

معاشی موضوعات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس کے تحت سرمایہ دارانہ نظام، جاگیردارنہ نظام، سوشلزم و کمیونزم نظام، بینکنگ، کارپوریٹ سیکٹر، ملٹی نیشنل کمپنیاں، جدید ترین مسائل جیسے موضوعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ معیشت کا تعلق ہماری عام زندگی سے ہے۔ ملک کا معاشی نظام بہتر نہ ہو تو عوام کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ معاشی موضوعات کا ذکر ذوقی کے ناول نالۂ شب گیر، لے سانس بھی آہستہ، پوکے مان کی دنیا، آتش رفتہ کا سراغ وغیرہ میں ملتا ہے۔

ذوقی کے موضوعات ہمارا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ نئی صدی کے مسائل تلاش کرنے ہوں، تو ذوقی کے ناول یہ آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔ آج کے معاشی موضوعات پر ذوقی کے ناول کھرے اترتے ہیں اور ان کی روشنی میں آنے والے وقت کو آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے بیشتر ناولوں میں تہذیبی و ثقافتی موضوعات ملتے ہیں۔ ہر معاشرے کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ اسی تہذیب سے انسان کی مخصوص شناخت قائم ہوتی ہے۔ ذوقی کے ناولوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہزاروں برسوں کی تہذیب کا عکس ان میں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں اس بات کا رنج وملال بھی

ہے کہ پرانی اقدار کھوتی جارہی ہیں۔تہذیبوں کا تصادم جاری ہے۔اکیسویں صدی کے چیلنجز نے ہمارے ملک کو بھی متاثر کیا ہے۔

تہذیب ومعاشرت ، یہ موضوعات مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کے لئے نئے نہیں ہیں۔ پہلے ناول عقاب کی آنکھیں میں ذوقی نے نہ صرف اس مسئلے پر گفتگو کی ہے بلکہ مذہب کے تعلق سے فلسفہ، معاشرت، اخلاقیات اور معاشیات کے باب میں نئے مکالموں کا اضافہ کیا ہے۔تہذیب وثقافت کے موضوع پر پوکے مان کی دنیا اور لے سانس بھی آہستہ کافی اہم ہیں۔قدیم وجدید تہذیب کا موازنہ اورنئی صدی کے واقعات و حادثات سے نئے نئے سوال پیدا کرنا بھی ان کی ایک بڑی خوبی ہے۔یہ موضوعات نئی صدی کے دروازے پر براہ راست دستک دیتے ہیں اور ہمارے لئے کئی بڑے سوال چھوڑ جاتے ہیں۔مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معاشرت اورثقافت جیسے موضوعات پر ذوقی کو دسترس حاصل ہےاوران موضوعات پرقلم اٹھاتے ہوئے ہر بار انہوں نے اپنے ناول کے لئے نئی فضا کا انتخاب کیا ہے۔موضوع کا نیاپن ان کے ادب کو خاص بنادیتا ہے۔

مذہبی موضوعات کو بیان کرنے میں بھی مشرف عالم ذوقی کا کوئی ثانی نہیں ہے۔مسلمان، ذبح ،شہر چپ ہے جیسے ناولوں میں بھی اخلاقیات اور مذہب کی بلند سطح نظرآتی ہے۔بیان اورآتش رفتہ کا سراغ کے پس منظر میں بھی مذہب حاوی ہے۔ان دونوں ناولوں میں مذہب کے بگڑے ہوئے رجحان کو پیش کیا گیا ہے۔ان ناولوں میں سیاست، مذہب کا حصہ ہے۔سیاست ہندواور مسلمان کے مابین دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ یہ بھی مذہب کا غلط استعمال ہے جس سے آزادی کے بعد کا ہندوستان دوچار ہے۔ نیلام گھر اور پروفیسر ایس کی عجیب داستان میں مذہب کو ہی زندگی جینے کا صحیح راستہ کہا گیا ہےاور نئے سوال بھی پیدا کئے گئے ہیں۔مختصر یہ ہے کہ مذہبی موضوعات پر لکھتے ہوئے ذوقی نے کہیں بھی اپنی فکر سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ مذہب ان کے ناولوں میں ایسا استعارہ ہے جوزندگی سنوارنے کے کام آتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا پلاٹ پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ اور پراثر بھی ہے۔جب ہم ان کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پلاٹ پر مضبوط گرفت نے ان کے ناولوں میں

ایسی کشش اور تاثیر بھر دی ہے جو قاری کو ایک لمحہ کے لئے بھی بار نہیں گزرتا ہے۔ان میں فطری ارتقاء موجود ہے۔کوئی بھی واقعہ بے ربط معلوم نہیں ہوتا ہے اور ان کے پلاٹ میں کہیں نا ہی بعید از قیاس باتوں کا ذکر ہے اور نہ ہی ناممکن الوقوع بات کا اظہار ہے، کشمکش حیات سے ان کے ناول مزین ہیں۔ جہاں ایک باب کا خاتمہ ہوتا ہے وہیں پر دوسرے باب کا منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں پلاٹ کی ترتیب میں واقعات کا فطری بہاؤ، ماحول کا تأثر، کرداروں کی جزیات نگاری کا جادو ضرور ہوتا ہے جو ہمیں ان کے ناولوں میں صاف نظر آتا ہے۔جس کی وجہ سے قاری بڑے ذوق وشوق سے ان کے ناولوں کو پڑھتا ہے اور اس تجسس میں رہتا ہے کہ آگے کا قصہ کیا ہوگا۔

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں ہمیں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے ساتھ ساتھ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار بھی ملتے ہیں۔ان کے ناولوں میں ہمیں ہندو اور مسلم، مرد اور عورت، نوجوان اور بچوں کے کردار اپنی اپنی کہانی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان میں ڈاکٹر، اساتذہ، پروفیسر، زمیندار، نوکر، کلرک، طالب علم، بے روزگار، دہشت گرد، چور، تاجر، مظلوم اور پولیس والے، وغیرہ سبھی شامل ہیں۔انہوں نے تقریباً سماج کے ہر ایک طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو اپنے ناولوں میں اچھی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی اپنے ناولوں میں بھی کرداروں کی صرف باطنی کیفیت کو ہی نہیں بلکہ ان کے اندرون میں بھی جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ وہ کرداروں کے رگ وپے میں داخل ہونے کا فن اچھی طرح جانتے ہیں۔وہ کرداروں کی نفسیات، چال وچلن، ذہنی کشمکش، جذبات واحساسات اور حرکات وسکنات کو فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے کردار ہمیشہ زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں۔وہ اپنے ناولوں میں کرداروں کی خوبیاں اور خامیاں دونوں کو ابھارنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں تاکہ کردار نکھر کر قاری کے سامنے آجائے۔ان کے کردار اسی ماحول میں سانس لیتے ہیں جس میں ہم اور آپ جی رہے ہیں اور وہ برصغیر خاص کر کے ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ذوقی نے بیانیہ اور فلیش بیک کی تکنیک اپنے ناولوں میں زیادہ استعمال کی ہے لیکن کہیں کہیں وہ شعور کی رو اور ڈائری کی تکنیک کا بھی استعمال کرتے ہیں۔

زمان ومکان ناول کا ایک اہم جز ہے۔ جب ناول نگار کسی خاص جگہ اور خاص زمانے کو پیش کرتا ہے تو اس کے مطابق کردار اور واقعات کو بھی پیش کرتا ہے کیوں کہ ہر جگہ کی خصوصیات الگ ہوتی ہیں اور ہر زمانے کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ ناول میں زمان ومکان کی بھی اہمیت ہے کیوں کہ اگر ناول نگار کے ذہن میں واقعہ یا کردار کے ''واقع'' ہونے کی جگہ یا وقت کا صحیح علم نہ ہوتو ناول میں تاثر کی کمی ہو جائے گی ایسا نہ ہو کہ کردار کا تعلق شہر سے ہو یا کوئی واقعہ شہر سے متعلق ہو اور بیان میں گاؤں کی بات آرہی ہو۔ چنانچہ زمان ومکان کی پیشکش میں بھی ناول نگار کو کمال احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ زمان ومکان میں لباس، رہائش، منظر، پس منظر اور آس پاس کے ماحول کا ذوقی نے خاص لحاظ رکھا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کی زبان اور بیان سادہ، صاف، سلیس اور عام فہم ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کے سماجی، سیاسی اور مذہبی سیاق میں زبان کا استعمال کیا ہے۔ وہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اپنی زبان و بیان کا انتخاب کرتے ہیں اور کرداروں کی نفسیات میں بھی گہرائی تک اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ناولوں میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ نہایت ہی صاف، سادہ، سلیس اور رواں ہے۔

ناول میں زندگی کی عکاسی ہوتی ہے لیکن ناول میں ہر ناول نگار کا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ ناول میں ناول نگار اپنی کہانی کو کئی طرح سے بیان کرتا ہے۔ کبھی کبھی ناول نگار خود کہانی کو بیان کرتا ہے اور کبھی وہ کسی کردار کے ذریعے اپنی کہانی سامنے لاتا ہے۔ ہر ادیب کا اپنا اپنا نقطۂ نظر بھی ضرور ہوتا ہے جہاں تک مشرف عالم ذوقی کی بات ہے تو ان کا بھی اپنا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ انہوں نے اپنے تمام ناولوں کا عنوان بہت ہی سوچ سمجھ کر رکھا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں عنوان اور نقطۂ نظر کے مابین رشتہ برقرار رکھا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد اردو فکشن لکھنے والوں میں مشرف عالم ذوقی کا نام کئی اعتبار سے نمایاں ہے۔ وہ اپنے فن پاروں میں جبر کو زیر کرنے کی کہانی سناتے ہیں چوں کہ آج کے معاشرے میں ہر شخص کسی نہ کسی جبر کا شکار ہے اور وہ اس جبر کو زیر کرنا چاہتا ہے اس لئے مشرف عالم ذوقی کی تخلیقات قاری کے دل کو چھوتی ہے اور اسے

ایک نیا حوصلہ بخشتی ہے۔ذوقی کے کچھ ناول اس وقت زیرطبع ہیں جن کا نام''مردہ خانہ میں عورت''،''ہائی وے پر کھڑا آدمی''،''گوگا ندھی گو'' وغیرہ ہیں امید ہے کہ ان ناولوں میں بھی مذکورہ ناولوں کی طرح موضوع سے مطابقت اور فنی چابکدستی کا نمونہ دیکھنے کو ملے گا۔

کتابیات

بنیادی مواد:۔

شمارہ نمبر	کتب	مصنف کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱	آب روان کبیر	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۳ء
۲	آتش رفتہ کا سراغ	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۳ء
۳	بیان	مشرف عالم ذوقی	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۱۹۹۵ء
۴	بھوکا ایتھوپیا	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۱۹۹۳ء
۵	پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۰۵ء
۶	پوکے مان کی دنیا	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۳ء
۷	ذبح	مشرف عالم ذوقی	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۲۰۰۰ء
۸	سلسلہ روز وشب	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۴ء
۹	شہر چپ ہے	مشرف عالم ذوقی	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۱۹۹۶ء
۱۰	صدی کو الوداع کہتے ہوئے	مشرف عالم ذوقی	سا شا پبلی کیشنز دہلی	۲۰۰۰ء
۱۱	عقاب کی آنکھیں	مشرف عالم ذوقی	عالمی میڈیا پرائیوٹ لیمیٹڈ	۲۰۱۴ء
۱۲	غلام بخش اور دیگر کہانیاں	مشرف عالم ذوقی	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۱۹۹۸ء
۱۳	لیپروسی کیمپ	مشرف عالم ذوقی	سا شا پبلی کیشنز دہلی	۲۰۰۰ء
۱۴	لینڈ اسکیپ کے گھوڑے	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۰۳ء

شمارہ نمبر	کتب	مصنف کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱۵	لے سانس بھی آہستہ	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۳ء
۱۶	مرگ انبوہ	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۹ء
۱۷	مسلمان	مشرف عالم ذوقی	عالمی میڈیا پرائیواٹ لیمیٹڈ	۲۰۱۴ء
۱۸	منڈی	مشرف عالم ذوقی	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۱۹۹۷ء
۱۹	نالۂ شب گیر	مشرف عالم ذوقی	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۲۰۱۴ء
۲۰	نفرت کے دنوں میں	مشرف عالم ذوقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۳ء
۲۱	نیلام گھر	مشرف عالم ذوقی	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۱۹۹۲ء

ثانوی مواد:۔

شمارہ نمبر	کتب	مصنف کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱	اردو افسانہ میں روایت اور مسائل	گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	گلوب آفسیٹ پریس دہلی	۱۹۸۱ء
۲	اردو افسانہ ۱۹۸۰ کے بعد (تجزیہ وتنقید)	غضنفر اقبال، ڈاکٹر	کاغذ پبلشرز کرناٹک	۲۰۰۶ء
۳	اردو افسانہ میں بیانیہ کردار کی کشمکش، نیا اردو افسانہ	شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۱۹۸۸ء
۴	اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ (۱۹۸۰) کے بعد	احمد صغیر، ڈاکٹر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۰۹ء
۵	اردو ناول آزادی کے بعد	اسلم آزاد، ڈاکٹر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۷ء
۶	اردو ناول آغاز وارتقاء، ۱۸۵۷۔۱۹۱۴ء	عظیم الشان صدیقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	اول ۔۲۰۰۸ء دوم ۔۲۰۱۳ء
۷	اردو ناول ایک تکنیکی جائزہ	محمد بہادر علی، ڈاکٹر	شمع پریس ورنگل	۲۰۰۶ء
۸	اردو ناول، تعریف، تاریخ اور تجزیہ	صغیر افراہیم، ڈاکٹر	براؤن بک پبلی کیشنز علی گڑھ	۲۰۱۸ء
۹	اردو ناول کی تاریخ اور تنقید	علی عباس حسینی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۰۵ء
۱۰	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	احسن فاروقی، ڈاکٹر	عثمانیہ بک ڈپو	۲۰۱۶ء

۱۱	اردوناول کی تنقید وتجزیہ	سلیم محی الدین، ڈاکٹر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۶ء
۱۲	اردوناول کے اسالیب	شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۲۰۰۶ء
۱۳	بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۶ء
۱۴	تاریخ ادب اردوابتداء سے۲۰۰۰ تک (جلدسوم)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۰۷ء
۱۵	جدیدناول کافن (اردو ناول کے تناظر میں)	سیدمحمد عقیل	نیا سفر پبلیکیشنز الہٰ آباد	۱۹۹۷ء
۱۶	جہان فکشن	شہاب ظفر اعظمی ڈاکٹر	تخلیق کار پبلشرز دہلی	۲۰۰۷ء
۱۷	ذوقی تخلیق اور مقالمہ	تسنیم فاطمہ امروہی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۴ء
۱۸	ذوقی کی ادبی کائنات	سمیہ بشیر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۸ء
۱۹	فرقہ واریت اور اردوناول	غیاث الدین، ڈاکٹر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۰۵ء
۲۰	گفتگو بند نہ ہو	الماس فاطمہ	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۶ء
۲۱	مرزارسوا کے سماجی ناول	عبدالسلام، ڈاکٹر	اردوپبلیشرزلکھنؤ	۱۹۸۵ء
۲۲	معاصرافسانہ اورذوقی	شہزادانجم، ڈاکٹر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۱ء

۲۳	ناول کا سفر	مظفر عباس، ڈاکٹر	گوہر پبلیشرز لاہور	
۲۴	ناول کا فن	(ترجمہ) ابوالکلام قاسمی پروفیسر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۰ء
۲۵	ناول کیا ہے	محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی ڈاکٹر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	۲۰۱۰ء
۲۶	ناول اور عوام (رالف فاکس)	ترجمہ۔سید محمد کاظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی	۲۰۱۴ء

رسائل و جرائد

سلسلہ	رسالہ کا نام	مبصر	جلد نمبر	شمارہ نمبر	سن اشاعت
۱	آج کل نئی دہلی	ڈاکٹر شہزاد انجم	۷۰	۹	اپریل ۲۰۱۲ء
۲	آج کل نئی دہلی	تنسیم فاطمہ	۲۴	۴	نومبر ۲۰۰۵ء
۳	اذکار کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور	شہاب ظفر اعظمی ڈاکٹر		۱۹	اپریل، مئی جون ۲۰۱۲ء
۴	بزم سہارا (نوئیڈا)	مشرف عالم ذوقی		۳۸	جنوری ۲۰۱۳ء
۵	بزم سہارا (نوئیڈا)	مشرف عالم ذوقی		۳۹	فروری ۲۰۱۳ء
۶	بزم سہارا (نوئیڈا)	مشرف عالم ذوقی		۴۲	مئی ۲۰۱۳ء
۷	بزم سہارا (نوئیڈا)	مشرف عالم ذوقی		۴۳	جون ۲۰، ۲۰۱۳ء
۸	ماہ نامہ سب رس، حیدرآباد	ڈاکٹر عطیہ رئیس	۲۸	۳	مارچ ۲۰۰۶ء
۹	ماہ نامہ سب رس، حیدرآباد	حسین الحق	۶۸	۷	جولائی ۲۰۰۶ء
۱۰	ماہ نامہ سب رس، حیدرآباد	مشرف عالم ذوقی	۶۶	۱۰	اکتوبر ۲۰۰۴ء
۱۱	ماہ نامہ سب رس، حیدرآباد	مشرف عالم ذوقی	۲۲	۱۰	اکتوبر ۲۰۰۴ء